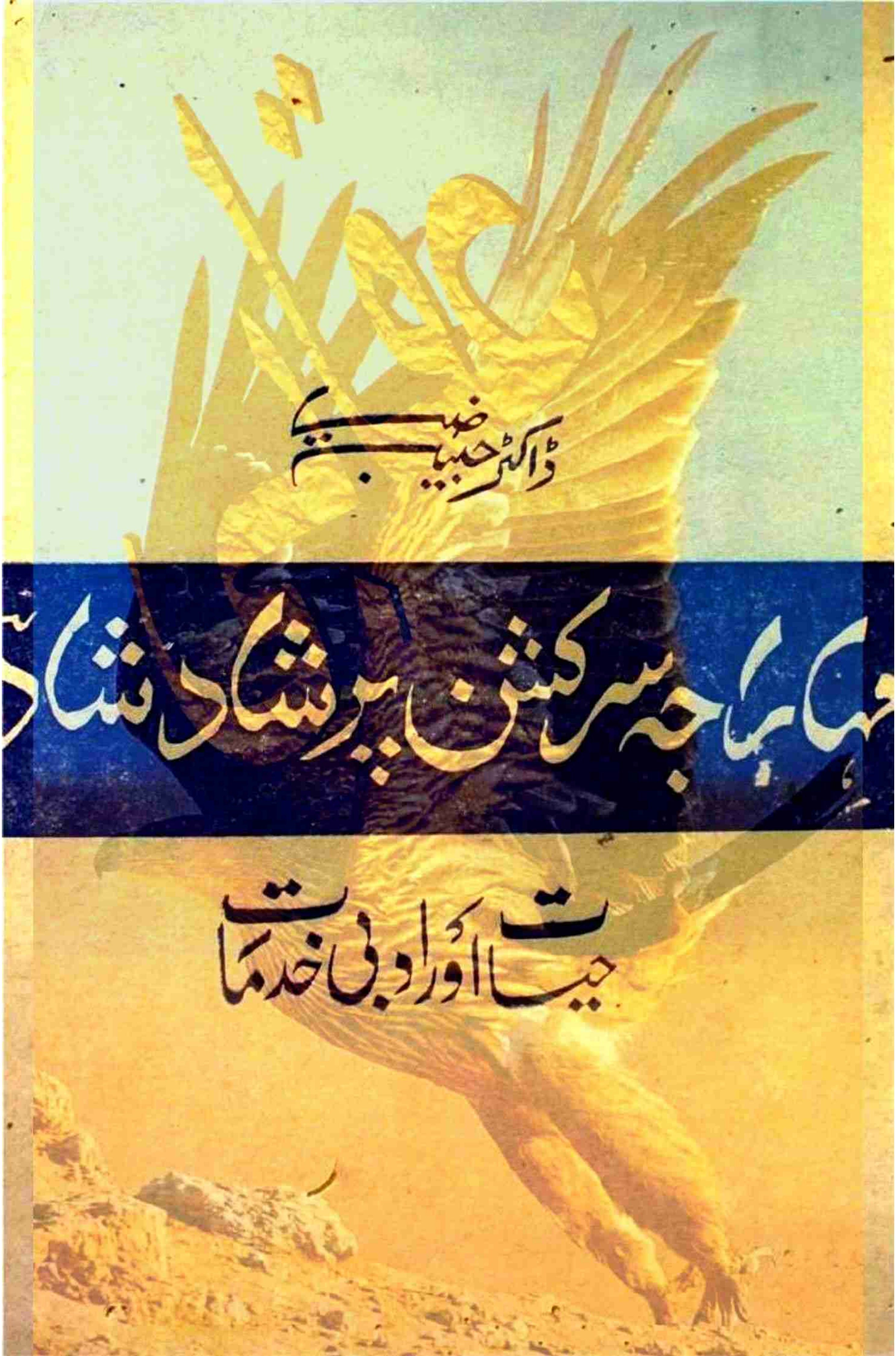


ڈاکٹر حبیب ضیا

مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد

حیات اور ادبی خدمات

ڈاکٹر حبیب ضیاء

مہاراجہ کشن پرشاد شاد

حیات اور ادبی خدمات

بار اوّل ۱۹۷۸ء
تعداد: ۵۰۰

ناشر: سید فہیم الدین
IDPL, C-36 بالا نگر حیدرآباد
کتابت وطباعت: دائرہ پریس چھتہ بازار حیدرآباد

قیمت: ۲۰ روپے

حسب ذیل پتوں سے کتاب طلب کی جاسکتی ہے:
۱۔ نگاہ پبلی کیشنز ۷۷-۴-۱۴ بیگم بازار حیدرآباد ۵۰۰۰۱۲
۲۔ اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش حیدرآباد

اپنے والدین

جناب مرزا ضیاء الدین بیگ صاحب

اور

فخر النسا بیگم صاحبہ

کے نام

فہرستِ مضامین

نثر

مہاراجہ کی سرپرستی

پیش لفظ

یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد شاؔد ایک طویل عرصے تک سلطنت آصفیہ میں وزیرِاعظم رہے۔ غفران مکان نواب میر محبوب علی خاں کے زمانے میں پیشکاری کے عہدہ پر فائز رہے۔ ان کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد مجلس وزراء کی صدارت سے سرفراز کئے گئے اور اس وقت تک اس عہدہ پر فائز رہے جب تک ان کی صحت و توانائی اجازت دیتی رہی۔ مہاراجہ ہندستان میں مغلیہ تہذیب کا آخری نمونہ تھے۔ مذہباً ہندو تھے اور ان کی وصیت کے مطابق ان کا کریا کرم بھی ہندو مذہب کے مطابق ہوا۔ لیکن زندگی بھر مذہب، مسلک اور مشرب کے اعتبار سے ان کی زندگی پر کسی مذہب و مسلک کی مخصوص چھاپ نظر نہیں آتی تھی۔ ہر چند کہ وہ مذہباً ہندو تھے لیکن تمام مذاہب کے بنیادی عقائد کے دلدادہ رہے۔ اسی وسیع المشربی کی وجہ سے ہر قوم و مذہب کا آدمی اُن کی عزت کرتا رہا۔ ان کے دربار میں اہلِ کمال کا مجموعہ رہتا تھا۔ وہ صرف کمال کی قدردانی کرتے تھے، اس کے مذہب و مسلک پر کبھی ان کی نظر نہیں رہتی تھی۔ اہلِ کمال میں ہر فن کے باکمال ان کی خفیہ اور علانیہ داد و دہش سے فیض یاب ہوتے تھے۔ کسی نوجوان ادیب اور شاعر میں غیر معمولی صلاحیت دیکھ کر خود اپنی طرف سے پہل کر کے اس کے پاس تحائف بھیجتے، بلاتے اور اس کی حوصلہ افزائی کرتے۔ اردو کے تمام مشہور شاعروں اور ادیبوں سے ان کی مراسلت تھی۔ یہاں تک کہ اقبالؔ جیسا خوددار شاعر جو کسی رئیس کے دربار میں جانا تو ایک طرف اس کا تحفہ تک قبول نہ کرتا تھا، وہ بھی مہاراجہ کشن پرشاد کے اعلیٰ اخلاق، ادبی ذوق اور اخلاص کا گرویدہ تھا۔ ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے دونوں کے خطوط کا مجموعہ "شاد و اقبال" کے نام سے شایع ہو چکا ہے۔ ان خطوط میں اقبال جیسا انانیت پسند شاعر، جس نے شاید کسی دلیسی ریاست کے والی کو بھی "سرکار" کے لفظ سے مخاطب نہیں کیا ہو گا، مہاراجہ کو "سرکار" کے لفظ سے مخاطب کرتا ہے۔ مہاراجہ شاعروں، ادیبوں اور مختلف فنونِ لطیفہ کے باکمالوں کے قدرداں اور سرپرست ہی نہیں تھے بلکہ کثیر التصانیف ادیب اور پُرگو شاعر بھی تھے۔ انہوں نے نظم و نثر کی ہر صنف میں اپنی فکر و فن کا زور دکھانے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر حبیب ضیاء نے زیر نظر مقالہ میں مہاراجہ کی انمیس ادبی خدمات کا تفصیلی اور تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے مہاراجہ کو ہیرو بنانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ ہر ادب پارے پر غیر جانبدارانہ تنقید کرتے ہوئے اس کی صحیح قدر و قیمت کا تعین کیا ہے اس مقالہ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرکاری مصروفیات و التیٔ سلطنت کی مزاج داری اور اہلِ حاجت کے ازدحام سے فرداً فرداً ملاقات اور پھر نجی زندگی کے فرائض کی تکمیل کے باوجود مہاراجہ نے گراں قدر ادبی خدمت انجام دی نہ وہ صفِ اول کے شاعر میں شمار کئے جا سکتے ہیں نہ صف اول کے ادیبوں میں۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے لکھ کر اور لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی اور قدردانی کر کے اردو زبان و ادب کی اس قدر عظیم خدمت انجام دی ہے کہ تاریخ ادب ان کے اس احسان کو فراموش نہیں کر سکتی۔

ڈاکٹر حبیب ضیاء نے جس محنت اور تحقیقی بصیرت کے ساتھ اس کام کو انجام دیا ہے اس کی پوری قدر وہی ریسرچ اسکالر کر سکتے ہیں جنھوں نے اس میدان میں قدم مارا ہے اس مقالہ کے ذریعہ مہاراجہ کی گنگا جمنی شخصیت سے آگہی، قومی یکجہتی کی جدوجہد کو فروغ دینے میں ممد و معاون ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر حفیظ قتیل

ریڈر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ

دیباچہ

سلطنت آصفیہ میں اردو کی سرپرستی سلاطین آصفی کے ساتھ ساتھ یہاں کے وزرائے اعظم نے بھی کی۔ بلکہ اِس خصوص میں ان کی خدمات سلاطین سے زیادہ گراں قدر رہی ہیں۔ ارسطو جاہ، مہاراجہ چندو لال، نواب فخر الدین خاں، اور مہاراجہ کشن پرشاد نے اِس زبان کے ادبی اور علمی سرمایے کو بڑھانے میں اپنی قلمی کاوشوں کے علاوہ اپنی داد و دہش سے جو خدمات انجام دی ہیں یقیناً اس قابل ہیں کہ اِن میں سے ہر ایک کی خدمات کا فرداً فرداً جائزہ لیا جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر تمیمہ شوکت نے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری کے لئے مہاراجہ چندو لال کی زندگی اور شاعری کے موضوع پر تحقیقی کام کیا ہے۔ شمس الامراء، نواب فخر الدین خان اور ان کے خاندان کی اردو خدمات پر خواجہ حمید الدین شاہد صاحب سابق لکچرار چادر گھاٹ کالج نے اپنے ایم۔اے کے مقالہ "اردو میں سائنٹفک ادب" میں روشنی ڈالی ہے۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی مرحوم نے "شمس الامرا کے علمی کارنامے" کے موضوع پر ایک مستقل مقالہ قلمبند کیا تھا۔ پتہ نہیں یہ مقالہ ان کی زندگی میں کیوں شائع نہ ہو سکا۔

مہاراجہ کشن پرشاد کی اردو خدمات کو جسے حیدرآباد کے وزرائے اعظم کی اردو خدمات کی آخری قسط سمجھنا چاہئے میں نے پی، ایچ، ڈی کے تحقیقاتی کام کے لئے منتخب کیا ہے۔ مہاراجہ کی زندگی اور ان کی مختلف النوع خدمات پر ایک مبسوط اور مستند کتاب نواب مہدی نواز جنگ مرحوم کی نگرانی میں ایک کمیٹی کی جانب سے مرتب کر کے سنہ ۱۹۵۰ عیسوی میں

شایع کی گئی ہے۔ چونکہ اس کتاب میں مہاراجہ کی نجی اور سرکاری زندگی کا بہت تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے اس لئے میں نے اپنے مقالہ میں مہاراجہ کی زندگی کے اس حصہ کو بہت مختصر کر دیا ہے۔ تاہم اِس حصہ میں بھی راست ذرایع سے استفادہ کرکے ایسا مواد بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو کمیٹی مذکور کی گرفت میں نہیں آسکا تھا۔ جہاں تک اردو خدمات کا تعلق ہے اس کتاب میں مہاراجہ کے مختلف کارناموں کے ذکر کے ساتھ ان کی تصانیف کی ایک نامکمل فہرست دے دی گئی ہے۔ اس لئے مہاراجہ کی اردو تصانیف اور اردو زبان و ادب کے لئے ان کی متنوع خدمات کے تفصیلی جائزہ کی ضرورت تھی۔ مقالہ نگار نے زیر نظر مقالہ میں اِس کام کو سرانجام دینے کی حتی الوسیع کوشش کی ہے۔

مہاراجہ کی زندگی، تصانیف اور ادبی مصروفیات کے تعلق سے مستند مواد کی فراہمی کے سلسلہ میں مہاراجہ کی مطبوعہ تصانیف، مہاراجہ سے متعلق مختلف کتابوں اور رسالوں میں شائع شدہ مواد سے استفادے کے علاوہ خود مہاراجہ کی مختلف غیر مطبوعہ تحریرات اور مکتوبات سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ مہاراجہ کے صحبت یافتہ امرائ شرفا اور ادبا و سے بھی مواد حاصل کرنے کی ممکنہ سعی کی ہے۔ مہاراجہ کی کم و بیش ساری تصانیف ان کی زندگی ہی میں شایع ہو چکی تھیں جن میں سے اکثر تصانیف اس قدر کمیاب ہو گئی ہیں کہ ان مطبوعات کی حیثیت اب مخطوطات کی سی ہو گئی ہے۔ مقالہ نگار نے مہاراجہ کی ساری مطبوعات سے استفادہ کیا ہے۔ صرف دو کتابیں ارض الرمل اور افسانۂ شیدا جو شاید مہاراجہ کی زندگی ہی میں پایۂ تکمیل کو نہیں پہونچ سکی تھیں اور جن کے نامکمل مسودے بھی اب مفقود ہیں، مقالہ نگار کی دسترس سے باہر رہیں۔

جہاں تک مہاراجہ کی نظم و نثر کے جائزے کا تعلق ہے مقالہ نگار نے یہ کوشش کی ہے کہ ان کی ہر ادبی تخلیق کی صحیح قدر و قیمت کو متعین کرے۔ اور تمام محاسن و معائب پیش کر دیئے جائیں۔ اس کوشش میں یقیناً مہاراجہ کی بعض تخلیقات کے بارے میں ایسی رائیں بھی دی گئی ہیں جن سے مہاراجہ کی ادبی شخصیت کی عظمت متاثر ہو سکتی ہے

لیکن جو کوتاہیاں مہاراجہ کی تصانیف میں نظر آتی ہیں وہ مہاراجہ ہی کے ساتھ خاص نہیں ہیں ۔ ہر وہ ادیب جو مہاراجہ کی طرح کثیر التصانیف ہے اس کی بعض تصانیف میں اسی طرح کی کوتاہیوں کا پیدا ہو جانا تعجب خیز نہیں ہے ۔ مہاراجہ کی سیاسی شخصیت اور ان کی سیاسی اور سماجی مصروفیات کو دیکھتے ہوئے ان کی تصانیف کے انبار پر نظر ڈالتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ حکومت اور سیاست کے جھمیلوں سے انھیں اتنی فرصت کیسے میسر آئی کہ وہ اتنا کچھ لکھ سکے ۔ جو ادیب اور شاعر اپنی ساری زندگی شعر و ادب کی تخلیق کے لئے وقف کر دیتا ہے وہ بھی اگر کمیت و کیفیت کے اعتبار سے اتنا گراں قدر سرمایہ اپنی یادگار چھوڑ دے تو تاریخ ادب اس کو فراموش نہیں کر سکتی ۔ چہ جائیکہ مہاراجہ کی ادبی سرگرمی ان کی زندگی کی گوناگوں مصروفیات کا ایک ذوقی اور تفریحی جز تھی ۔ زیر نظر مقالہ میں مہاراجہ کی اسی ادبی سرگرمی کا تفصیلی اور تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے ۔

اس کام کے سلسلہ میں جن مختلف کرم فرماؤں نے مختلف طریقوں سے میری معاونت اور رہنمائی فرمائی ہے میں ان سب حضرات کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتی ہوں ۔

جامعہ عثمانیہ نے اس مقالہ کی اشاعت کے لئے اجازت دی جس کی میں شکر گزار ہوں ۔ اور اردو اکیڈمی حیدرآباد کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں جس کے تعاون سے یہ کتاب شائع ہوئی ۔ آخر میں جناب موسیٰ کاظم صاحب لکچرر اورینٹل اردو کالج کا شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے اس کتاب کی اشاعت میں میری مدد کی ۔

ڈاکٹر حبیب ضیاء

C-36 و IDPL ٹاؤن شپ بالانگر حیدرآباد

حیدرآباد
میں اردو کو سربلند
کرنے میں جو عوامل
کارفرما رہے
ان میں
سب سے زیادہ طاقتور عامل

مہاراجہ

کی اردو دوست
اور
ادب نواز
شخصیت تھی۔



مہاراجہ کی زندگی

سلسلۂ اجداد

مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر سورج بنسی کھتری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جس کا ذکر انہوں نے اپنی نظم و نثر میں جگہ جگہ وضاحت سے کیا ہے۔ رسالہ "دسہرا" میں "رام نومی" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جس میں رام چندرجی کے حالات اور ان کے اعلیٰ اوصاف کا ذکر کرنے کے بعد اپنا تعلق سورج بنسی خاندان سے بتاتے ہوئے رام چندرجی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"واضح ہو کہ میں اگرچہ اس آفتاب آسمان عز و شان سورج بنسی کا ایک ذرہ بے مقدار اور اس شمع شبستان شجاعت کی بزم کا ایک دھندلا چراغ ہوں مگر خوشامدیوں کے زمرہ سے نہیں ہوں اور نہ ضعیف الاعتقادی کا بندہ ہوں اسلئے مہاراجہ رام چندر کو خدا نہیں کہتا اور نہ سمجھتا ہوں مگر اتنا یقین کے ساتھ جانتا ہوں کہ مہاراجہ رام چندر بندہ تھے مگر کارخدا کرتے تھے[1]۔"

"کرشن کلا" میں اپنے خاندان اور اپنے نسب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"میرا یہ جسم سورج بنسی کھتری کے جوہر سے بنا ہے۔ کوئی ہزار چاہے کہ قلب ماہیت ہو جائے مگر انس نہیں بدل سکتا۔ میری رگ رگ میں سورج بنسی کھتری کا خون دوڑ رہا ہے جیسے کہ روح تمام جسم پر محیط ہے اور پانی انگور کے درخت میں دوڑتا ہے[2]۔"

ہیرالال صاحب نشاط کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"بندہ تو قوم کا خود سپاہی ہے یعنی چھتری راجہ رام چندر کا اور

---

[1] دسہرا ص ۲۷، ۲۸ ، [2] کرشن کلا ص ۱۲۔

اور خدا نے خدمت بھی فوجی عطا کی[1]"

اجودھیا پرشاد صاحب کو لکھتے ہیں

"لڑائی کے نام پر میرا خون رگ وپے میں تیزی کے ساتھ دوڑتا ہے۔ نہ ہونا تعجب اور باعث تعزیت ہے۔ کیونکہ ہماری قوم کی قوم سپاہ۔ تلوار کے دھنی ہم ہی لوگ کہلاتے ہیں۔ ہمارا لوہا سبھوں نے مانا ہے۔ راجپوت ہم ہی کہلاتے ہیں۔ راجپوت بہ معنی راجہ کے پتر۔ سورج بنسی، چندر بنسی، سورج بنسی راجہ رام چندر ہیں۔ ہم راجہ رام چندر کے بنس سے ہیں[2]"

نواب مہدی نواز جنگ بہادر نے اپنے مضمون "مہاراجہ کی سیرت کے بعض پہلو" میں مہاراجہ کے وصیت نامے کے ابتدائی اکیس فقرے نقل کئے ہیں۔ ان میں پہلے اور دسویں فقرے سے مہاراجہ کے سلسلۂ نسب پر روشنی پڑتی ہے۔ دونوں فقرے ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں۔

(۱) "میں سرکشن پرشاد یمن السلطنت کھتری مہرا یعنی سپاہی نژاد صاحب سیف اپنی وصیت کو خدا کے نام سے شروع کرتا ہوں جو ایک ہے اور ایک ہی ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ میرا اعتقاد ہے کہ کوئی خدا سوائے ایک خدا کے سزاوار حمد نہیں[3]"

(۲) "ہمیشہ دوسروں کی عزت کرو۔ تم خوش نصیبی سے سورج بنسی خاندان میں پیدا ہوئے ہو جس کے خاندان کا سلسلہ مہاراجہ دھیراج رام چندر جی سپاہی نژاد تک پہونچتا ہے[4]"

مہاراجہ شاد کی سوانح حیات پر ایک نوٹ انھیں کے مملوکہ فائیلوں میں دستیاب ہوا ہے۔ اس نوٹ کے ساتھ مہاراجہ کی ایک تحریر منسلک ہے۔ جس میں انہوں نے اپنے منتظم اردو کو ہدایت دی ہے کہ لالہ سری رام دہلوی کے تذکرے کے لئے

---

[1] رقعات شاد ص ۲۴۰، [2] رقعات شاد ص ۲۷۸
[3] مجلۂ عثمانیہ مہاراجہ نمبر ص ۶۶ [4] مجلۂ عثمانیہ مہاراجہ نمبر ص ۶۷

ان کے اور مہاراجہ چندولال کے حالات قلم بند کریں۔ اس نوٹ پر مہاراجہ نے اپنے قلم سے اصلاحیں بھی دی ہیں۔ اس لئے یہ نوٹ بہت اہم اور مستند ہے۔ خمخانۂ جاوید جلد چہارم میں لالہ سری رام نے شاد اور شادان کے متعلق اسی نوٹ کے مواد کو اپنی زبان اور اسلوب میں قلم بند کیا ہے۔ متذکرہ سوانحی نوٹ میں مہاراجہ اور ان کے اسلاف کے بارے میں لکھا ہے۔

"سرکشن پرشاد بہادر، مہاراجہ نارائن پرشاد نریندر بہادر کے نبیرہ اور ان کے حقیقی وارث و جانشین ہیں۔ ہزاکسلنسی اس ایک قدیم اور نامی خاندان کے معزز اور سربرآوردہ قائم مقام ہیں جس کا سلسلہ راجہ ٹوڈرمل، وزیر فینانس محمد جلال الدین اکبر شاہنشاہ دہلی سے شروع ہو کر رائے مولچند سے مہاراجہ چندولال تک اقبال مندانہ رفتار کے ساتھ پہونچتا ہے[۱]۔"

رائے مولچند کے بارے میں لکھا گیا ہے۔

"رائے مولچند راجہ ٹوڈرمل کی پانچویں پشت میں اور اس خاندان کے اول دکن میں آباد ہونے کے بانی مبانی تھے۔ نواب نظام الملک آصف جاہ اول کی مدبرانہ نظر نے رائے صاحب کو انتخاب کر کے دہلی سے اپنے ہمراہ لاکر کمشنر کروڑگیری کے عہدہ پر مامور کیا۔ اس زمانے سے اب تک یہ خاندان دولتِ آصفیہ کے خیر خواہوں اور خیر خواہی کے صلہ میں آئے دن کی ترقیوں اور اقبال مندیوں میں نمایاں شہرت حاصل کرتا رہا[۲]۔"

رائے مولچند کے فرزند رائے لچھمی رام تھے۔ اپنے باپ کے انتقال کے بعد انھوں نے اپنے موروثی عہدہ تعلقداری کو سنبھالا۔ رائے لچھمی رام جب تک زندہ رہے، دیانت داری اور راست بازی کو شیوہ جان کر اپنے فرائض

---

۱ سوانح عمری سرکار والاتبار قلمی مخزونۂ حیدری گشتی کتب خانہ حیدرآباد دکن

۲ سوانح عمری سرکار والاتبار قلمی مخزونۂ حیدری گشتی کتب خانہ حیدرآباد دکن۔

انجام دیتے رہے۔

رائے لچھمی رام کے پانچ فرزند تھے۔

۱۔ رائے نارائین داس ۔ ۲۔ رائے رگھن ناتھ داس

۳۔ رائے بھوانی داس ۔ ۴۔ رائے موہن لال۔

۵۔ رائے نانک رام۔

راجہ نارائین داس کے دو لڑکے تھے۔ ایک مہاراجہ چندولال دوسرے راجہ گوبند بخش۔ مہاراجہ چندولال ۱۷۶۶ء میں پیدا ہوئے ان کی عمر دس سال کی تھی کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ اس لئے ان کے حقیقی چچا رائے نانک رام نے ان کی پرورش اور تعلیم کا پورا پورا ذمہ لیا۔ مہاراجہ چندولال اپنی ذاتی قابلیت اور ہنرمندی کے سبب بہت جلد ترقی کر گئے۔ اور ایک معمولی عہدہ سے ترقی کر کے مدار المہامی جیسے جلیل القدر عہدہ تک پہونچ گئے۔ مہاراجہ موصوف غیر معمولی خصوصیات کے حامل تھے۔ ان کی فیاضی اور مروت کے قصے آج بھی حیدرآباد میں زبان زد خاص و عام ہیں۔ وہ ایک پرگو اور مشاق شاعر بھی تھے شاداںؔ تخلص کرتے تھے۔ ان کا دربار شاعروں، ادیبوں اور عالموں کا مرجع تھا۔

چندولال ہندو تھے لیکن ان کے سکھ ہونے کے تعلق سے ایک دلچسپ روایت ملتی ہے۔ ذیل میں دکن لارپورٹ سے اعظم یار جنگ کے بیان کا وہ اقتباس دیا جاتا ہے جس میں چندولال کے سکھ ہونے کا ذکر ہے۔

"..... راجپوت کی قوم کے بھی کچھ لوگ ہیں جن میں سے اکثر خاندانی ہیں اور اب تک جاگیر وغیرہ پاتے ہیں۔ کچھ سکھ ہیں۔ ان کی آمد عوام گرو گوبند کی زندگی کے حالات سے متعلق کرتے ہیں اب ان کی تعداد بڑھ گئی ہے خاص کر اس وجہ سے کہ راجہ چندولال جو چالیس برس تک وزیر رہے اسی مذہب کے تھے[۵]۔"

---

[۵] نقل از دکن لارپورٹ۔ کتب خانہ اعظم یار جنگ مدخلہ کتب خانہ آصفیہ نشان ۰۵۰۴۶۴۔ ص۔ ۷۔ فقرہ ۱۳۔

مہاراجہ چندولال نے اپنی خود نوشت سوانح حیات "عشرت کدہ آفاق" میں اپنے سکھ مذہب یا اس مذہب سے اپنی دلچسپی کا کہیں اظہار نہیں کیا اور نہ نواب اعظم یار جنگ کے سوا مہاراجہ چندولال کے سکھ مذہب کے متعلق اور کوئی روایت ملتی ہے۔ البتہ مہاراجہ کشن پرشاد کی موروثی جائداد پھول باغ میں ایک گرودوارہ بھی ہے جو علی آباد کے دروازے کے قریب اب تک موجود ہے۔ اس کی نگرانی ایک سکھ کے سپرد ہے۔ مہاراجہ نریندر بہادر نے مہاراجہ کشن پرشاد کی تعلیم و تربیت کے لئے جہاں مختلف فنون کے ماہر اساتذہ کا انتظام کیا تھا۔ وہیں گرمکھی کی تعلیم کے لئے گرو نانک شاہ کو مقرر فرمایا تھا۔ مہاراجہ یوں تو ہر مذہب کے رہنماؤں اور عبادت گاہوں کا دل سے احترام کرتے تھے لیکن گرودواروں کے احترام اور اعانت میں ان کی خصوصی دلبستگی کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان واقعات کے پیش نظر اعظم یار جنگ کی مجرد روایت بھی قابل غور ہو جاتی ہے۔ لیکن مہاراجہ چندولال اور مہاراجہ کشن پرشاد کے سکوت اور کسی قوی ثبوت کی عدم موجودگی میں تحقیق کی راہ مسدود نظر آتی ہے۔

مہاراجہ چندولال کے پوتے مہاراجہ نارائن پرشاد نریندر بہادر تھے نریندر بہادر ۱۲۴۴ ہجری مطابق ۱۸۲۸ عیسوی میں پیدا ہوئے۔ ذاتی قابلیت اور ہنرمندی میں یہ اپنے آبا و اجداد سے کم نہ تھے۔ مختلف علوم اور مختلف زبانوں پر کامل عبور رکھتے تھے۔ نواب ناصر الدولہ نے انھیں عہدۂ پیشکاری سے سرفراز کیا تھا۔ ذی الحجہ ۱۲۸۳ھ ہجری م ۱۸۲۸ عیسوی میں مہاراجہ نریندر بہادر کو نواب محبوب علی خاں کے والد کی طرف سے راجہ راجایاں کا خطاب ملا۔ اور اس کے ساتھ پانچ قیمتی جواہر عطا ہوئے کچھ عرصہ بعد نریندر بہادر کا خطاب دیا گیا۔ نریندر بہادر نے (۶۲) سال کی عمر میں ۱۳۰۶ھ ہجری م ۱۸۲۸ عیسوی میں انتقال کیا۔

مہاراجہ کشن پرشاد کی والدہ جوالا بی بی مہاراجہ نریندر بہادر کی اکلوتی صاحبزادی تھیں۔ مہاراجہ کے والد کا نام راجہ ہری کشن پرشاد تھا۔ راجہ نریندر بہادر کے کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی۔ اس لئے مہاراجہ کشن پرشاد ہی ان کے جائز وارث تسلیم کئے گئے۔

شجرۂ خاندان مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر[۱]

- رائے مولچند
  - رائے لچھمی رام
    - رائے نارائن داس
      - راجہ گوبند بخش
      - راجہ چندو لال
        - راجہ نانک بخش
        - راجہ بالا پرشاد
          - بہبود علی خاں (فتح یاب جنگ)
          - راجہ نارائن پرشاد نریندر بہادر
            - جوالا بی بی (زوجہ راجہ ہری کشن)
              - مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ
    - رائے رگھن ناتھ داس
    - رائے بھوانی داس
    - رائے موہن لال
    - رائے نانک رام

---

۱ شجرہ قلمی مملوکہ وزارت النساء صاحبہ، دختر مہاراجہ بہادر

مہاراجہ کی خانگی زندگی

نام مہاراجہ سرکشن پرشاد آنجہانی مہاراجہ نریندر بہادر کی اکلوتی صاحب زادی جوالا بی بی کے بطن سے چندولال کی دیوڑھی میں پیدا ہوئے۔ نجوم کے حساب سے ان کا نام پرشوتم داس رکھا گیا اور مہاراجہ نریندر پرشاد نے اپنے نواسے کا نام کشن پرشاد رکھا۔ مہاراجہ اسی نام سے مشہور ہوئے۔

تاریخ پیدائش مہاراجہ کی تاریخ پیدائش کے بارے میں مورخین میں اختلاف ہے۔ مانک راؤ وٹھل راؤ نے بستانِ آصفیہ میں ۱۸ رجمادی الثانی سنہ ۱۲۷۹ ہجری بتایا ہے[۱] رجب علی مولف سوانح عمری راجہ نریندر بہادر نے سنہ ۱۸۶۲ عیسوی لکھا ہے[۲] محمد نجم الغنی نے تاریخ ریاست حیدرآباد میں سنہ ۱۲۷۹ ہجری یا سنہ ۱۲۸۰ ہجری یا سنہ ۱۲۸۱ ہجری لکھا ہے[۳] صمصام شیرازی نے سنہ ۱۲۷۹ ہجری تحریر کیا ہے[۴]۔ مہاراجہ کے ایک قریبی دوست راجہ نرسنگ راج عالی نے لکھا ہے

"مہاراجہ کشن پرشاد آنجہانی ۱۸ رشعبان المعظم سنہ ۱۲۸۰ھ م مطابق ۱۷/۱ اسفندار سنہ ۱۲۷۳ فصلی کو پیدا ہوئے۔
"فرزند فرخندہ" سنہ ۱۲۸۰ ہجری آپ کی تاریخ ولادت ہے[۵]۔

مورخین مذکور کے بیانات کے مقابلہ میں عالی کی روایت زیادہ معتبر سمجھی جاسکتی ہے۔ اس لئے کہ عالی کو آخر وقت تک مہاراجہ کا قرب حاصل تھا۔ مرتب کتاب "مہاراجہ کشن پرشاد" نے سنہ عیسوی میں جو تاریخ دی ہے وہ عالی کے دیئے ہوئے سنہ ہجری اور سنہ فصلی

---

[۱] بستان آصفیہ ص ۶۳۸ [۲] سوانح عمری راجہ نریندر بہادر ص ۱۸۸
[۳] تاریخ ریاست حیدرآباد ص ۵۵۹ [۴] مشیر عالم ڈائرکٹری ص ۳۱۴ [۵] مجلہ عثمانیہ مہاراجہ نمبر ص ۴۔

کے بالکل مطابق ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"۲۸/جنوری سنہ ۱۸۶۴ء کو چندولال کی ڈیوڑھی میں جوالا بی بی کے بطن سے ایک بچہ پیدا ہوا۔ نجوم کے حساب سے اس کا نام پرشوتم داس رکھا گیا۔ مہاراجہ نریندر پرشاد نے بچہ کو گود میں اٹھایا اور سینہ سے لگا کر کشن پرشاد نام رکھا۔[۱]"

یہ عجیب بات ہے کہ خود مہاراجہ نے دو مختلف تحریروں میں اپنا سنہ پیدائش مختلف دیا ہے۔ مہاراجہ کی خود نوشت سوانح عمری کا جو مسودہ مقالہ نگار کو دستیاب ہوا ہے اس میں انہوں نے ۱۸/شعبان ۱۳۸۱ سنہ ہجری لکھا ہے۔[۲] "جذبات شاد" میں خود انہوں نے وہی سنہ ہجری اور سنہ عیسوی تحریر کیا ہے جو عالی اور مرتب کتاب مہاراجہ کشن پرشاد نے تحریر کیا ہے۔ جذبات شاد میں مہاراجہ لکھتے ہیں۔

"میری ولادت ۱۸/شعبان المعظم سنہ ۱۲۸۰ ہجری م ۲۸/جنوری سنہ ۱۸۶۴ عیسوی کو اپنے جد مہاراجہ نریندر ہی کے گھر ہوئی تھی۔[۳]"

یہ ممکن ہے کہ عالی اور مرتب کتاب "مہاراجہ کشن پرشاد" کا ماخذ جذبات شاد ہی کا بیان ہو لیکن مہاراجہ کے بتائے ہوئے دونوں سنین میں سے سنہ ہجری سنہ ۱۲۸۰ ہجری اس لئے قرین صحت معلوم ہوتا ہے کہ اس کی مطابقت سنہ عیسوی ۱۸/جنوری سنہ ۱۸۶۴ء اور سنہ فصلی ۱۷/اسفندار سنہ ۱۲۷۳ ف سے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ عالی نے جو تاریخی نام "فرزند فرخندہ" دیا ہے اس سے بھی سنہ ۱۲۸۰ ہجری ہی مستخرج ہوتا ہے۔ تاریخی نام اور قطعات تاریخ عموماً مجرد تاریخوں سے زیادہ قابل اعتماد ہوتے ہیں۔

---

[۱] مہاراجہ کشن پرشاد ص ۱ [۲] خود نوشت سوانح عمری مہاراجہ بہادر مخزونہ حیدر گشتی کتب خانہ حیدرآباد دکن۔

[۳] جذبات شاد ص ۳۰

تعلیم و تربیت

مہاراجہ نے اپنی تعلیم و تربیت اور ہر علم و فن کے اساتذہ کے بارے میں اپنی خود نوشت سوانح عمری میں تفصیل سے لکھا ہے۔ جن علوم کو انہوں نے باقاعدہ طور پر اساتذہ سے حاصل کیا تھا اس کی وضاحت کے علاوہ ایسے علوم و فنون کا بھی علیحدہ تذکرہ کیا ہے جو انہوں نے اپنے شوق سے سیکھے تھے۔

جس وقت مہاراجہ کی عمر پانچ سال کی ہوئی ان کے نانا مہاراجہ نریندر نے انھیں میر لطف علی کے حوالے کیا۔ مہاراجہ نے تیرہ برس کی عمر تک ان سے علم حاصل کیا۔ میر لطف علی نے مہاراجہ کو اس درجہ خلوص اور توجہ سے تعلیم دی کہ وہ بہت جلد اس قابل ہو گئے کہ اپنے خیالات کو تحریر کا جامہ پہنا سکیں۔[1]

مہاراجہ نریندر بہادر نے مہاراجہ کی تعلیم و تربیت کا خاص طور پر خیال رکھا اور ہر ممکنہ کوشش کی کہ وہ ان تمام علوم میں دستگاہ حاصل کریں جن میں خود انھیں بھی دستگاہ حاصل تھی۔ مہاراجہ اس بارے میں لکھتے ہیں:

> "چونکہ میرے جد امجد کے یہاں سوا میرے اور کوئی فرزند ذکور سے نہ تھا اور مجھے اپنا وارث جائز اور جانشین تسلیم فرمالیا تھا اس لئے جد ممدوح نے میری تعلیم و تربیت میں دلی توجہ فرما کر مجھے اپنی دلی محبتوں کی برکتوں سے اس قابل کیا کہ بحمد للہ تعالیٰ شانہٗ آج کے روز کرسی نشینی وزارت دکن کی عزت میرے بادشاہ جمجاہ نے، جس کے مبارک زمانے میں اور جس کے مراحم خسروانہ کے بدولت میری نشونما ہوئی، مرحمت فرمائی۔[2]"

مہاراجہ نے اپنے نانا راجہ نریندر بہادر کی سرپرستی میں جو مختلف علوم و فنون مختلف اساتذہ سے حاصل کئے ان کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ خود نوشت سوانح عمری مہاراجہ بہادر قلمی مخزونہ حیدری گشتی کتب خانہ حیدرآباد دکن
۲۔ خود نوشت سوانح عمری مہاراجہ بہادر قلمی مخزونہ حیدری گشتی کتب خانہ حیدرآباد دکن

فارسی مرزا علی بابا شیرازی سے، عربی سید خلیل صاحب سے انگریزی نرسہوان جاری سے سنسکرت درگا پرشاد سے، سیاق مراری لال سے خطاطی رائے بجولال سے، تیر اندازی میر عظمت علی سے، بنوٹ مراد علی شاہ کے فرزند اور محمد شہاب الدین صاحب سے اور شہسواری محمد جلال الدین سے سیکھی۔ اِن علوم و فنون کے علاوہ گرمکھی کا علم گرونانک شاہ سے حاصل کیا۔[1]

مہاراجہ نریندر بہادر کو شاعری سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ ان کے برخلاف مہاراجہ کو کم عمری ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ چنانچہ انہوں نے ابتداء میں بجولال تمکین سے خُفیہ طور پر اشعار کی اصلاح لینی شروع کی۔ بجولال تمکین کے انتقال کے بعد میر عبدالعلی والہؔ اور محمد مظفر الدین صاحب معلیؔ سے مشورہ لیتے رہے۔ اسی زمانے میں داغؔ کی شاعری کی شہرت ہوئی۔ غفران مکان نواب میر محبوب علی خاں نے انھیں اپنی استادی کی عزت بخشی تو مہاراجہ نے بھی انھیں سے اصلاح لینی شروع کی۔ ایک موقع پر مہاراجہ نے اپنی ایک غزل اعلیٰحضرت کی خدمت میں پیش کی اعلیٰحضرت نے حسبِ ضرورت اس میں اصلاح کی۔ اس کے بعد سے مہاراجہ نے "تلمیذ آصف" کہلائے جانے کی عزت حاصل کی۔ اس بارے میں مہاراجہ فخریہ لکھتے ہیں۔

"الحمد للہ والمنۃ کہ مدعا مقرون اجابت ہوا۔ مقصود کی دولت ہاتھ آئی۔ سعادت کا چہرہ روشن ہوا۔ بخت کا ستارہ چمک اٹھا۔ یہ معروضہ پذیرا ہوا۔ سنہ ۱۳۱۶ ہجری م ۱۸۹۸ء میں شاگردی کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ اور یہ عزت خاص میرے ہی لئے خداوندعالم جل شانہٗ نے عطا فرمائی ہے۔ آج تک کسی تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا کہ کسی بادشاہ نے اپنے امرائے دولت یا بندگان بارگاہ شاہی سے کسی کو اپنا شاگرد بنایا ہو اور

---

[1] خود نوشت سوانح عمری مہاراجہ بہادر قلمی مخزونہ حیدری گشتی کتب خانہ حیدرآباد دکن

اس عزت کے خلعت سے سرفراز کیا ہو۔ الحمدللہ والمنۃ شاگردی مبارک ہوئی۔ تحسین و آفرین کی صدائیں بلند ہوئیں[1]۔"

مہاراجہ کی شاعری اور ان کے اساتذہ کے بارے میں علامہ حیرت بدایونی لکھتے ہیں۔

"وہ فارسی، اردو اور ہندی میں بڑی روانی سے شعر کہتے تھے۔ فارسی میں علامہ شوستری، نواب ضیاء یار جنگ اور مولانا عمادی و مولوی مسعود علی صاحب محوی اور ترکی صاحب سے مشورہ فرماتے تھے۔ ہندی شاعری میں غالباً کسی سے مشورہ نہیں کیا۔ البتہ اردو میں جب کوئی تیرہ چودہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا تو چند سال طالب علمی کے زمانے میں بہ حیثیت شاعر رونما ہی نہیں ہوئے۔ سن شعور کو پہونچنے کے بعد جب محبوب دکن حضرت آصف سادس کے دربار میں مقبول ہوئے تو حضور مرحوم نے شاد صوفی کو جہاں مدارالمہامی وغیرہ کی نعمتوں سے سرفراز کیا۔ وہاں اپنی شاگردی کا بھی شرف بخشا۔ دربار شاہی میں فصیح الملک نواب مرزا خاں داغ دہلوی مرحوم کی جب باریابی ہوئی تو حضور مرحوم خود بھی داغ کے شاگرد ہوئے اور اپنے وزیر اعظم مہاراجہ کشن پرشاد کو بھی داغ کا شاگرد کرایا۔ داغ مرحوم کے بعد جلیل القدر نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل کو بھی کلام دکھایا[2]۔"

مہاراجہ نے کم و بیش تمام مروجہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے غزلوں کے کئی مجموعے چھپ کر منظر عام پر آچکے ہیں۔

---

[1] خود نوشت سوانح عمری مہاراجہ بہادر قلمی مخزونہ حیدرآبادی گشتی کتب خانہ حیدرآباد دکن

[2] نورس غزل نمبر ص ۱۰۳

شاعری کے علاوہ مہاراجہ کو نثر نگاری پر بھی عبور حاصل تھا۔ نثر میں ابتداء میں محمد مظفر الدین صاحب سے اور بعد میں پنڈت رتن ناتھ سرشار سے اصلاح لی۔ سرشار نے مہاراجہ کے بعض ناولوں کی زبان اور اسلوب کی ایسی اصلاح کی کہ ان کے طرز خاص کا رنگ جھلکنے لگا۔

محلات مہاراجہ کے سات محلات تھے۔ جن میں تین ہندو اور چار مسلمان تھے۔ ہندو محلات میں رانی دھروپتی بائی (تہنیت محل) رانی کشتا بائی (مبارک محل) اور رانی رادھا بائی (راحت محل) ہیں۔ مسلمان محلات میں یسین بیگم (شاد محل) غوثیہ بیگم (مسرت محل) آفتاب بیگم (فرحت محل) اور رحیمہ بیگم (عشرت محل) ہیں۔

اولاد ہندو محلات سے آٹھ لڑکے اور نو لڑکیاں ہیں جن میں سے اب صرف چار لڑکیاں بقید حیات ہیں۔ مسلمان محلات سے سات لڑکے اور بارہ لڑکیاں ہوئیں جس میں سے اب دو لڑکے اور نو لڑکیاں بقید حیات ہیں۔ مہاراجہ کے محلات اور ان کی اولاد کی تفصیل ذیل میں دی جاتی ہے۔

فہرست اسماء خاندان مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر
آنجہانی یمین السلطنت[1]

محل اول

رانی کشتا بائی (الملقب بہ مبارک محل)

اولاد ذکور ۱۔ راجہ چندا پرشاد (فوت) ۲۔ راجہ بہادر پرشاد (فوت) ۳۔ راجہ محبوب پرشاد (فوت)۔ ۴۔ راجہ ہریندر پرشاد (فوت)

اولاد اناث ۱۔ رانی سردار بی بی بیوہ راجہ تارا چند آنجہانی۔ ۲۔ رانی محبوب بی بی بیوہ راجہ اقبال چند آنجہانی۔

محل دوم

---

[1] یہ فہرست مہاراجہ بہادر کی دختر مظفر النساء صاحبہ سے حاصل ہوئی۔

رانی رادھا بائی (الملقب بہ راحت محل)

۱۔ اولادِ ذکور | راجہ چند ولال (فوت)

۱۔ اولادِ اناث | ۱۔ رانی پاشا بی بی (ناکتخدا فوت)

محل سوم

یٰسین بیگم (الملقب بہ شاد محل)

اولادِ اناث | ۱۔ صاحبزادی عثمانی بیگم مرحومہ محل نواب قادر علی خاں بہادر ۔۲۔ صاحبزادی محبوب بیگم بیوہ نواب خورشید علی خاں مرحوم

محل چہارم

غوثیہ بیگم (الملقب بہ مسرت محل)

اولادِ ذکور | ۱۔ نواب خواجہ محبوب اللہ خاں مرحوم ۔ ۲۔ نواب خواجہ نصر اللہ خاں مرحوم ۳۔ نواب خواجہ سلیم اللہ خاں مرحوم ۔ ۴۔ نواب خواجہ عظمت اللہ خاں مرحوم

اولادِ اناث | ۱۔ محبوب النساء بیگم بیوہ نواب سید لائق علی خاں مرحوم ۔ ۲۔ مظفر النساء بیگم بیوہ نواب محمد محی الدین خاں مرحوم ۔ ۳۔ سلطان النساء بیگم بیوہ نواب محمد معراج الحق صاحب مرحوم ۔ ۴۔ معین النساء بیگم بیوہ محی الدین خاں مرحوم ۔ ۵۔ سعیدالنساء بیگم محل نواب بابر مرزا صاحب

محل پنجم

آفتاب محل (الملقب بہ فرحت محل)

اولادِ ذکور | ۱۔ نواب خواجہ اسد اللہ خاں ۔ ۲۔ نواب خواجہ فضل اللہ خاں مرحوم ۔ ۳۔ نواب خواجہ حشمت اللہ خاں

اولادِ اناث | ۱۔ صاحبزادی ریاست النساء بیگم بیوہ نواب ریاض احمد خاں مرحوم ۔ ۲۔ صاحبزادی افضل النساء بیگم (فوت) ۔ ۳۔ صاحبزادی مہر النساء بیگم (فوت)

محل ششم

رحیمہ بیگم (الملقب بہ عشرت محل)

اولادِ اناث | ۱۔ صاحبزادی حبیب النساء بیگم بیوہ میر سلیمان علی خاں مرحوم ۔ ۲۔ صاحبزادی وزارت النساء بیگم بیوہ نواب اسد اللہ خاں مرحوم

محل ہفتم

رانی دھرم پتی بائی (الملقب بہ بہنیت محل)

اولادِ ذکور ۱۔ آصف پرشاد (فوت) ۲۔ عثمان پرشاد (فوت) ۳۔ خواجہ پرشاد (فوت)
اولادِ اناث ۱۔ رانی سلطان کنور محل ڈاکٹر مدن گوپال صاحب ۔ ۲۔ رانی کرشن کنور محل پرشوتم لال صاحب ۔

مہاراجہ کے محلات میں ہندو مسلم دونوں کو برابر درجہ حاصل تھا۔ صمصام شیرازی اس بارے میں لکھتے ہیں ۔

"آپ کے محلات میں ہندو مسلم دونوں شامل ہیں اور آپ کے صاحبزادگان اپنی ماؤں کے مذہب پر ہیں اور اسی مناسبت سے ان کے نام رکھے گئے ہیں ۔ مراسم زیست و پرورش و نیز عقد و نکاح وغیرہ بھی اسی طرح انجام پاتے ہیں گویا آپ کی ذات ہندو مسلم اتحاد کا ایک بہترین نمونہ ہے ۔" [۱]

مہاراجہ کو بعض بچوں کی بے وقت موت کا شدید صدمہ تھا جس کا ذکر انہوں نے اپنی تصنیفات میں جا بجا کیا ہے ۔ "فریاد شاد" میں "اپنی بیتی" کے زیر عنوان لکھتے ہیں ۔

"فطرتاً مجھے اولاد کے ساتھ خواہ نرینہ ہو یا اناث بہت محبت ہے میرا دل اس محبت کا متوالا ہی نہیں بلکہ دیوانہ ہے ۔ میری سرگذشت اگر کوئی سنے یا دیکھے تو انگشت بدنداں رہے گا کہ اِس قدر تیر حوادث کا شکار ہو کر میں فتراک کے قابل کیوں نہیں ہوا ۔ مگر میں یہ کہتا ہوں کہ بالخصوص میری سرگذشت کا وہ حصہ جو اولاد سے متعلق ہے اس کو جب کبھی میں یاد کرتا ہوں یا پڑھ کر دیکھتا ہوں جس کو میں نے چہل سالہ سرگذشت میں قلم بند کیا ہے تو بخدا میں خود متحیر ہو جاتا ہوں کہ اِس آفت کا تیر ستم کھا کر میں کس طرح بچ رہا ۔ جہاں میں نے بچپن سے اپنے ایک حصۂ عمر کے نشیب و فراز خوفناک گھاٹیوں کی راہ کو طے کرتے ہوئے اڑتالیسویں سال کے کوچہ میں قدم رکھا ہے اِس راستہ میں جو مصائب اولاد کے نقصان کے باعث برداشت کرنے پڑے وہ مختص ہیں ۔ ان قیامت خیز مصائب کے مقابلے میں میری ایک جان جواب تک سلامت رہی اس کو فضل الٰہی کہے بغیر چارہ نہیں [۲] ۔"

مہاراجہ نے محلات اور اولاد کی بے وقت موت کے شدید صدمے سہے اور جنہوں

---

[۱] مشیر عالم ڈائرکٹری ص ۳۱۸ [۲] فریاد شاد ص ۱۰۹

افسردہ خاطر ہے لیکن انہوں نے اپنی سرکاری زندگی کی مصروفیتوں اور ذمہ داریوں میں کبھی کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی۔

سرکاری زندگی

مہاراجہ کی سرکاری زندگی عہدۂ پیشکاری سے شروع ہوتی ہے۔ پیشکاری کے بعد وزارت فوج، مدارالمہامی اور صدر اعظمی جیسے جلیل القدر عہدوں سے سرفراز کئے گئے اور انھیں وقتاً فوقتاً مختلف خطابات اور اعزازات سے بھی سرفراز کیا جاتا رہا۔

پیشکاری مہاراجہ کا موروثی عہدہ تھا۔ اس لئے کہ ان کے جداعلیٰ مہاراجہ چندولال اور راجہ نریندر بہادر پیشکاری کے عہدہ کے فرائض انجام دے چکے تھے۔ مہاراجہ چندولال تو وزارت کے عالی قدر عہدہ پر بھی فائز کئے گئے تھے۔

مہاراجہ نریندر بہادر کو کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی۔ اس لئے مہاراجہ شادی ان کے جائز وارث قرار دیئے گئے۔ نریندر بہادر کی زندگی ہی میں یعنی ۱۲۹۱ھ م ۱۸۷۴ء کو انھیں خاندانی اعزاز کے طور پر راجہ بہادر کا خطاب دیا گیا[۱]۔

مہاراجہ نریندر بہادر کا انتقال ۱۳۰۶ھ ہجری م ۱۸۸۹ء میں ہوا۔ ان کے انتقال کے بعد مہاراجہ کو تین چار سال تک سخت مشکلات اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مہاراجہ نریندر بہادر کے انتقال کے چار سال بعد یعنی ۲/ رجب ۱۳۱۰ھ م ۱۸۹۳ء کو مہاراجہ خدمت پیشکاری سے جو ان کی موروثی خدمت تھی سرفراز کئے گئے[۲]۔ زمانۂ پیشکاری ہی میں ۱۳۱۱ھ ہجری م ۱۸۹۴ء عیسوی میں انھیں اعلیٰ حضرت کی جانب سے راجہ راجایان کا خطاب عطا کیا گیا[۳]۔

نواب سر وقار الامراء کے شملہ جانے کے بعد ۲۵/ صفر ۱۳۱۳ھ ہجری م ۱۸۹۵ء سے مہاراجہ نے مدارالمہامی کے عہدہ پر منصرمانہ کام شروع کیا۔ ۱۶/ شعبان ۱۳۲۰ھ م ۱۹۰۳ء کو مستقل مدارالمہام بنائے گئے۔

مہاراجہ کے جداعلیٰ مہاراجہ چندولال بھی مدارالمہام رہ چکے تھے۔ جس محنت اور خوش اسلوبی سے ان کے اجداد نے اپنے فرائض انجام دیئے انھیں کے نقشِ قدم پر چل کر

---

[۱] دبدبۂ نظام حصہ اول باب ثانی ص ۸ [۲] دبدبۂ نظام حصہ اول باب ثانی ص ۸
[۳] تزک محبوبیہ جلد دوم ص ۱۶۲

مہاراجہ نے بھی حتی امکان یہی کوشش کی کہ اپنے فرائض کو حسن وخوبی سے انجام دیں۔ مہاراجہ نے بادشاہ وقت کی خوشنودی، اطاعت اور فرماں برادری کا خاص خیال رکھا۔ جس کی وجہ سے ان کی مختلف خدمات کی ہمیشہ ستائش کی گئی۔ انگریز حکمران بھی ان کی بلند شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اسی سال یعنی شوال ۱۳۲۰ھ ہجری م ۱۹۰۳ء میں مہاراجہ کو حکومت برطانیہ کی طرف سے کے۔سی۔آئی۔ای کا خطاب دیا گیا[1]۔ اس کے بعد ۱۳۲۴ھ ہجری م ۱۹۰۶ء میں مدار المہامی کی جلیل القدر خدمات کے صلہ میں انھیں جارج پنجم کی سالگرہ کے موقع پر جی۔سی۔آئی۔ای کا خطاب عطا کیا گیا۔ ۲۵/رجب ۱۳۳۰ھ ہجری م ۱۹۱۲ء تک مدار المہامی کے عہدہ پر فائز رہنے کے بعد مہاراجہ نے استعفیٰ دے دیا۔ اور سیاسی مصروفیتوں سے سبکدوش ہوکر علمی مشاغل میں مصروف ہوگئے[2]۔ اس زمانہ میں مختلف مقامات کا سفر کیا اور وہاں کے حالات اور دیگر تفصیلات کو روزنامچہ کی صورت میں محفوظ کرتے گئے۔ شعر وسخن کی باقاعدہ محفلیں منعقد کرنے لگے جن میں نامور شعراء شریک ہوتے اور اپنا کلام سنایا کرتے تھے۔ علمی اور ادبی مشاغل کے علاوہ مہاراجہ نے اپنے فرصت کے اوقات کو دوسرے مشاغل جیسے پینٹنگ وغیرہ میں بھی صرف کیا۔ بہرحال اپنی عمر کے کسی حصے میں بھی انہوں نے بیکار رہنا پسند نہیں کیا۔ کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہے۔

مہاراجہ کی خاندانی وفاداری اور ان کی اعلیٰ خدمات کے پیش نظر آصف سابع نواب میر عثمان علی خاں نے انھیں ۱۳۴۵ھ ہجری م ۱۹۲۶ء میں صدر اعظم باب حکومت جیسی اعلیٰ خدمت عطا کی[3]۔ اس مرتبہ بھی مہاراجہ نے اسٹیٹ کے فرائض محنت اور خوش اسلوبی سے انجام دیئے۔ اور گذشتہ چند سالوں میں جو خامیاں پیدا ہوگئی تھیں وہ ان کی صدارت عظمیٰ کے زمانہ میں دور ہوگئیں۔ مہاراجہ نے نظم ونسق میں بہت سی اصلاحیں کیں۔ ملک کی سماجی، معاشی اور تعلیمی ترقی کے لئے ہر ممکنہ تدبیر اختیار کی۔ چنانچہ ان کے عہدۂ صدارت عظمیٰ میں ریاست حیدرآباد ایک پرامن اور خوش حال ریاست بن گئی[4]۔ ۴/شعبان ۱۳۴۵ھ ہجری م ۱۹۲۷ء کو مہاراجہ نے نواب مہدی نواز جنگ کو اپنی پیشی کے فرائض کی انجام دہی کے لئے مقرر کیا۔ صدر اعظم باب حکومت کی خدمت کے فرائض کی انجام دہی کے لئے انھیں صرف تین سال کے لئے مقرر کیا گیا تھا لیکن ۲۹/ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ م ۱۹۳۷ء تک پورے دس سال اس خدمت پر فائز رہے[5]۔

---

[1] تزک محبوبیہ جلد دوم ص ۳۶۲، [2] تذکرہ باب حکومت ص ۱۵۸، [3] تذکرہ باب حکومت ص ۱۹، [4] مہاراجہ کشن پرشاد ص ۱۹۱۔

مہاراجہ کا مذہب

مہاراجہ کے مذہب کے بارے میں خود ان کی زندگی میں اختلاف رائے رہا اور مہاراجہ پر طرح طرح کے اعتراضات کئے جاتے رہے۔ جس کے بارے میں مہاراجہ اپنے خطوط رسائل اور مختلف نظموں میں اپنے عقیدے اور مسلک کی وضاحت کرتے رہے اور معترضین پر جھنجھلاتے رہے۔ مہاراجہ کی اس صراحت اور وضاحت کے باوجود زندگی بھر ان پر اعتراضات کا سلسلہ جاری رہا اور ان کے انتقال کے بعد بھی اُن کے مذہب کے بارے میں اختلاف رائے باقی رہا۔ مہاراجہ کے انتقال کے بعد مرزا فرحت اللہ بیگ جن کے مہاراجہ سے قریبی تعلقات تھے اپنے مضمون "یادرفتگان" میں مہاراجہ کے مذہب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"مہاراجہ بہادر کے مذہب کے متعلق لوگوں کے عجیب عجیب خیالات ہیں۔ کوئی ان کو مسلمان کہتا ہے کوئی ان کو لامذہب سمجھتا ہے اور کوئی اُن کو ہندو مانتا ہے۔ لیکن ہے یہ بات کہ جو لوگ ان کے ہاں زیادہ آتے جاتے تھے اور جن سے وہ کھلے ہوئے تھے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ اپنے آبائی مذہب پر قائم تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ ہر مذہب کے بزرگانِ دین کو نہ صرف اچھا سمجھتے تھے بلکہ ایک حد تک ان سے عقیدت بھی رکھتے تھے۔"[1]

مرزا صاحب نے مہاراجہ کے مذہب کے بارے میں اپنی رائے کا واضح طور پر اظہار کیا ہے۔ لیکن نواب بہادر یار جنگ مرحوم نے مہاراجہ کے مذہب کی حیرت انگیزی کے ذکر پر اکتفاء کیا ہے مرزا صاحب کی طرح انہوں نے کوئی متعین رائے نہیں دی۔ وہ اپنے مضمون "آں قدح بشکست وآں ساقی نہ ماند" میں لکھتے ہیں۔

"سب سے زیادہ حیرت انگیز ان کی زندگی کا مذہبی پہلو تھا۔ دسہرہ دیوالی میں ہندو پنڈت پھول اور میوے کی تھالیوں کے ساتھ آتے ان کی پیشانی پر قشقہ لگاتے اور اپنے مذہبی اشلوک پڑھ کر ان پر دم کرتے۔ اور وہ ایک سچے بھگت کی حیثیت میں نہایت احترام سے اس کو بھی قبول کر لیتے۔ ابھی چند لمحے نہیں گزرنے پاتے کہ ان کی زبان سے قرآن مجید کی آیتیں پھول کی طرح جھڑنے لگتیں۔ اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ مسلمان کے سواء

---

[1] مجلہ عثمانیہ مہاراجہ نمبر ص ۲۴، ۲۵

کچھ اور ہیں۔ دیکھنے والا ان متضاد کیفیات سے ابھی حیران ہی ہوتا کہ شاگرد پیشہ بڑے ادب سے بتاشہ کی ایک پڑیا ان کی خدمت میں پیش کرتا وہ فوراً اس پر کچھ دم کرنے لگتے۔ حزب البحر سے ان کو عشق تھا اور اس عمل سے اپنے معجزے بار بار بیان کرتے تھے۔ خواجہ سلطان الہند غریب نوازؒ کا ان سے بڑھ کر معتقد میری نظر سے نہیں گزرا۔ ہر مہینہ کی چھٹی تاریخ خواجہ صاحب کی نیاز ہوتی...... ان کی محفل کا سب سے بڑا مبلغ اسلام شاید میں رہا ہوں اور اسوۂ حسنہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی پاک اور بے نفس زندگی اور قرون اول کے دل ہلا دینے والے واقعات بیان کر کے میں نے ان کو بار بار رلایا ہے۔ اور کبھی مجھے محسوس نہیں ہوا کہ میں ایک غیر مسلم سے یہ چیزیں بیان کر رہا ہوں۔[۱]"

واقعہ یہ ہے کہ مہاراجہ کی زندگی عجیب جامع الاضداد تھی۔ ان کا طرز زندگی مسلمانوں کا سا تھا۔ مسلمان پیروں اور فقیروں کے وہ شیدائی تھے۔ مسلمان بزرگوں کی درگاہوں پر حاضری دیتے تھے۔ ان کے محلات میں سے چار محلات مسلمان تھیں اور ان کے بطن سے جتنی اولاد ہوئی وہ سب مسلمان تھی اور ہے۔ حضرت خواجہ حسن نظامی سے انھیں بیعت تھی۔ خواجہ صاحب نے انھیں خماری شاہ کا لقب بھی عطا کیا تھا۔[۲] یہ عجیب بات ہے کہ خواجہ صاحب نے اپنے رسالہ "ایمان الکفار" میں بڑی وضاحت اور قطعیت کے ساتھ مہاراجہ کے مسلمان ہونے کا اعلان فرمایا ہے۔ لیکن خود مہاراجہ نے کہیں بھی اپنے اسلام کا اعلان نہیں کیا۔ اس کے برخلاف وہ ہمیشہ اپنے کھتری النسل ہونے پر فخر کرتے رہے۔ اپنے حسباً ونسباً ہندو ہونے کا بار بار اعلان کیا۔[۳] ہندو رانیوں سے شادیاں کیں۔ ان کے بطن سے جتنی اولاد ہوئی وہ سب ہندو ہے۔ وہ جس طرح درگاہوں پر نذر گزرانتے تھے اسی طرح مندروں اور گردواروں میں جا کر نذریں چڑھاتے تھے۔ ہندو رشیوں کی ایسی ہی عزت کرتے جیسے مسلمان فقیروں کی عزت کرتے۔ ان کے مسلک کی اسی بوالعجمی کو دیکھ کر لوگ ان پر اعتراض کرتے تو وہ معترضین پر برہم ہونے لگتے۔ اپنے خطوط میں اپنے مذہب و مسلک بارہا صراحت سے بیان کیا ہے۔ جس میں انہوں نے واضح الفاظ میں یہ اعلان کیا ہے کہ وہ نہ تو ہندو ہیں نہ مسلمان۔ ان کا مذہب صوفیانہ ہے۔ توحید پر ایمان رکھتے ہیں۔ شرک و بت پرستی کو ناپسند کرتے ہیں ہر قسم کی مذہبی پابندیوں سے وہ آزاد ہیں۔ مذہبی تعصب کو وہ

---

[۱] مجلہ عثمانیہ مہاراجہ نمبر ص ۷۔۴ [۲] خمار رشاد ص ۳ [۳] ہندو بھائیوں سے خطاب ص ۸

تنگ نظری سمجھتے ہیں۔ وہ صلح کل اور وسیع المشربی کے قایل ہیں۔ ہندو اور مسلمان کی تفریق انھیں پسند نہیں۔ وہ سب بندگان خدا سے محبت رکھتے ہیں۔ غرض یہ اور اسی طرح کے خیالات کا اظہار انھوں نے اپنی تحریروں میں جگہ جگہ اظہار کیا ہے۔ "جذبات شاد" میں لکھتے ہیں۔

"میری عقیدت کسی ولی یا نبی کے ساتھ غرضانہ نہیں ہے۔ اور نہ میرے مذہب کو تقیہ کی ضرورت ہے۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ میں قوم کا سپاہی النسل یعنی کھتری ہوں لیکن میرا مذہب بالکل اور قطعی صوفیانہ ہے۔ البتہ عالم طفولیت سے جب سے کہ میں نے ہوش سنبھالا اور تسمیہ خوانی کی رسم ادا ہوئی میں۔ اہل اسلام کے استادوں اور اتالیقوں کے تفویض کیا گیا تھا[1]"

دل شاہجہاں آبادی کو اپنے ایک خانگی خط میں لکھتے ہیں:—

"کیا یہ صحیح ہے سنا گیا ہے اور تواتر کے ساتھ کہ حضرت محمد شاہ صاحب قبلہ کو رنج ہوا کہ شاد کافر کو خلعت کیوں ملا۔ اس کے مستحق تو بہت سے مسلمان تھے۔ اللہ اللہ آپ کو معلوم اور خدا گواہ ہے کہ اس کی ابتداء دیوان جی صاحب سے ہوئی۔ میری استدعا ہی نہ تھی۔ میں اپنے کو دنیا کے کام کے لحاظ سے وزارت کا کب اپنے کو اہل سمجھا ہوا تھا جو دینی طریقے سے اپنے کو کچھ اور سمجھتا۔ مگر دینے والا دیا تو اس کو میں کس طرح واپس کروں اگر کسی دنیا کی غرض سے حاصل کرنا ہوتا تو یہ ظاہر ہے کہ میری دنیا حضور بندگان عالی کے ہاتھ میں ہے ان کو چھوڑ کر دیوان جی صاحب سے کیوں استدعا کرتا حضور کے خوش کرنے کے لئے سب دکن کے ہندوؤں میں شاد اول اول ہوتا کہ حضور کے ہاتھ پر ایمان لا کر اپنے کو مسلمان کہتا اور کہواتا۔ ائے مجھے تو اس خبطانے اور جادو نے در بدر پھرایا ہے

کفر کافر کو بھلا شیخ کو اسلام بھلا
ہم تو ہیں آپ بھلے اپنا دلارام بھلا

بھلا جو دیوانہ اپنے کو صوفی سمجھے یا صوفی ہونے کی کوشش کرے وہ بھلا پلٹ کر پھر دوسرے مذہب کو اختیار کیوں کرنے چلا تھا۔

---

[1] جذبات شاد ص ۷

عمر تو ساری کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے[1]

مہاراجہ کے اس خط میں ان کا یہ جملہ کہ "سب دکن کے ہندوؤں میں شاد اول اول ہوگا کہ حضور کے ہاتھ پر ایمان لاکر اپنے کو مسلمان کہتا اور کہواتا" ان کے مشرف بہ اسلام نہ ہونے کا واضح اعلان ہے۔

مہاراجہ نے اپنی مختلف نظموں میں اپنے مسلک کی وضاحت کی ہے۔ "پریم درپن"[2] کے دو شعر یہ ہیں۔

میں ہوں ہندو میں ہوں مسلماں	ہر مذہب ہے میرا ایماں
شاد کا مذہب شاد ہی جانے	آزادی آزاد ہی جانے[2]

مہاراجہ اپنی وسیع المشربی کے باعث ہر مذہب و ملت کے مذہبی اجتماعات میں شریک ہوتے اور ان کے معابد کی زیارت کرتے۔ اور ایسی عقیدت کا اظہار کرتے کہ ہر فرقہ انھیں اپنے عقائد کا پرستار سمجھتا۔ اپنی مثنوی خمار شاد میں انہوں نے اپنے مسلک کی اسی وسعت اور مقبولیت کا بڑے دلچسپ انداز میں ذکر کیا ہے۔

کبیریوں نے پکارا کبیر متر مجھے	جو نانکی تھے مجھے نانکی ہی کہتے تھے
جو قادری تھے وہ سب قادری ہی کہتے تھے	تعصبی جو تھے کافر مجھے وہ کہنے لگے
نظامیہ مجھے کہنے لگے نظامی سب	جو صابری ہوں انہیں بھی صابری ہو لقب
ابوالعلائیوں سے میں نے فیض پایا ہے	جو نقشبند ہیں انہیں بھی میرا پایا ہے
اسی طرح سے جو چشتی ہیں کہتے ہیں چشتی	ہزار شکر یہ دولت مجھے خدا نے دی
کلیموں میں یہ غل ہے کہ ہو حسینی شاہ	مرا ہے مشرب حق لا الہ الا اللہ[3]

نظم و نثر کے جو اقتباسات پیش کئے گئے ہیں ان میں انہوں نے صاف کہہ دیا ہے کہ وہ نہ ہندو ہیں نہ مسلمان۔ اپنا مذہب انہوں نے صوفیاء کا مذہب قرار دیا ہے۔ حالانکہ اسلامی تصوف مذہب اسلام سے ہٹ کر کوئی علحدہ مذہب نہیں ہے۔ بلکہ صوفیاء جس کو تصوف کہتے ہیں وہ اسلامی عقائد کا فلسفیانہ مطالعہ ہے۔ درحقیقت تصوف (MYSTICISM) ایک طریق فکر ہے۔ اس کی اسلام کے ساتھ کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ عیسائیت، ہندومت میں

---

[1] خط مخزونہ حیدر گنجی کتب خانہ حیدرآباد دکن [2] پریم درپن ص ۴
[3] خمار شاد

بھی ایسا طریق فکر رہا ہے۔ لیکن کسی مذہب میں بھی یہ طریق فکر ایک علیحدہ مذہب نہیں بنا۔ ہر مذہب کے بنیادی عقائد و احکام ہوتے ہیں۔ ان کو تسلیم کئے بغیر کسی پر اس مذہب کی قبولیت کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ مہاراجہ نے کبھی اسلام کے تمام بنیادی عقائد کو قبول کرنے کا اعلان نہیں کیا۔ عقائد اسلام میں انہوں نے صرف عقیدۂ توحید کو لے لیا ہے۔ اور اس قبولیت میں بھی اس عقیدے کے صرف فکری پہلو کو اپنایا ہے۔ اور اس کے عملی اور شرعی پہلوؤں کو چھوڑ دیا ہے۔ توحید کا عقیدہ بعض فلسفیانہ اختلافات کے ساتھ چونکہ دوسرے مذاہب میں بھی ہے اس لئے مہاراجہ یہ سمجھتے تھے کہ سارے مذاہب کی اصل یہی عقیدہ ہے۔ اور اس پر ایمان رکھنا کافی ہے۔ اسی بناء پر وہ اپنے کو کسی مذہب کا پابند نہیں سمجھتے تھے۔ اور تصوف کو جو درحقیقت مسلمان فقراء کا ایک طریق فکر ہے انہوں نے اپنا مذہب قرار دے لیا تھا۔ اور اس کو صوفیاء کا مذہب کہا کرتے تھے۔

جو حضرات یہ چاہتے تھے کہ مہاراجہ اپنے اسلام کا کھلے الفاظ میں اعلان کر دیں تو ان حضرات کو بھی انہوں نے اپنے مذہب و مسلک کے بارے میں یہی باتیں کہی ہیں۔ "رقعات شاد" میں ایک طویل خط مولانا عزیب شاہ صاحب کے نام ہے۔ مہاراجہ انھیں لکھتے ہیں۔

> "مولانا آپ کا یہ ارشاد کہ بابا کشن پرشاد تیرے عادات اور تیرے اخلاق دیکھ کر مجھے رشک ہوتا ہے کہ تو مسلمان کیوں نہ ہوا۔ واہ مولانا! مسلمان ہونے کی ایک ہی کہی۔ میں نہیں سمجھا کہ مسلمان کس کو کہتے ہیں۔ اگر مسلمانی اسی کو کہتے ہیں اور اسی کا نام ہے کہ فقط داڑھی بڑھا دیں اور عبداللہ، عبدالرحمٰن نام رکھیں اور تعصب پرست ہوں تو بندہ ایسی مسلمانی کو دور ہی سے سلام کرتا ہے ..... آپ اپنے موحد ہونے کا بہت کچھ دم بھرتے ہیں مگر میرے مسلمان ہونے کی فکر میں کیوں مرتے ہیں۔ اپنے کو پکا صوفی بھی جتلاتے ہیں اور تسبیح و زنار کے بکھیر میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہائے افسوس۔ کیوں مولانا آپ اس بات کو جائز رکھتے ہیں کہ صوفی اور موحد کہلا کر کفر و اسلام کے جھگڑے میں مبتلا رہیں۔ مولانا ایک شعر یاد آیا ؎
>
> کفر و اسلام کے جھگڑے میں نہ پڑنا اے شاؔد
> بندے اللہ کے ہیں گبر و مسلمان دونوں
>
> مولانا آپ میرے کفر و اسلام کی فکر میں بالکل نہ پڑیئے۔ جو وقت یادِ حق

میں گو وے اس کو غنیمت جانئے۔ خامیاں خدا جانتے ہی نہیں کہ اسلام کس محراب
ابرو کا کعبۂ مقصود ہے۔ اور کفر کون سے صنم پرست دل کا بت خانہ ہے۔
یہ بھی گھر خدا کا اور وہ بھی گھر خدا کا۔ ہر جگہ اسی کا جلوہ ہے۔ جو اس کا منکر
ہے وہ موحد نہیں[۱]"

ایک اور صاحب کو مہاراجہ کے عقائد دریافت کرنے کی بڑی فکر تھی۔ اور وہ چاہتے تھے کہ مہاراجہ اپنی زبان سے اپنے مسلمان ہونے کا اقرار و اعلان کریں۔ اس سلسلہ میں وہ اپنے ایک دوست سید عبدالعلی صاحب حقانی کو لکھتے ہیں۔

"میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ دوست کی آج کی اس تقریر کا کیا مطلب تھا۔ اور میرے عقائد دریافت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ سالکان طریقت کا کیا یہی مسلک تھا۔ پیشوایان حقیقت کی رہنمائی کا کیا یہی طریقہ ہے۔ کیا میں نے کبھی آپ سے یا ان سے دعویٰ اسلام کیا تھا۔ جو اس پہلو سے میرے عقائد دریافت کرکے شاہد بننا چاہتے ہیں اور مجھے اظہار اسلام کی تحریص دی جاتی ہے۔ ماشاءاللہ قاضی جی دبلے کیوں شہر کے اندیشے سے میرے عقائد سے آپکو کیا کام اور ان کو کیا غرض۔

کیا عافیت میں آپ مجھے بخشوائیں گے یا آپ کے دوست باعث نجات ہوں گے۔ کافر ہوں تو میں ہوں۔ الحمد للہ کہ اس وحدہٗ لاشریک کا بندہ ہوں۔ آپ کا اسلام ختنہ روزہ اور نماز ہے۔ میرا اسلام ترک خودی و معرفت بے نیاز ..... آپ مجھے کافر ہی رہنے دیجئے۔ جیسا کہ عموماً اہل اسلام سوائے مسلمان کے کل اقوام کو کافر سمجھتے ہیں۔ ایسا ہی آپ مجھے بھی کافر سمجھئے۔ میرے مومن بنانے کی فکر نہ کیجئے۔ .... میں ایک آزاد اور فقیر منش متوکل دنیا دار ہوں۔ میرا مشرب صلح کل ہے۔ بت پرستی کو شرک سمجھتا ہوں۔ نماز پڑھنا سیکھا ہی نہیں۔ اللہ اللہ کہتا ہوں۔ گلے میں زنار رکھتا ہوں۔ الحمد للہ نہ میں طالب دنیا ہوں نہ طالب عقبیٰ۔ طالب مولیٰ ہوں[۲]"

اس خط میں بھی انہوں نے صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ انہوں نے دعویٰ اسلام کبھی نہیں

---

[۱] رقعات شاد ص ۱۴۶، ۱۴۷ [۲] رقعات شاد ص ۲۵۵، ۲۵۶

کیا اور نہ ہی نماز سیکھنے کی کوشش کی۔ اور ساتھ ہی ساتھ انہوں نے روزہ اور نماز جیسے فرائض سے بھی انکار کیا ہے۔ البتہ انہوں نے اکبر الہ آبادی کے نام ایک خط میں اپنی عادت کے خلاف ایمان باللہ کے علاوہ ملائکہ، کتب اور رسل پر اپنے ایمان لانے کا بھی ذکر کیا ہے۔ چنانچہ مہاراجہ لکھتے ہیں۔

"شاد ان ہی جھگڑوں سے گھبرا کر اپنے آبائی مذہب کو خیر باد کہہ کر آزاد ہو گیا۔ اگر دیکھا تو صرف صوفیان باصفا کا ایک پیارا اور بے لوث مذہب پایا۔ اس لئے اسی کو اختیار کیا۔ اور دعا کرتا ہے کہ خدا اپنی وحدت پر رکھے۔ اور اپنی محبت اور توحید پر چلائے۔ اور آخر سانس بھی اقرار توحید پر یار کے درشن کرتے ہوئے نکلے۔ بندے کا اصلی ایمان بالفاظ عربی یہ ہے۔ امنت باللہ و ملائکتہ و کتبہ و رسلہ لانفرق بین احد من رسلہ ھو الاول، ھو الاخر، ھو الظاھر، ھو الباطن۔

ترجمہ۔ جس زبان میں کیا جائے اس کے اصلی مقصود اور معنوں سے غرض ہے اور یہی ایمان ہے۔ باقی فضولیات سے شاد کو نفرت ہے۔ چاہے مشائخین مجھے کفر کا فتوئی دیں یا پنڈت مجھے ادہری کہیں، مگر بندہ سب بزرگوں اور ادیان اور سب مذاہب کو برحق سمجھتا ہے مجھے کسی سے نہ انکار ہے نہ دشمنی۔ ہاں ایک اجمیری میاں کا دلدادہ ہوں۔ اور کیوں نہ ہوں اکی بھی مجھے خبر تھی۔ . . . . . قید ما و من اور کفر و اسلام سے بری ہوں اور خدا بری رکھے۔ بغض سے بچائے[1]۔"

اسلام میں اللہ کے ساتھ ملائکہ، کتب، رسل، قیامت اور سزا و جزا پر بھی ایمان لانا شرائط اسلام میں سے ہیں۔ مہاراجہ نے اس خط کے علاوہ اپنی کسی اور تحریر میں اللہ کے سواء ملائیکہ، کتب اور رسل پر ایمان لانے کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس خط میں بھی مہاراجہ نے اسلام کے بنیادی عقائد کو قبول کرنے کا اظہار کرنے کے باوجود اسلام کے عملی اور شرعی پہلو کو "باقی فضولیات" سے تعبیر کیا ہے۔ اور اپنے کو کفر و ایمان کے جھگڑے سے بری رکھا ہے۔ مہاراجہ نے اپنی متعدد تحریروں میں اپنے مذہب کے بارے میں بار بار یہی وضاحت کی ہے کہ وہ کسی مذہب

---

[1] اکبر الہ آبادی اور مہاراجہ کشن پرشاد کی خط و کتابت ص ۲۷

یں مقید نہیں ہیں ۔ وہ ہندو ہیں نہ مسلمان ہیں ۔ ان کا مذہب صرف تصوف اور توحید ہے ۔ اپنے مذہب و مسلک کے بارے میں مہاراجہ کی ان متعدد وضاحتوں کے مقابلہ میں صرف ایک خط میں ایمان مجمل کے اقرار کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی ۔ خصوصاً جب کہ وہ اس خط میں کفر و اسلام سے اپنی آزادی کا بھی اعلان کر دیتے ہیں ۔ مہاراجہ نے اپنی متعدد تحریروں میں ارکان اسلام سے انکار کیا ہے اور وہ بہ خیال خود ارکان اسلام کو اسلام کے لئے ضروری نہیں سمجھتے ۔ اس لئے زبردستی انھیں مسلمان سمجھنا اسلام اور مہاراجہ دونوں کے ساتھ زیادتی کرنا ہے ۔

ہر شخص کو آزادی ہے کہ وہ جس مذہب کو چاہے قبول کرے یا اپنے چند مخصوص عقائد کو اپنا مذہب قرار دے لے ۔ جیسا کہ مہاراجہ نے کیا ہے ۔ لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ مہاراجہ نے تو اپنے مذہب و مسلک کے بارے میں بار بار وضاحت سے لکھ دیا ہے لیکن اس وضاحت اور صراحت کے بعد بھی اُن کے مرشد خواجہ حسن نظامی ان کے مسلمان ہونے کا کس قوت و ایقان کے ساتھ اعلان فرماتے ہیں ۔ خواجہ صاحب اپنے رسالہ " ایمان الکفار " میں مہاراجہ کے اسلام کا نہ صرف اعلان کرتے ہیں بلکہ ان کے اسلام پر حیدرآباد کے مسلمانوں کو گواہ بھی ٹھہراتے ہیں ۔ وہ لکھتے ہیں ۔

> " میں خدا کے سامنے حشر کے دن یہی گواہی دوں گا اور آج بندگانِ حق کی عدالت میں بھی شہادت دیتا ہوں کہ راجہ کشن پرشاد سچے مومن و موحد ہیں اور میں نے شرک و کفر کا ایک ذرہ بھی ان کے اعمال و عقائد و افعال میں نہیں پایا ۔ ان کی نماز باجماعت کی شاہد حیدرآباد کی اکثر مخلوق ہے جس کے ساتھ انہوں نے مکہ مسجد کے اندر حضور نظام (نواب محبوب علی خاں بہادر مرحوم) اور حضور نظام (نواب میر عثمان علی خاں بہادر مرحوم) کے ہمراہ جماعت کی نماز پڑھی ہے ۔"[1]

خواجہ صاحب کی اس گواہی کی ہستی کی کوئی اہمیت نہیں رہتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ خود مدعی نے اپنی نظم و نثر میں اپنی سمتی کا بہ تکرار اعلان کیا ہے ۔ کتاب " مہاراجہ کشن پرشاد " میں مہاراجہ کے مسلک کے بارے میں بہت صحیح رائے ظاہر کی گئی ہے ۔

دو کشن پرشاد اسم با مسمیٰ نکلے ۔ کشن کے شیدا خواجہ پرشاد اور کامل ہوتی جب سن شعور کو پہونچے اور برے بھلے کی پہچان ہوئی اسی وقت سے

---

[1] ایمان الکفار ص ۷

۱۰۔ ان کی زبان پر گیتا اور قرآن اور دل میں مولا اور بھگوان رہے۔ انہوں نے گیانیوں کے ساتھ آسن مار کر ہری ہر کی سمرن جپی اور صوفیوں کے ساتھ دوزانو ہو کر "اللہ ہو" کی ضربیں لگائیں"

سچ تو یہ ہے کہ مہاراجہ نہ ہندو تھے نہ مسلمان۔ ان کے اپنے چند عقائد تھے۔ انھیں عقائد کو وہ اپنا مذہب سمجھتے تھے ؎

شاد کا مذہب شاد ہی جانے

مہاراجہ کے مشاغل

مہاراجہ انتہائی مصروف زندگی گزارتے تھے۔ ان کے وقت کا بیشتر حصہ امور مملکت کی مصروفیات کی نذر ہو جاتا تھا۔ اس کے باوجود وہ علم و ادب کی خدمت کے لئے وقت نکال لیتے تھے۔ علم و ادب کے علاوہ انھیں مختلف فنون سے بھی دلچسپی تھی۔ جب بھی انھیں فرصت ملتی وہ ان دلچسپ مشغلوں میں اپنا وقت صرف کرتے تھے۔ صبح چار بجے بیدار ہوتے اور اکثر رات کو بارہ بجے کے بعد سوتے۔ سیاسی کاموں سے فرصت پانے کے بعد جو وقت ملتا اس کو مختلف مشاغل میں صرف کرتے۔ مہاراجہ کے خاص مشاغل میں پینٹنگ، خطاطی، نقاشی، فوٹوگرافی، تیراندازی، عطرسازی، ٹینس، بلیرڈ، طباخی وغیرہ شامل ہیں۔ ترنگ راج عالی اپنے ایک مضمون "حضرت شاد اب کہاں عالی" میں مہاراجہ کے مشاغل کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"آپ حکیم تھے، حکمت سیکھی تھی۔ بہ زمانہ پیشکاری مطب فرمایا کرتے تھے۔ آپ علم رمل اور جوتش کے ماہر تھے۔ اکثر صحیح احکام لگاتے تھے جس کا مجھے کافی تجربہ ہے۔ بلدہ کے متعدد اصحاب بھی اس سے واقف ہیں۔ آپ سپاہیانہ جوہر سے متصف تھے۔ شکار اچھا کرتے تھے تلوار، بنوٹ وغیرہ کے خوب ماہر تھے۔ آپ نے برسوں تک باضابطہ ورزش کی تھی۔ آپ کو فن مصوری، نقاشی، عطرسازی میں کمال تھا۔ فتنۂ شاد آپ ہی کی ایجاد ہے۔ آپ کو موسیقی میں اچھا دخل تھا۔ آپ

۱؎ مہاراجہ کشن پرشاد ص ۱

نے اس کو باضابطہ سیکھا تھا۔ ستار، ہارمونیم وغیرہ آپ کے خاص مذاق
کی چیز تھی۔ آپ کھانے اور کھلانے کے بڑے شایق تھے اکثر دفعہ آپ
نے مجھے اور اپنے دیگر دوستوں کو بعض نایاب کھانے پکا کر کھلائے
ہیں۔[۱]"

نواب مہدی نواز جنگ بہادر مہاراجہ کی اکثر نجی صحبتوں میں شریک رہتے تھے اس لئے نواب صاحب ان کی روزمرہ زندگی کی مصروفیتوں، مشغلوں اور شوق کی چیزوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ چنانچہ وہ اپنے ایک مضمون "مہاراجہ کی سیرت کے بعض پہلو" میں لکھتے ہیں:

"مہاراجہ کے تفریحی مشاغل میں عطروں کا تیار کرنا، ادویہ کا بنانا، جلد سازی، نقاشی، عکاسی، خطاطی، ناخن سے تحریر اور نقش و نگار موم اور پلاسٹر سے مجسموں کا بنانا داخل تھے۔ ساٹھ برس کی عمر تک ٹینس، کشتی رانی، سواری اور بڑے شکار میں دلچسپی لیتے تھے آخری زمانہ میں بلیرڈ کھیلا کرتے تھے[۲]۔"

مہاراجہ اپنے وقت کا ایک ایک لمحہ قیمتی سمجھتے تھے۔ دوران سفر میں جو وقت ملتا اس کو بھی مختلف کارآمد مشاغل میں صرف کرتے تھے۔ تفریحی اوقات میں آئیل پینٹنگ، واٹر کلر اور تصویر کشی کیا کرتے تھے[۳]۔

مہاراجہ کے مختلف سفرناموں اور روزناموں سے بھی ان کے مشاغل اور ان کی مصروفیات کا اندازہ ہوتا ہے۔ جذبات شاد میں انہوں نے بطور خاص اپنے مشاغل کی تفصیل دی ہے وہ لکھتے ہیں۔

"میری بیکاری کا جو وقت گزرتا تھا اس کی تفصیل یہ ہے۔ بہت سا حصہ مطالعہ کتب تصوف میں، جس کا مجھے بچپن سے مرض ہے اس کے بعد معائنہ اخبارات اور پینٹنگ، فوٹوگرافی، موسیقی، ستار، ہارمونیم، پیانو بلکہ میرے جد امجد، مہاراجہ نریندر نے اپا تلسی نامی زنار دار جو اہل فن تھا اس سے مجھے موسیقی کی تعلیم بھی دلوائی تھی۔ یعنی گلے سے بھی میں کچھ کام کر سکتا تھا۔ مگر وہ زمانہ اور وقت اور ہی تھا جواب فسانہ اور خواب ہو گیا بازی، شطرنج، برج، بلیرڈ، ٹینس، نشانہ اندازی، تیر اندازی بلکہ کبھی

---

[۱] مجلہ عثمانیہ مہاراجہ نمبر ص ۱۱ [۲] مجلہ عثمانیہ مہاراجہ نمبر ص ۶۴ [۳] سفر خاندگر ص ۶۸

کبھی ضیافت طبع خود جایکہ کے لئے طباخی، کشیدہ، کارچوب، بہرحال جس وقت جو ہو سکے اور مرغوب طبع ہو۔[۵۱]

مہاراجہ چندولال اور مہاراجہ نریندر کی طرح مہاراجہ کشن پرشاد کو بھی تعمیر عمارات کا شوق تھا۔ اس کے علاوہ انھیں مختلف نادر اشیاء جمع کرنے کا بھی شوق تھا۔ ان کے شوق کی چیزوں میں ہتھیار، قیمتی لباس، فرش، فرنیچر، جواہرات، فوٹو، مونوگرام، کرسمس کارڈ، فونٹین پین جیسی گھڑیاں وغیرہ ہیں۔ ان میں اکثر چیزیں دوست احباب کو بطور تحفہ دے دیا کرتے تھے۔[۵۲]

نواب ماندور خاں اکثر دوروں میں مہاراجہ کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے مہاراجہ کو بہت کم سوتے دیکھا ہے۔ ہمیشہ تیز روشنی رہا کرتی اور وہ پینٹنگ کا سارا سامان پھیلائے اس مشغلہ میں ہمہ تن مصروف رہا کرتے تھے۔

انتقال

مہاراجہ کی علالت آخری زندگی اور ان کے انتقال کے بارے میں کسی تاریخ یا تذکرہ میں کسی قسم کا مواد نہیں ملتا۔ البتہ نرسنگ راج عالی نے اپنے ایک مضمون "حضرت شاداب کہاں عالی" میں اس سلسلہ میں معتدبہ مواد فراہم کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ مہاراجہ ۱۳۴۸ف م ۱۹۳۸ء میں موسم گرما میں بیمار ہوئے۔ دل کی شکایت کی وجہ سے بہت بے چین رہتے تھے۔ عرصہ دراز تک شب بیداری کا سلسلہ جاری رہا۔ آخری ایام کے بارے میں نرسنگ راج عالی لکھتے ہیں کہ ان دنوں مہاراجہ مسلسل قوالی کی محفلیں آراستہ کرواتے اور دن رات یہی شغل رہتا۔ علالت کے زمانے میں بھی مہاراجہ نے شاہی درباروں میں حاضری دینے سے کوتاہی نہیں کی۔ انتقال سے چند ماہ قبل بائیں ہاتھ اور مونڈھے میں سخت تکلیف شروع ہو گئی تھی۔ اس زمانہ میں جن ڈاکٹروں اور طبیبوں نے ان کا علاج کیا۔ ان میں ڈاکٹر واگھرے، ڈاکٹر بنکٹ چندر، ڈاکٹر انصاری، حکیم مقصود علی خاں، حکیم سدھوری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔[۵۳]

۴ / تیر ۱۳۴۹ف م ۱۹۳۹ء سے بخار میں شدت پیدا ہو گئی اور ۸ / تیر ۱۳۴۹ف م ۱۹۳۹ء روز دوشنبہ (۷۶) سال کی عمر میں انتقال کیا۔ خاندانی رسم و رواج کے مطابق ان کی ارتھی اٹھائی گئی۔ راجہ خواجہ پرشاد نے آگ دی۔ ارتھی کے جلوس میں ہزاروں افراد نے بلا قید مذہب ملت شرکت کی۔ جس کا ذکر اکثر جگہوں پر ملتا ہے۔ مہاراجہ کے انتقال کے بارے میں فرحت اللہ بیگ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

---

[۵۱] جذبات ص ۱۲۹ [۵۲] مہاراجہ کشن پرشاد ص ۲۵۰ [۵۳] مجلہ عثمانیہ مہاراجہ نمبر ص ۱۷ تا ۱۹

"جب ان کا انتقال ہوا تو ہر قوم اور ملت کے لوگ ان کی ارتھی کے ساتھ تھے اور ہر شخص اپنے عقیدے کے موافق ان کے لئے دعائے مغفرت کرتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک پادری صاحب انجیل پڑھتے ہوئے اس مجمع کے ساتھ مرگھٹ تک گئے[1]۔"

سیرت

جس شرافت کی اداؤں پر رہا مشرق کو ناز
اٹھ گئی اب وہ شرافت تجھ سے تھی
زندہ رکھا تھا سخاوت نے خود حاتم کا نام
اور تیرے دور میں زندہ سخاوت تجھ سے تھی
(فانی)

مہاراجہ مشرقی تمدن کا آخری نمونہ تھے۔ شرافت، سخاوت، مروت اور ہمدردی ان پر ختم ہو گئی۔ مہاراجہ کی سیرت کے بارے میں بہت سے اہلِ قلم حضرات نے معتدبہ مواد فراہم کیا ہے۔ نیز خود مہاراجہ کے خطوط اور ان کی دیگر تحریریں بھی ان کی سیرت کی آئینہ دار ہیں۔

اقبال سے ان کے اچھے روابط تھے۔ خط و کتابت کا سلسلہ آخر تک جاری رہا۔ ان کے خطوط سے ان کے خلوص کا اندازہ ہوتا ہے جو ان کی سیرت کا نمایاں وصف تھا۔ اقبال کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"خدا تمہیں دل شاد و سلامت رکھے۔ بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ جس وقت اقبال کا خط دیکھتا ہوں باچھیں کھل جاتی ہیں اور نہایت دل شاداں اور مسرور ہو جاتا ہے۔ اللہ کے واسطے محبت ہے نہ کوئی غرض وچھوی ہے نہ دین سے سوال۔ حالانکہ اس قسم کا ارتباط اور بھی ایک دو سے ہے مگر آپ سے کیوں اس قدر خلوص ہے اس کا علم بھی اس عالم الغیب کو ہے[2]۔"

مہاراجہ حد درجہ منکسر مزاج واقع ہوئے تھے خود کو ہمیشہ دوسروں سے کم سمجھتے تھے۔ نواب عنایت جنگ بہادر کا کہنا ہے کہ کسی مشاعرے میں ایک شاعر نے غزل پڑھی سامی

---

[1] مجلہ عثمانیہ مہاراجہ نمبر ص ۷ [2] شاد اقبال ص ۱۷

زمین میں مہاراجہ کی بھی ایک غزل لوگوں کے اصرار پر پڑھی گئی۔ تمام لوگوں نے مہاراجہ کی غزل کی تعریف کی۔ نواب صاحب نے بھی تعریف کی مہاراجہ نے جھک کر سلام کیا اور نہایت انکساری سے کہا "آپکو میری غزل پسند آئی؟ میں نے تو ایک خاص جذبہ میں لکھی تھی۔ اُس غزل کے مقابلہ میں میری غزل بہتر نہیں ہو سکتی۔"

نواب ماندور خاں نے مہاراجہ کی انکساری سے متعلق ایک واقعہ سنایا کہ مہاراجہ ایک صاحب کو جو سالار جنگ کے ورثاء میں سے تھے ماہانہ تین سو روپیہ دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ روپے بھجوانے میں ذرا دیر ہو گئی تو ان صاحب نے شکایتی خط لکھ بھیجا۔ اس پر مہاراجہ بہت مغموم اور متاثر ہوئے۔ نواب صاحب نے اداسی کی وجہ پوچھی تو سارا واقعہ سنایا اور کہا کہ آج شام تک کسی طرح بھجوا دوں گا۔

مہاراجہ کی سیرت کا سب سے نمایاں اور واضح پہلو ان کی مروت، ہمدردی اور سخاوت ہے۔ سخاوت انھیں مہاراجہ چندو لال سے ورثے میں ملی تھی۔ یہی وہ خصوصیت تھی جس سے مہاراجہ ہر دل عزیز تھے۔ وہ کسی کی تکلیف برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس بارے میں خواجہ حسن نظامی صاحب اپنے ایک مضمون "مہاراجہ بہادر سے ملاقاتیں" میں لکھتے ہیں۔

"ایک دن شام کو بارش ہو رہی تھی اور ان کے ملازم شاعروں میں سے ایک بوڑھے شاعر صاحب مغموم بیٹھے تھے۔ مہاراجہ نے خاموشی کا سبب پوچھا۔ شاعر صاحب کھڑے ہو گئے اور ہاتھ جوڑ کر کہا "خداوند نعمت کو معلوم ہے کہ فدوی نے سولہ برس کی ایک لڑکی سے پرسوں نکاح کیا ہے۔ مکان کھپریل کا ہے اور بارش میں ٹپکتا ہے۔ آج آفت جان بیوی نے میرا کان پکڑ کے کہا اگر اچھا مکان میسر نہ تھا تو مجھ سے شادی کیوں کی تھی۔ گھر میں کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں کپڑے رکھوں۔ بیوی سے کان چھڑا کر میں فوراً یہاں حاضر ہو گیا۔ اب اس غم میں بیٹھا ہوں کہ بارش لگاتار ہو رہی ہے خبر نہیں بیوی پر کیا گزر رہی ہوگی۔" مہاراجہ نے تبسم کیا اور ایک پرچہ لکھ کر پیشی کے کسی شخص کو دے دیا۔ کچھ دیر کے بعد شاعر صاحب سے کہا گیا کہ فلاں مکان ضروری سامان سے آراستہ کرا دیا گیا ہے وہاں اپنی بیوی کو لے جائیے۔ شاعر صاحب کی خوشی کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔"[1]

---

[1] مجلہ عثمانیہ مہاراجہ نمبر ص ۴۲

مہاراجہ حتی الامکان یہ کوشش کرتے کہ حاجت مندوں کی مالی امداد کرتے رہیں۔ بعض لوگوں کو اس قدر پوشیدہ طریقے سے دیتے کہ دوسروں کو اس کی خبر تک نہ ہوتی اور لینے والا بھی یہ خیال نہ کرنے پاتا کہ وہ خیرات لے رہا ہے۔ گھر سے باہر نکلتے تو ساتھ ایک تھیلی ہوتی۔ جس میں ہر قسم کے چھوٹے بڑے سکے ہوتے۔ ایک تجوری میں اشرفیاں اور نوٹ بھی رکھا کرتے۔ راستہ بھر خیرات کا سلسلہ چلتا اور ہر کوئی اس خیرات سے مستفید ہوتا۔

بادشاہ وقت کی اطاعت گزاری' فرماں برداری اور عقیدت کے جذبات ان میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ حضرت غفران مکان کی مدح سرائی میں ہے۔ آخری سانس تک اپنے مالک کے وفادار رہے۔ وہ خود کو بادشاہ کا ایک ادنیٰ غلام تصور کرتے تھے۔

مہاراجہ کے مذہب کے بارے میں لوگ اختلاف رائے رکھتے تھے۔ بعض حضرات علانیہ ان کے مذہب پر اعتراض کرتے لیکن مہاراجہ ان سب کا جواب بڑے ضبط اور تحمل سے دیا کرتے۔ اقبال کے نام ایک خط میں انہوں نے جس پیرائے میں اپنے مذہب اور مسلک کی وضاحت کی ہے اس سے ان کی سلجھی ہوئی طبیعت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں۔

> "ساڑھے گیارہ سال دکن کی وزارت کی اور مختلف اقوام کی خدمت گزاری کو خدا کے واسطے اپنا فریضہ سمجھ کر سب کو ٹھنڈے دل سے لے کر چلا تو اس پر آپ کے لاہور کے اخبارات میں لکھا تھا آصف جاہ کا نمک کھاتے سے کشن پرشاد کا خون سفید ہو گیا ہے اور ایک نے لکھا تھا محمدؐ کی تعریف لکھنے والا ہرگز ہندو نہیں ہو سکتا۔ مگر آج کوئی پوچھنے والا ہے کہ اتنے ہندوؤں نے جو شریک ہو کر میت[1] کی نماز بھی پڑھی اور پانی بھی پیا کس کے نمک کے اثر نے ان کا خون سفید کر دیا تھا"[2]

نواب مہدی نواز جنگ بہادر جو مہاراجہ کے پاس بہ حیثیت معتمد کام کر چکے تھے انہوں نے مہاراجہ کی سیرت پر معتد بہ مواد فراہم کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ مہاراجہ ایک جاذب شخصیت کے مالک تھے۔ ہر کوئی ان سے مل کر خوش ہوتا۔ نواب صاحب اپنے مضمون "مہاراجہ کی سیرت کے بعض پہلو" میں لکھتے ہیں۔

---

[1] غفران مکان نواب میر محبوب علی خاں کی مشایعت جنازہ کی طرف اشارہ ہے۔
[2] شاد اقبال ص ۱۰۰

"ہر شخص ان کی تعریف میں کوئی نئی بات سناتا' کوئی ان کی مزاج پرسی کے طرز سے مسرور ہوتا کوئی ان کے تبسم میں ہمہ گیر محبت کی جھلک دیکھتا تو کوئی ان کی گفتگو میں مستحکم خلوص کی صدا سنتا، کوئی ان کو حاتم کہتا تو کوئی عہد مغلیہ کی آخری یادگار۔"[1]

مہاراجہ ایک عجیب فطرت کے مالک تھے۔ غصہ آتا تو آپے سے باہر ہو جاتے تھے لیکن چند لمحوں بعد ایسے دکھائی دیتے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ اپنے مضمون "یاد رفتگان" میں لکھتے ہیں۔

"جو کوئی بھی مہاراجہ بہادر سے ملا ہے اس کو خیال بھی نہیں ہو سکتا کہ ان کو غصہ آسکتا تھا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ان کو غصہ آتا تھا اور بہت آتا تھا۔ ان کے مرنے سے چند ہی مہینے پہلے میں ان سے ملنے گیا۔ چند اور اصحاب بھی موجود تھے۔ گرمی کچھ زیادہ تھی۔ ایک شاگرد پیشہ نے بجلی کا پنکھا جو عین ان کے سر پر تھا کھول دیا۔ یہ پنکھا تھا خراب۔ کھلتے ہی اس نے ایسی غرغر شروع کی کہ بات کرنا مشکل ہو گیا۔ اب کیا تھا مہاراجہ بہادر کا چہرہ سرخ ہو گیا انہوں نے بڑی زور کی آواز میں کہا یہ پنکھا کس نے کھولا بیچارا شاگرد پیشہ کانپنے لگا یہ دیکھ کر کہ اب بات بڑھنے والی ہے میں نے کہا یہ میری غلطی ہے۔ میں نے اشارہ سے پنکھا کھولنے کو کہا تھا۔ یقین مانئے کہ یہ سن کر وہ اس طرح غصہ پی گئے اور مسکرا دیئے کہ گویا کچھ ہوا ہی نہیں "[2]

مہاراجہ کی سیرت کا ایک نمایاں وصف مذہبی رواداری تھا۔ ہر مذہب کا وہ احترام کرتے جس مقام پر جاتے وہاں کی مختلف عبادت گاہوں پر حاضری دیتے۔ مذہبی رواداری کا ایک دلچسپ نمونہ خود ان کی خانگی زندگی تھی۔ مسلمان محلات سے جتنی اولاد ہوئی ان سب کے نام مسلم ہیں۔ شادی بیاہ اور دیگر رسوم ورواج میں بھی انھیں اپنے مذہبی اصولوں پر عمل کرنے کی اجازت تھی۔ اسی طرح ہندو محلات سے جتنی اولاد ہوئی ان سب کے نام ہندو ہیں اور انھیں اپنے مذہب پر چلنے کے لئے سختی سے تاکید کی جاتی تھی۔

مہاراجہ کی طبیعت میں اتنی خوبیاں جمع ہو گئی تھیں کہ عموماً ایک آدمی میں اتنی خوبیاں

---

[1] مجلہ عثمانیہ مہاراجہ نمبر ص ۵۸ [2] مجلہ عثمانیہ مہاراجہ نمبر ص ۲۲

یکجا کم نظر آتی ہیں۔ وہ بہ یک وقت شاعر بھی تھے ادیب بھی، امیر بھی تھے اور فقیر بھی۔ طبیعت صوفیانہ تھی۔ سیاسی مصروفیتوں کے باوجود مختلف مشاغل کی تکمیل کے لئے وقت نکال لیا کرتے تھے۔

☆

ادبی خدمات

نظم اردو میں نظم نگاری کا میلان ابتداء ہی سے ملتا ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ اس رجحان کو ادبی انقلاب کے بعد تقویت اور مقبولیت نصیب ہوئی ۔ یوں تو اردو شاعری کے ہر دور میں مثنوی کی صنف نظم ہی کے مقاصد کی تکمیل کرتی رہی ہے لیکن ادبی انقلاب کے بعد انگریزی شاعری کے اثر سے اردو میں ایک مخصوص صنف شعری کی حیثیت سے نظم کا جو تصور پیدا ہوا یہ بھی اردو کے لئے کوئی نئی چیز نہیں تھی ۔ دکنی دور میں جہاں ہزاروں اشعار کی طویل مثنویاں کہی جاتی تھیں وہاں مختصر مثنویوں کا بھی بکثرت رواج رہا ہے ۔ یہ مختصر مثنویاں بیس پچیس شعر کی بھی ہوتی تھیں اور ان میں وہی ربط بیان ہوتا تھا جو جدید نظم کی خصوصیت سمجھا جاتا ہے[۱] ۔

محمد قلی قطب شاہ کے کلیات میں زندگی کے مختلف اور متنوع موضوعات پر مستقل نظمیں موجود ہیں ۔ عبداللہ قطب شاہ کے دیوان میں بھی ایسی مربوط اور مسلسل نظمیں ہیں لیکن یہ سب نظمیں صرف حسن و عشق کے موضوع پر ہیں ۔ غالباً اسی وجہ سے مرتب کلیات عبداللہ قطب شاہ ان کو غزلوں سے علیحدہ نہیں کیا ۔ تصوف کے موضوع پر دکنی میں بکثرت مختصر مثنویاں ملتی ہیں ۔ ان کے علاوہ دوسرے متعدد موضوعات پر بھی مختصر مثنویوں یا نظموں کی کمی نہیں ہے جیسے خواجہ بندہ نواز کی مدح میں علی عادل شاہ ثانی کی نظم جس کی ہئیت بھی جدید نظموں کی سی ہے ۔

۱۸۵۷ء کے سیاسی انقلاب نے جہاں ہندستان سے بہت سی نعمتیں چھین لیں وہیں کچھ نعمتیں عطا بھی کیں ۔ اس انقلاب نے ہندوستان کی زندگی کے ہر شعبے میں اس قدر شکست و ریخت کی کہ ہندستان کی سیاست کے ساتھ ہمارا اجتماعی ذہن بھی نئے راستوں پر چل پڑا ۔ ہندوستان کو اس انقلاب کی سب سے بڑی دین ایک نیا ذہن تھا جو نئے سیاسی حالات کے دباؤ سے نئے انداز سے سوچنے لگا تھا ۔ برطانوی اقتدار نے ہندستان میں شاہی اور جاگیرداری کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا اور اس سرمایہ داری

---

[۱] فہرست مخطوطات ادارۂ ادبیات اردو جلد اول تا پنجم مرتبہ ڈاکٹر زور اور کتب خانہ نواب سالار جنگ مرحوم کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست میں ایسی متعدد مختصر مثنویوں کا تذکرہ ہے ۔

کا دور شروع ہوا جس کو یورپ میں صنعتی انقلاب نے جنم دیا تھا۔ اس سرمایہ داری کے ساتھ انگریز قوم کی جمہوری اقدار، مشین، مادیت پرستی، افادیت پسندی کا طرز فکر بھی ہندستانیوں کو ملا۔ اس طرز فکر نے ہندستان کی سیاسی زندگی کے ساتھ ساتھ یہاں کے معاشی، معاشرتی اور مذہبی اداروں پر بھی ایسی کاری ضرب لگائی کہ صدیوں کی روایات مکڑی کے جالوں کی طرح ٹوٹنے لگیں۔ اردو کا ادبی انقلاب بھی اسی نئے ذہن کا ممنون منت ہے۔ اس ادبی انقلاب کے لئے انگریزی ادب نے بھی بڑی رہنمائی کی۔ بالخصوص وہ فن تنقید جو انیسویں صدی میں یورپ میں خاصا ترقی کر چکا تھا۔ اردو کے ادبی ذہن کو راستہ دکھانے میں بہت کارآمد ثابت ہوا۔ اردو شاعری جو صدیوں سے بندھی ٹکی روایات میں جکڑی ہوئی تھی انگریزی شاعری سے استفادہ کرکے آزادی کا سانس لینے لگی۔ وہ ذہین شاعر اور ادیب جو خود بھی برسوں پرانی شاعری کی ڈگر پر چل رہے تھے نیا راستہ ملتے ہی پرانے پٹے ہوئے راستے کو چھوڑ کر نئی راہوں پر چلنے لگے۔ محمد حسین آزاد نے ۱۸۷۲ء میں لاہور میں انجمن پنجاب قائم کرکے اردو میں مستقل موضوعات پر مسلسل اور مربوط نظم لکھنے کی بنیاد ڈالی۔ حالی نے مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر اردو کے ادبی ذہن کو بدلنے میں وہ انقلابی کوشش کی جو آج بھی جدید شعری تصورات کا سرچشمہ سمجھی جاتی ہے۔ ارباب فکر و نظر کی ان مساعی کو دیکھتے دیکھتے قدیم شعری تصورات کے سکے ٹکسال باہر ہو گئے۔ بالخصوص نئی پود قدیم اصناف سخن سے بیزار و متنفر ہو گئی۔ اس طرح اردو میں انگریزی انداز کی نظم نگاری کا شوق عام ہونے لگا۔ قدیم اصناف میں غزل سب سے زیادہ سخت جان ثابت ہوئی۔ یہ صنف سخن آج بھی جب کہ ہمارا ادبی ذہن کہاں سے کہاں پہونچ گیا ہے نہ صرف زندہ ہے بلکہ اس قدر مقبول ہے کہ آج بھی بعض ارباب نقد اس کو اردو شاعری کی آبرو سمجھتے ہیں۔

مہاراجہ کے ذوق شعری کا جھکاؤ کسی خاص صنف سخن کی طرف نہیں رہا۔ بلکہ وہ شروع ہی سے ہر صنف اور ہر ہیئت میں طبع آزمائی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس لئے جہاں انہوں نے غزل، قصیدہ اور مرثیہ جیسی قدیم اصناف میں اپنا کمال دکھانے کی کوشش کی وہیں جدید انداز کی نظمیں بھی کامیابی کے ساتھ کہی ہیں۔ ان کی مختصر مثنویاں بھی درحقیقت مسلسل نظمیں ہی ہیں تاہم ہیئت کی خصوصیت کی وجہ سے مقالہ نگار نے ان مثنویوں پر علٰحدہ تبصرہ کیا ہے اور ان کی جو نظمیں نظم کے جدید تصور کو پورا کرتی ہیں ان کی تعداد مجموعۂ مناجات کو چھوڑ کر چھ سے زیادہ نہیں ہے۔ جن میں ایک نظم مسدس کی ہیئت میں ہے۔ چار نظمیں قافیہ بند ہیں۔ ایک نظم غزل کی ہیئت میں ہے مجموعہ مناجات میں متفرق نظمیں مختلف ہیئتوں میں کہی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ مہاراجہ کی ایک اور نظم نامۂ منظوم کا ذکر ملتا ہے۔ جو مقالہ نگار

کو دستیاب نہ ہو سکی۔

زبان کی سادگی اور بیان کی بے ساختگی مہاراجہ کی شاعری کی وہ خصوصیات ہیں جو ہر صنف سخن میں نظر آتی ہیں۔ یہی خصوصیات ان کی نظموں میں نمایاں ہیں۔ نظموں میں جس ربط بیان کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی ان نظموں میں موجود ہے۔ لیکن ان نظموں کے موضوعات میں کوئی جدت اور تازگی نہیں ملتی۔ وہی موضوعات اور وہی خیالات جو مہاراجہ دوسری اصناف میں الٹ پھیر کر پیش کرتے جاتے ہیں، ان نظموں میں بھی ان ہی پٹے ہوئے مضامین کا اعادہ نظر آتا ہے۔ تاہم اتنا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ مہاراجہ کو نئے طرز کی شاعری پر بھی قدرت تھی۔

مہاراجہ کی اردو نظمیں مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ رین بسیرا۔ ۲۔ مجموعۂ مناجات۔ ۳۔ نظم دو بیہہ۔ ۴۔ نعرۂ مستانہ
۵۔ درسِ محبت۔ ۶۔ جذبۂ قومی

ان اردو نظموں کے علاوہ تین فارسی نظمیں بھی دستیاب ہوئی ہیں۔ ۱۔ آئینہ عقیدت۔ ۲۔ پیمانۂ عقیدت۔ ۳۔ ایمان شاد۔

رین بسیرا مہاراجہ نے یہ نظم صنف مسدس میں لکھی ہے۔ جو $\frac{1}{2}$۴" × $\frac{1}{2}$۳" سائز کے سولہ صفحات پر مشتمل ہے۔ سنہ تصنیف درج نہیں ہے۔ احمدیہ پریس حیدرآباد دکن میں طبع ہوئی۔ نظم سے پہلے پانچ سطروں کا مختصر نوٹ دیباچہ کے نام سے دیا ہے۔ جس میں اس نظم کی وجہ تصنیف بتائی ہے۔ مہاراجہ لکھتے ہیں۔

"حضرت خواجہ حسن نظامی چشتی ہادی طریقت شاد نے ایک مکان دلی میں تعمیر فرمایا ہے۔ جس میں امیر فقیر سب دن بھر کے مسافر اور عاشقان داور بسیرا لیتے ہیں۔ اسی کی صفت میں یہ نظم شادؔ نے لکھی تھی"

ابتدائی اشعار درج ذیل ہیں۔

بھول ہے تو پا ہے بتا　　تو کس نگین کا ہے بوٹا
تیری بیت ہر من ہے رکھتا　　تیری بو سے جگ ہے جہکتا
ہے تھکا ماندہ دن بھر کا
کرے پہنچی رین بسیرا

اس نظم کا بیشتر حصہ خواجگان چشت کی مدح میں ہے۔ بعض جگہوں پر خودی، عرفان، فنا و بقا اور تصوف کے دیگر مسائل پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

خود کو کھویا تجھ کو پایا — تج کو پایا خود کو گنوایا
چھوڑی میں نے سب کی مایا — ہر دم تیرا ہی گن گایا
ہے تھکا ماندہ دن بھر کا
کرے پنچھی رین بسیرا

خواجگان چشت کی مدح میں جو اشعار لکھے ہیں ان کا نمونہ یہ ہے۔

خواجہ عثمان کے ہو پیارے — دلہن کی آنکھوں کے تارے
آیا ہوں میں تیرے دوارے — کر دو پورے اچھا سارے
ہے تھکا ماندہ دن بھر کا
کرے پنچھی رین بسیرا

صوفیائے کرام نے گیتوں، ٹھمریوں اور دوہوں میں خالص ہندی یا برج بھاشا کا استعمال کیا ہے۔ شاید صوفیاء کی اسی لسانی روایت کے اثر سے مہاراجہ نے بھی اس صوفیانہ نظم میں ایسے ٹھیٹ ہندی الفاظ اور صرفی اشکال کا استعمال کیا ہے جو ہندی کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس طرح اردو ہندی کی گنگا جمنی زبان کے استعمال سے صوفیانہ شاعری کی فضاء پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مہاراجہ نے اس مسدس میں جو بحر استعمال کی ہے وہ عموماً صنف مسدس کے لئے برتی نہیں جاتی۔ شاید اسی لئے مسدس میں جس قدر زور اور چستی کی ضرورت ہوتی ہے وہ پیدا نہ ہو سکی۔ صنف مسدس میں ہر بند کے آخری دو مصرعوں میں مضمون کی تکمیل اور بیان کی چستی کا خصوصیت کے ساتھ التزام کیا جاتا ہے۔ مہاراجہ نے مسدس کا سانچہ تو استعمال کیا ہے لیکن اس کے فنی اہتمام پر زیادہ توجہ نہیں دی ہے۔

مجموعۂ مناجات یہ مجموعۂ فارسی اور اردو مناجاتوں پر مشتمل ہے۔ سائز ½۲" × ½۴" صفحات ۵۰ محبوب پریس علاقہ پیشکاری میں طبع ہوا۔ تین فارسی مناجاتوں کے بعد اردو میں ایک حمد ہے جو نو اشعار پر مشتمل ہے۔ ابتدائی دو اشعار درج ذیل ہیں۔

تری ذات ایک ہے یا خدا تیری شان جل جلالہٗ
نہیں تجھ سا کوئی بھی دوسرا تری شان جل جلالہٗ
تو کریم بھی تو رحیم بھی تو عزیز بھی تو معین بھی ہے
ترے نام پہ دل و جاں فدا تیری شان جل جلالہٗ

حمد کے بعد دس مناجاتیں اردو میں ہیں۔ آخر میں خواجہ غریب نواز ہندالولی

سے استدعا کی ہے کہ ان کے مخالفین نے انھیں بدنام کر رکھا ہے۔ اور کوشاں ہیں کہ کسی طرح بادشاہ کو ان سے بدظن کر دیں۔ ان ہی پریشانیوں سے تنگ آکر مہاراجہ نے غریب نواز سے پناہ مانگی ہے اور مخالفین کی تباہی کے لئے بدعا کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

ناکام رہیں اپنے ارادوں میں بد انجام
گھیرے رہیں اعدا کو ہمیشہ غم و آلام
زندہ رہیں ناکام تو مرجائیں وہ ناکام
سر پر چلے ان کے اسد اللہ کی صمصام
خود ان کے لیئے ان کی بدی قہر خدا ہو
جو شاد کا دشمن ہو الہٰی وہ فنا ہو

نظم دو پیسہ نظم دو پیسہ جیبی سائز کے چھ صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت ایک آنہ رکھی گئی ہے۔ ۱۹۲۰ء میں تصنیف ہوئی اور محبوب پریس علاقۂ پیشکاری میں طبع ہوئی۔ پہلے صفحہ پر چار سطری نوٹ بطور دیباچہ لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نظم کو دو پیسہ سے کیا مناسبت ہے۔ دیباچہ درج ذیل ہے۔

"حضرت خواجہ حسن نظامی چشتی دستگیر نے حضرت محبوب الہٰی کے عرس کے موقع پر دو پیسے لنگر سے شاد کو مرحمت فرمائے تھے۔ اس کے شکریہ میں نظم منظوم ہو کر ہدیہ ناظرین کی جاتی ہے۔"

یہ قافیہ بند نظم اکاون اشعار پر مشتمل ہے۔ ابتداء حمد سے ہوتی ہے۔ مہاراجہ کو بزرگان دین اور پیران طریقت سے والہانہ محبت اور عقیدت تھی اور خوش قسمتی سے مہاراجہ پر ان سب کی نظر عنایت بھی تھی۔ جس کا ذکر انہوں نے "جذبات شاد" میں تفصیل سے کیا ہے۔ اس نظم میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح اور حضرت خواجہ حسن نظامی کی مدح سرائی کی ہے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح سے انھیں جو عقیدت تھی اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

میری آنکھوں سے تم خواجہ کو دیکھو — کہ اسرار الہٰی کے ہیں مظہر
ہیں محی الدین جیسے حق کے محبوب — معین الدین بھی ہیں محبوب داور
مرے خواجہ کے بھی محبوب ہیں دو — قمر ہے وہ تو یہ خورشید خاور

مہاراجہ نے حضرت خواجہ حسن نظامی کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور ان کی صحبت سے فیض یاب ہوئے تھے۔ خواجہ صاحب نے انھیں "خمارشاہ" کا خطاب بھی عطا کیا تھا۔ جس پر وہ نازاں تھے۔ ان کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہیں۔

نظامی حضرت خواجہ حسن ہیں | مرے مرشد مرے ہادی و رہبر
ملا میخانہ سے ان کے یہ رتبہ | خماری شاہ ہوں مشہور گھر گھر
بحمد للہ عجب اعجاز بخشا | زہے قسمت زہے میرے مقدر

نظم کے آخری اشعار دعائیہ ہیں۔ اس نظم میں بھی مہاراجہ نے کم و بیش وہی باتیں بیان کی ہیں جو وہ اس نوع کی دوسری نظموں میں عموماً بیان کرتے ہیں۔ البتہ یہ طویل نظم چونکہ قافیہ بند ہے اور مفاعلین مفاعلین فعولن کی مترنم بحر میں کہی گئی ہے اس لئے نظم میں خوش آہنگی پیدا ہو گئی ہے۔

نعرۂ مستانہ یہ قافیہ بند نظم ۱۵۶ اشعار پر مشتمل ہے۔ سائز ۲/۱ ۷" × ۵" سنہ ۱۳۴۰ھ م ۱۹۲۱ء میں مطبع رہبر دکن میں طبع ہوئی۔ نظم کا موضوع دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری ہے مہاراجہ نے نہایت موثر پیرائے میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا ہے کہ کوئی چیز ایک حالت پر نہیں رہ سکتی۔ تغیر اور زوال لازمی ہے خوشی کے ساتھ غم اور کامیابی کے ساتھ ناکامی ہے۔ کسی کو بادشاہت ملی ہے تو کسی کی قسمت میں در در کی ٹھوکریں ہیں۔ کسی کو گنج قارون ملا ہے تو کوئی فاقہ کشی میں زندگی کے دن گزار رہا ہے یہی حال مذاہب کا ہے۔ مسجد اور کلیسا سب ہی آباد ہیں اور ہر مذہب کے لاکھوں پیرو اور عقیدت مند موجود ہیں۔ ہر مذہب اور ہر سماج میں اس قدر زبردست تضاد اور اختلاف ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

زندگی کے مختلف شعبوں میں رونما ہونے تغیرات کے بارے میں اظہار خیال کے بعد مہاراجہ نے بتایا ہے کہ دولت اور عیش و عشرت ایسی چیزیں ہیں جو ہمیشہ کسی ایک کی ملک نہیں ہوتیں چنانچہ مہاراجہ لکھتے ہیں۔

الغرض ہر آن میں اک شان ہے | ہے حقیقی شان شان کردگار
جس کو کل دیکھا تھا ہم نے شادماں | رو رہے ہیں آج وہ زار و قطار
جس کے زیب سر تھا تاج کیقباد | وہ سر بازار اب ڈھوتے ہیں بار
بانٹتے تھے سیم و زر لاکھوں کو جو | ان کو اک حبہ نہیں ملتا ادھار
بخشتے تھے گاؤں جو انعام میں | خانماں برباد ہیں وہ ذی وقار
کہہ رہی ہیں صاف یہ نیرنگیاں | رنگ دنیا کے نہیں ہیں پائدار

مہاراجہ اپنی نظم و نثر میں جگہ جگہ اپنے مسلک توحید کی وضاحت کرتے جاتے ہیں ان کا خیال ہے کہ یہ مسلک مذہبی تعصب و تنگ نظری سے پاک ہوتا ہے۔ اس نظم میں بھی وہ اپنے اس مسلک کی ان لفظوں میں تعریف کرتے ہیں۔

جو موحد ہے وہ ہوگا حق پرست — کفر و ایمان کا نہ ہوگا کچھ بچار
بغض و کج بحثی سے ہوگا وہ نفور — راستی جس شخص کا ہوگا شعار
ہے نظر میں عارف کامل کی ایک — کوئی مسلم ہو کہ ہو زنار دار

دوسری اکثر نظموں کی طرح اس نظم کے آخری اشعار بھی دعائیہ ہیں۔

آرزوئیں پوری کر دل کی مری — تیرے ہوتے کیوں مجھے ہو انتظار
شاد رکھ اولاد کو احفاد کو — عمر دے صحت دے اے پروردگار
میری منھ مانگیں مرادیں دے مجھے — کر دے یارب ہر طرح ذی اقتدار
حاجتیں ہیں تجھ سے میری بے قیاس — نعمتیں ہیں پاس تیرے بے شمار
جو مجھے دینا ہے دے دے بے طلب — شاد کب تک تجھ سے مانگے بار بار

درسِ محبت

"درسِ محبت" مہاراجہ کی فی البدیہہ لکھی ہوئی قافیہ بند نظم ہے جو پچاس اشعار پر مشتمل ہے۔ سائز $7\frac{1}{2}$" × ۵" سنہ تصنیف سنہ ۱۳۵۱ھ مطابق سنہ ۱۹۳۲ء ہے۔ احمدیہ پریس میں طبع ہوئی۔ تمہید میں مہاراجہ نے وضاحت کر دی ہے کہ یہ نظم کس موقع پر لکھی گئی وہ لکھتے ہیں۔

"۱۷ ربیع الاول سنہ ۱۳۵۱ھ کو میرے مہربان غلام محی الدین صاحب کی جو خاندانی سنی المذہب ہیں شیعہ خاندان میں شادی ہوئی۔۔۔۔ اس مبارک و مسعود موقع کے لئے فی البدیہہ یہ نظم لکھی گئی ہے۔

تمہید کے بعد ابتدائی اشعار میں بتایا ہے کہ شیعہ اور سنی دو مختلف المذہب خاندانوں میں رشتہ ہونے سے دو مذاہب کا ملاپ ہوا ہے۔ دولہا اور دولہن کا نام بتا کر مہاراجہ نے ان کی روشن خیالی اور وسیع النظری کی داد دی ہے۔

محی الدین ہے نوشہ کا نام — مسمی غوث اعظم ہیں وہ سنی
مسمی فاطمہ زہرا دلہن ہے — وہ مذہب کی ہے شیعہ نیک بی بی
یہ ہیں روشن خیال اور نیک دونوں — تعصب یہ نہیں رکھتے ذرا بھی
نئی اس روشنی کا یہ اثر ہے — کہ پیدا ہو گئی روشن خیالی

مختلف مذاہب میں آپس میں کشیدگی اور تفریق پائی جاتی ہے۔ سنی اور شیعہ کا جھگڑا ہر زمانے میں رہا ہے۔ مہاراجہ کا خیال ہے کہ سب کا خدا ایک ہی ہے جو سب کو پالنے والا ہے اس لئے وہابی، سنی اور شیعہ کی تفریق بے معنی ہے مہاراجہ لکھتے ہیں۔

خدا معلوم یہ جھگڑا ہے کیسا   یہ ہے اخوان میں تفریق کیسی
خدا تو ایک ہے جو سب کا رب ہے   ہو وہابی کہ شیعہ ہو کہ سنی
دوئی کا رنگ ہو وحدت میں تو یہ   نہیں لازم موحد کی دو رنگی
ہے قرآں ایک کلمہ ایک دین ایک   کسی کو شک نہیں اس میں ذرا بھی
ہے اسلام اک شجر باغ خدا کا   کہ جس کی کی نبی نے آبیاری
اسی اک نخل کی شاخیں یہ سب ہیں   ہو وہابی کہ شیعہ ہو کہ سنی

آخری اشعار میں خدا سے دعا کی ہے کہ جس وسیع المشربی اور روشن خیالی سے شیعہ اور سنی خاندان میں شادی ہوئی ہے اسی طرح وہ دونوں ایک دوسرے کے مذہب کی عزت کرتے ہوئے ہم خیالی اور اتفاق سے زندگی بسر کریں۔

شریک اے شاد ہم بھی ہیں دعا میں   کہ آئے ہیں براتی بن کے ہم بھی
تعصب چھوڑ کر دونوں رہیں خوش   نہ آئے چھاؤں بحث مذہبی کی
مزا تو باہمی الفت کا جب ہے   کہ دونوں میں ہو باہم ہم خیالی
محرم کی کرے دولہا مجالس   دلہن کی ہو نیاز اب گیارھویں کی
شریک زندگی ہے ایک کا ایک   خوشی اِک کی خوشی ہے دوسرے کی
نکالی شاد نے تاریخ دل سے   مبارک اتفاق شیعہ سنی
۵۱ . ۱۳ھ

جذبۂ قومی یہ نظم ۳۷ اشعار پر مشتمل ہے۔ سائز ۷½ × ۵½ صفحات چار۔ بہ اہتمام محمد عبد الحی سنہ ۱۳۴۱ھ م ۱۹۲۲ء اعظم اسٹیم پریس حیدر آباد دکن میں طبع ہوئی۔ یہ نظم قافیہ اور ردیف کی پابندی کے ساتھ کہی گئی ہے۔

اس نظم میں قوم کی پچھلی روایات اور دیگر مذہبی اخلاقی، اور تہذیبی محاسن پر روشنی ڈالتے ہوئے قوم کی موجودہ زبوں حالی پر اظہار افسوس کیا ہے۔ زمانۂ گذشتہ میں قوم کی جو حالت تھی اس کے بارے میں لکھتے ہیں۔

ایک زمانہ ایسا گزرا ہم تھے سب کے پیشواء
راہبر تھے قوم کے اور مقتدائی ہم میں تھی
آج کل غیروں میں جو کچھ ہیں محاسن دوستو
سچ تو یہ ہے ان محاسن کی سمائی ہم میں تھی

فخر کب تھا مسند شاہی پہ ہم کو دوستو
بوریا مسند تھا اپنا وہ گدائی ہم میں تھی
مشکلیں قوموں کی آسان کرنا ادنیٰ کام تھا
بندے تھے مولیٰ کے ہم مشکل کشائی ہم میں تھی
تھا ہمارے قول میں اور فعل میں دائم وقار
یہ سبک وضعی کہاں یہ جگ ہنسائی ہم میں تھی
کب بتوں کو پوجتے تھے۔ سنگدل کہتا تھا کون
ہم خدا کے بندے تھے شانِ خدائی ہم میں تھی
دیکھ کر اے شادؔ اپنی قوم کو کہتا ہوں یہ
وہ بھلائی اب کہاں ہے جو بھلائی ہم میں تھی

پوری نظم میں ماضی اور حال کا تقابل ہے۔ عہدِ قدیم میں قوم کی اعلیٰ صفات کا سلسلہ وار ذکر کیا ہے۔ فکر کی گہرائی تجربہ کی انفرادیت بیان کی بلاغت جیسی کوئی خصوصیت اس نظم میں نہیں ہے۔ تاہم شاعر کے خلوص نے نظم میں یک گونہ اثر پیدا کر دیا ہے۔ قافیہ و ردیف کے التزام کے باوجود بیان کی صفائی اور روانی قائم ہے۔ بحر رمل مثمن کی طوالت کے باوجود بیان میں کہیں تعقید اور جھول نہیں آیا۔

غزل مہاراجہ کو شعر و سخن سے طبعی لگاؤ تھا۔ ان کے نانا مہاراجہ نریندر بہادر کو شعر و شاعری سے دلچسپی نہیں تھی اس لئے ان کے دربار میں شعر و سخن کا غلغلہ نہیں تھا۔ مہاراجہ نے محض اپنے طبعی لگاؤ کی وجہ سے مشق سخن شروع کی اور مختلف اساتذہ سے اصلاح لینی شروع کی۔ رفتہ رفتہ ان کی طبیعت کے جوہر نکھرنے لگے اور وہ ہر صنف سخن میں اپنا کمال دکھانے لگے۔ وہ بڑے پرگو اور زود گو شاعر تھے۔ حضر ہو کہ سفر ان کی طبیعت کو اک ذرا سی تحریک مل جاتی یا کسی کی فرمائش ہوتی تو موقع محل جس صنف سخن کا تقاضا کرتے وہ اس صنف میں بے تکلف اور بے تکان شعر کہنے لگتے۔

غزل ایک ایسی صنف سخن ہے کہ اس کا سر انجام دینا جس قدر آسان ہے اس کے تقاضوں کو پورا کرنا اتنا ہی مشکل ہے۔ اس لئے اردو کے ہر درجہ کے شاعر نے اسی صنف سخن سے مشق سخن شروع کی اور دیکھتے دیکھتے صاحبِ دیوان ہو گیا۔ لیکن ہر صاحبِ دیوان شاعر میرؔ اور غالبؔ اس لئے نہیں بن سکا کہ غزل کے فن، موضوع اور مزاج کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔

مہاراجہ کی طبیعت کی روانی اور بے ساختگی غزل کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی لیکن ان کی طبیعت کی ہمہ گیری نے کسی ایک صنف سخن کو مرکز توجہ بنانے کی اجازت نہیں دی ۔ انہوں نے ہر صنف میں کمال پیدا کرنے کی کوشش کی اس لئے ان کے کلام کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے ہر صنف میں عجلت پسندی' روا روی اور لاابالی پن سے کام لیا ہے ۔ مثنوی ہو کہ مرثیہ' غزل ہو کہ قصیدہ ہر صنف کے مطالعہ سے یہی احساس ہوتا ہے کہ مہاراجہ اگر اپنی آمد کو فکر و تحمل کی لگام دے کر چلتے تو ہر صنف میں زیادہ کامیاب ہو سکتے تھے ۔

تمام اصناف سخن میں غزل جس قدر سادہ ہے اسی قدر پُرکار بھی ہے ۔ جس قدر اہتمام فن کی ضرورت غزل میں ہوتی ہے کسی اور صنف سخن میں نہیں ہوتی ۔ یہی نہیں بلکہ فکر و نظر کے تجربوں کی ندرت اور جذبات و احساسات کے نئے نئے پیچ و خم کی تازگی کی جس قدر ضرورت غزل میں ہوتی ہے شاعری کے کسی اور شعبہ میں نہیں ہوتی ۔ مہاراجہ کچھ تو طبعاً زود گو اور عجلت پسند تھے اور کچھ یہ بھی تھا کہ ان کی گوناگوں مصروفیتیں اور رنگا رنگ دلچسپیاں انھیں اتنی مہلت بھی غالباً نہیں دیتی تھیں کہ ان کے جذبہ و تخیل میں گہرائی اور پہنائی پیدا ہو سکے ۔ اس کے علاوہ غزل کے لئے جس افعی گزیدگی کی ضرورت ہے اس کا مہاراجہ جیسے امراء اور سلاطین کے کلام میں ڈھونڈنا نادانی ہے ۔ جب تک زندگی کانٹوں کا بستر نہیں بن جاتی غزل کی شاخ پھولوں سے نہیں مہکتی ۔ جس شاعر کی زندگی عیش و نشاط اور کامیابی و کامگاری کے تسلسل کے سوا اور کچھ نہ ہو اس کی غزل میں تپش آرزو سے پیدا ہونے والے ہیجان و اضطراب کی تلاش سعی لاحاصل ہے ۔

مہاراجہ کی زندگی میں ۱۳۳۰ھ م ۱۹۱۲ء سے ۱۳۴۵ھ م ۱۹۲۷ء تک یعنی استعفیٰ سے صدارت عظمیٰ پہ مجبوری تک کا زمانہ کسی قدر خلفشار میں گزرا ۔ اس کے علاوہ اولاد کی صغر سنی اور جوانی کی اموات نے مہاراجہ کو بہت کچھ متاثر کیا پھر بھی امارات' وجاہت' دولت اور عیش و عشرت کے اتنے سہارے تھے کہ یہ حوادث بھی انھیں درد و گداز کی وہ آگ نہ دے سکے جس میں تپ کر غزل کا سونا کندن بنتا ہے ۔ ان سب کوتاہیوں کے علاوہ مہاراجہ کی طبیعت کی رنگا رنگی اور تنوع پسندی بھی ان کی غزل کے لئے مصیبت بنی ۔ وہ مختلف زمانوں میں مختلف اساتذہ کے رنگ کا اتباع کرتے رہے ۔ انہوں نے فارسی میں متعدد اساتذہ سے استفادہ کیا اور اردو میں بھی ۔ فارسی میں علامہ شوستری' ضیاء یار جنگ' مولانا عمادی' مسعود علی محوی اور ترکی سے مختلف زمانوں میں اصلاح لیتے رہے ۔ ان اساتذہ میں سے کوئی بھی فارسی کا صاحب طرز شاعر نہیں تھا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی فارسی غزل میں فکر و بیان کی وہ رنگا رنگی پیدا ہو گئی جس سے شاعر کی انفرادیت کا خون ہوتا ہے ۔ اردو میں ابتدائے

مشق میں بنجولال تمکین، عبدالعلی والہ، منظفر الدین معلیٰ سے اصلاح لی۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی بھی صاحب طرز استاد نہیں تھا۔ ان کے بعد مہاراجہ کو داغ جیسا صاحبِ طرز استاد میسر آیا۔ داغ کی چٹپٹی زبان اور ان کے شوخ اور تیکھے انداز کا اردو غزل پر اس قدر اثر پڑا کہ داغ کا ایک علیحدہ دبستان قائم ہوگیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ سر سید اور ان کے رفقاء کی مساعی سے اردو ادب میں انقلاب کا آغاز ہوچکا تھا۔ زندگی کے ساتھ اردو شعر و ادب بھی زندگی اور فن کی نئی قدروں سے روشناس ہوتا جارہا تھا۔ غزل پر اعتراضات کی بوچھاڑ شروع ہو چکی تھی۔ ایسے ناسازگار ماحول میں داغ نے غزل کا ایسا سُریلا نغمہ چھیڑا کہ ساری ادبی دنیا پھر ایک دفعہ اس صنف سخن کی طرف متوجہ ہوگئی۔

مہاراجہ بھی داغ سے قریب ہونے کے بعد ان کے رنگ میں رنگ گئے۔ داغ کا فن صنف غزل کی طرح جس قدر آسان تھا اسی قدر مشکل بھی تھا۔ روزمرہ اور محاورہ کے چٹخارے اور انداز و اسلوب کی شوخی سے داغ کا چربہ اتار لینا بہت آسان تھا۔ لیکن داغ کا لطفِ زبان حسن بیان اور اس سے زیادہ ان کی شخصیت کی رنگینی اور رعنائی کا پیدا کرنا دوسروں کے بس کی بات نہیں تھی۔ اسی وجہ سے ان کے ہزاروں شاگردوں میں سے کوئی بھی داغ نہیں بن سکا۔

مقالہ نگار کو مہاراجہ کشن پرشاد کی غزلیات کے چار مجموعے دستیاب ہوئے ہیں۔
۱۔ باغ شاد ۔ ۲۔ خمکدۂ رحمت (موسوم بہ ہدیۂ شاد) ۔ ۳۔ نغمۂ شاد
۴۔ بیاض شاد

باغ شاد

باغ شاد پہلا مجموعہ ہے جو سنہ ۱۳۰۸ ہ م ۱۸۹۱ء میں مطبع محبوب القلوب حیدرآباد دکن میں طبع ہوا۔ $9\frac{1}{2} \times 6$ سائز کے (۱۵۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ مہاراجہ کی یہ واحد تصنیف ہے جو بہت ہی ناقص کاغذ پر شائع ہوئی ہے۔ طباعت بھی ناقص ہے صفحہ ۸۲ تا ۱۱۰ ، اردو غزلیں ہیں۔ آگے صفحات میں فارسی اور اردو نظمیں رباعیات، مختلف موقعوں پر کہے گئے قطعات، قصیدے اور غم و خوشی کے موقع پر کہے گئے تاریخی قطعات شامل ہیں۔

قصائد میں "قصیدہ در تہنیت میر عثمان علی خاں بہادر شہزادۂ والا تبار ظل سبحانی مدظلہ العالی" بھی شامل ہے۔ اس قصیدہ کے آخری مصرعہ "ہے سال تولد زہے نیک اختر" سے سنہ ولادت ۱۳۰۳ھ نکلا ہے۔

یہ مجموعہ داغ ہی کے رنگ و آہنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس مجموعہ کی بیشتر غزلیں

تو انہوں نے داغؔ ہی کی زمینوں میں کہی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ داغؔ کے رنگین اور نشاط آگین تغزل سے انھیں جذباتی مناسبت تھی۔ وہ اس رنگ کے بہترین شاعر ہو سکتے تھے۔ لیکن ان کی طبیعت کی رواروی نے اس رنگ میں انھیں وہ کامیابی حاصل کرنے نہیں دی جو وہ اپنی موزونیت طبع کے اعتبار سے حاصل کر سکتے تھے۔ اول تو دلی کے روزمرہ اور محاورے سے پوری واقفیت حاصل کرنا ہی ذرا محنت طلب کام تھا اور پھر ان کے برمحل اور بولتے ہوئے استعمال پر قدرت حاصل کرنا اس سے زیادہ مشکل تھا۔ نہ مہاراجہ کو اتنی فرصت تھی نہ اس ایک میدان میں سر کھپانے کا شوق تھا۔ اس لئے داغؔ کے اتباع میں داغؔ کی زبان و اسلوب کی ایک ذرا سی چاشنی پیدا کر لینے پر قانع ہو گئے۔ شادؔ کی داغؔ سے اثر پذیری کا رنگ ملاحظہ ہو۔

مجھ سے اے جان کوئی کام تو لو	میں بجالاتا ہوں سلام تو لو
شادؔ کمتر ہے بندۂ بے دام	مفت آتا ہے یہ غلام تو لو
ساتھ غیروں کے مے کشی ہے مدام	ہاتھ سے میرے کوئی جام تو لو
ہے اطاعت گذار مجھ سا کون	سامنے میرے اس کا نام تو لو
وعدۂ وصل سے مکرتے ہو	سر پہ اللہ کا کلام تو لو
مجھ کو ہونے لگی غشی تو کہا	بوئے گیسوئے مشکِ فام تو لو
اس کی جھوٹی شراب ہے زاہد	تم نہ سمجھو اگر حرام تو لو
زلف کے پیچ سے نہ جائے نکل	واسطے مرغ دل کے دام تو لو
پوچھتے ہو گر حال فرقت شادؔ	ہاتھ سے پہلے دل کو تھام تو لو

اس نمونہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ داغؔ کے رنگ کو اپنانے میں مہاراجہ کو کتنی کامیابی ہوئی ہے۔ داغؔ کی جن زمینوں میں مہاراجہ نے غزلیں کہی ہیں ان غزلوں میں بھی مہاراجہ نے کچھ زیادہ کاوش نہیں کی ہے۔ جو بن پڑا اور جیسے بن پڑا بے تکان لکھ گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے داغؔ کی غزلوں کے مقابلہ میں مہاراجہ کی غزلیں بہت زیادہ بے رنگ معلوم ہونے لگتی ہیں۔ مثلاً داغؔ کی مشہور غزل کی زمین میں مہاراجہ کی غزل سے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

غیر ہو برباد کیوں کیسی کہی	تم رہو آباد کیوں کیسی کہی
ہو عدو ناشاد کیوں کیسی کہی	دوست تیرے شاد کیوں کیسی کہی
شاخ گل پر نغمہ زن ہے عندلیب	دام ہے صیاد کیوں کیسی کہی
خاک پر بسمل ہوں تیغ ناز سے	ذبح کر جلاد کیوں کیسی کہی

اسی انداز سے سترہ اشعار کی غزل کہی ہے جس کا مقطع ہے۔

اس غزل کو اس زمین میں شاد نے داد دو استاد کیوں کیسی کہی

لیکن مہاراجہ کی غزل کا کوئی شعر بھی ایسا نہیں ہے جس پر استاد داغ داد دے سکتے۔ کسی شعر میں انہوں نے ایسی چونکا دینے والی بات نہیں کہی جس سے "کیسی کہی" کی ردیف چمک اٹھتی۔ اسی طرح داغ کی ایک اور مشہور غزل کی زمین میں مہاراجہ نے غزل کہی ہے۔ داغ کا مطلع ہے۔

بھنویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے کہ وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

مہاراجہ کی غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

اشارے غیر سے کرتے ہوئے چتون کے بیٹھے ہیں
تنی ہے تیغ ابرو قتل پر وہ بن کے بیٹھے ہیں
قیامت یوں بپا کی ہے انہوں نے آج محفل میں
میرے پہلو سے اٹھ کر متصل دشمن کے بیٹھے ہیں
کھنچی ہے تیغ ابرو واں ہمارا سر یہاں خم ہے
کھڑے ہیں سامنے ہم جھک کے گروہ تن کے بیٹھے ہیں
کسی کی شامت آئے گی کسی کی جان جائے گی
بنا کر صبح سے زلفوں کو وہ بن ٹھن کے بیٹھے ہیں

نو شعر کی غزل ہے جس کا مقطع ہے:۔

مئے و ساقی و ساغر یار و باغ راحت افزا ہے
فقط ہم شاد صاحب منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

یہ عجیب بات ہے کہ ایسے دور میں جب کہ مہاراجہ داغ جیسے شاعر کی زبان کا اتباع کر رہے تھے ان کے کلام میں زبان کی ایسی دلچسپ غلطیاں ملتی ہیں جو بعد کے کلام میں نظر نہیں آتیں۔ مثلاً۔

غم ہجر میں جو بلائیں سہے تیرے وصل نے دل سے بھلا ہی دیا

ٹھیٹ دکنی بول چال کی زبان استعمال کی ہے۔ پہلے مصرع میں "بلائیں سہیں" ہونا چاہیے تھا۔

دل بر کو ذرا حال دل زار دکھاؤ آیا ہے مسیحا اسے بیمار دکھاؤ

جاندار کے ساتھ علامت مفعول "کو" لانا چاہیے۔ یعنی "بیمار کو دکھاؤ" کہنا چاہیے تھا۔

وہ اغیار پر جو ہر یا (۱) ہو رہا ہے
ہمارے سے اب بدگماں ہو رہا ہے

ضمیر شخصی متکلم جمع "ہم" کی بجائے ضمیر متکلم اضافی کا استعمال غلط ہے۔ دکنی میں ہم کی بجائے "ہمارے" بھی استعمال ہوتا ہے

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس دور میں شاد داغ کا اتباع کرنے کی کوشش تو کر رہے تھے لیکن شاید داغ سے ہر غزل پر باقاعدہ اصلاح نہیں لیا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے اس دور کے کلام میں زبان کی صریح غلطیاں ملتی ہیں۔ ایسی غلطیاں ان کے بعد کے کلام میں شاذ و نادر نظر آتی ہیں۔

خمکدۂ رحمت

شاد کے کلام کا یہ دوسرا مجموعہ ہے سنہ ۱۳۲۶ھ م ۱۹۰۸ء میں محبوب پریس حیدرآباد دکن میں طبع ہوا۔ یہ مجموعہ ½۹ × ½۶ سائز کے ۲۰۴ صفحات پر مشتمل ہے "خمکدۂ رحمت" تاریخی نام ہے۔ "ہدیہ شاد" سے موسوم ۱۷
کیا گیا ہے۔ ہدیۂ شاد آرٹ پیپر پہ نہایت اہتمام سے طبع ہوا ہے۔ یہ شاد کا نعتیہ دیوان ہے ۲۶
جو ردیف وار مرتب کیا گیا ہے۔ ہر غزل کے ساتھ تاریخ اور سنہ کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ اور ہر ردیف میں غزلوں کی ترتیب سنہ کی وضاحت کے ساتھ دی گئی ہے غزلوں کی تعداد ۱۰۲ ہے غزلیات کے بعد قدسی کی فارسی غزل پر چار اردو تضمینیں ہیں۔ ان چار تضمینوں کے بعد خسرو کی غزل پر ایک تضمین ہے۔ اس کے بعد ایک نعتیہ قصیدہ، تین سلام اور ایک نعتیہ غزل ہے۔ آخر میں میر مونس لکھنوی اور میر انیس کے سلاموں پر تضمینیں ہیں۔

مجموعہ کے اختتام پر امیر مینائی کی تقریظ اور قطعات ہیں۔ اس کے بعد عبدالجبار خان آصفی، ترک علی شاہ ترکی، جلیل، رسا اور ظہیر دہلوی کے قطعات تاریخی ہیں

مہاراجہ کی نعتیہ شاعری ایک خوش عقیدہ مسلمان کی نعتیہ شاعری معلوم ہوتی ہے جس کو اپنے رسول سے والہانہ محبت ہو۔ مہاراجہ نے حضور نبی کریمؐ کی اعلیٰ شخصیت کے کم و بیش انھیں نقوش کو پیش کیا ہے جو نعت گو شعراء روایتاً پیش کرتے آئے ہیں۔ عام غزل کے روایتی موضوعات کی طرح نعت کے بھی موضوعات و مضامین کی ایک روایت قائم ہو گئی ہے۔ جیسے رسولؐ سے اپنی والہانہ محبت کا اظہار، مدینے جانے کا شوق، گنبد خضرا پر فدا ہونے کی آرزو، اپنے وطن سے بیزاری، حضور کے خط و خال کے حسن کی تعریف، دیدارِ رسول کی آرزو، حضور کی شفاعت کا یقین، دامنِ رسول سے وابستگی پر فخر، حضور کی کریمی اور اپنی امت سے محبت جیسے مضامین جو ہر نعت گو شاعر کے پاس ملتے ہیں۔ مہاراجہ کے نعتیہ کلام میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ان مضامین کے تعلق سے جن آیات و روایات کی تلمیحات نعتیہ شاعری میں عام طور پر ملتی ہیں وہ تلمیحات مہاراجہ کی نعتیہ شاعری میں پائی جاتی ہیں۔ ان کے نعتیہ کلام کے مطالعہ سے

اندازہ ہوتا ہے کہ مہاراجہ نے مذہب اسلام کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ شارع اسلام کی سیرت و شخصیت کا بھی خاصا مطالعہ کیا تھا۔ وہ مذہبًا مسلمان نہیں تھے لیکن نعتیہ شاعری میں ان کے جذبات میں خلوص اور دلبستگی کا احساس ہوتا ہے۔ ممکن ہے یہ دلبستگی رسول کریمؐ کی سیرت و شخصیت کے گہرے مطالعہ سے پیدا ہوئی ہو۔

اس مجموعہ کی زبان اور اسلوب میں سادگی، سنجیدگی اور وقار ملتا ہے ممکن ہے یہ موضوع کے تقدس کا اثر ہو۔ زبان و اسلوب کی سادگی اور شگفتگی، جذبات و احساسات کی شائستگی خلوص احساس کی گرمی اور ان تمام خصوصیات کے امتزاج سے نعتیہ شاعری کا جو ستھرا مزاج پیدا ہوا ہے نعتیہ شاعری کے میدان میں مہاراجہ کو ممتاز کرتا ہے۔

نغمۂ شاد شاد کے کلام کا تیسرا مجموعہ "نغمۂ شاد" ۱۹۲۵ء میں محبوب پریس علاقہ پیشکاری حیدرآباد دکن میں طبع ہوا۔ ½۸" × ½۵ سائز کے ۱۸۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ مہاراجہ کے ہندی کلام کا مجموعہ ہے جس میں ٹھمریاں، چوپائیاں اور بھجن دھنوں کی وضاحت کے ساتھ کہے گئے ہیں۔ برج بھاشا کی کچھ غزلیں بھی ہیں اور انکے ساتھ بھی دھنوں کی وضاحت کردی گئی ہے۔ اس مجموعہ کے آخر میں اٹھارہ اردو غزلیں ہیں۔ اس کے بعد فارسی میں ایک قصیدہ، ایک مثنوی اور ۳۵ غزلیں ہیں۔ فارسی اور اردو کا یہ پورا کلام حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی عقیدت کے جذبات سے مملو ہے۔

بیاض شاد بیاض شاد سنہ ۱۹۲۵ء میں نظامی پریس بدایوں میں طبع ہوا۔ اس مجموعہ میں کچھ فارسی کلام بھی شامل ہے یہ مجموعہ ½۸" × ½۵" سائز کے ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں ۱۴۵ اردو غزلیں اور ۳۸ فارسی غزلیں ہیں "بیاض شاد" کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ہر غزل کے ساتھ تاریخ، سنہ، دن اور مقام کی وضاحت کی گئی ہے اور جو غزلیں کسی مشاعرے کی طرح پر کہی گئی ہیں اس کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ دو غزلوں کے بارے میں وضاحت کی گئی ہے کہ یہ غزلیں اعلیٰ حضرت کے دیئے ہوئے فی البدیہہ مصرعوں پر کہی گئی ہیں یہ مجموعہ ردیف وار مرتب کیا گیا ہے۔

بیاض شاد میں مہاراجہ کے تغزل کا بہترین نمونہ ملتا ہے۔ ان غزلوں میں مہاراجہ نے بڑی شستہ و رفتہ زبان استعمال کی ہے۔ طرز فکر اور طرز بیان اس ادبی انقلاب کی عکاسی کر رہا ہے جس نے زبان اور شاعری کو دلبستانوں کی اجارہ داری سے آزاد کر دیا تھا۔ دھیرے دھیرے ادبی زبان کا وہ مزاج پیدا ہو رہا تھا جس کا نقش اول ہم کو شبلی اور حالی کی تحریکوں میں نظر آتا ہے۔

بیاض شاد اور اس کے بعد کی غزلوں میں مہاراجہ کی زبان اور اسلوب ہی نہیں بدلے بلکہ ان میں نہ وہ بے جا شوخی ہے جو داغ کا خاصہ ہے نہ وہ سوقیانہ پن ہے جو شعراء لکھنو کے یہاں عام ہے ان غزلوں میں مہاراجہ کا عشقیہ مزاج شعرائے دہلی کے دور متوسطین سے کسی قدر ملتا جلتا ہے۔ اگرچہ ان میں وہ گہری داخلیت نہیں آسکی ہے جو میر، درد اور یقین کے یہاں ملتی ہے۔ اس دور میں مہاراجہ کا صوفیانہ رنگ بہت تیز ہوگیا ہے۔ اگرچہ وہ ابتداء ہی سے اپنی نظم و نثر میں تصوف کی باتیں کرنے صوفیاء سے اپنی عقیدت جتلانے اپنے مسلک تصوف کا موقع بے موقع اظہار کرنے کے عادی رہے ہیں اس کے باوجود "باغ شاد" کے دور میں بھی تصوف ان کی فکر سخن پر اس قدر چھایا ہوا نہیں تھا جس قدر کہ اس دور میں نظر آتا ہے۔

مہاراجہ کی صوفیانہ شاعری کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اصطلاحی تصوف کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے اور صوفیائے کرام کی تعلیمات اور ان کے فیوض و برکات اور مختلف سلاسل تصوف کے اختلافات و امتیازات سے کماحقہ، واقفیت رکھتے ہیں۔ بلکہ جیسا کہ خود مہاراجہ نے اپنی بعض تحریروں میں ذکر کیا ہے وہ مختلف سلسلوں کے اوراد و مشاغل کے پابند بھی رہے ہیں۔ اس لئے ان کی صوفیانہ شاعری فلسفہ، تصوف کی تفصیلات تلمیحات، اصطلاحات اور معتقدات کے ذکر سے مالا مال ہے۔ یہ تو نہیں معلوم کہ مہاراجہ خود سلوک میں کتنی دور چلے ان کا حال کیا تھا کس مقام کے آدمی تھے مگر اتنا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ تصوف سے انھیں گہری دلچسپی تھی۔ فارسی شاعری اور اردو شاعری میں تصوف بھی شاعری کی روایات اور موضوعات میں اس طرح شامل ہوگیا تھا کہ کم و بیش ہر شاعر جس کو تصوف سے دور کا لگاؤ بھی نہ ہو وہ بھی تصوف کی دو چار باتیں کہہ دینا ضروری سمجھتا تھا۔

فارسی اور اردو غزل میں جس قدر بھی تصوف گیا ہے اس کا تجزیہ کیا جائے تو چند ہی بندھے ہوئے مضامین کی تکرار ملتی ہے۔ سراج اورنگ آبادی، میر درد اور اصغر گونڈوی جیسے شعراء جو عام طور پر صاحب حال صوفی سمجھے جاتے ہیں ان کے کلام میں بھی روحانی تجربات کی انفرادیت اور تازگی کم ہی نظر آتی ہے وہی عامۃ الورود مضامین جو ہر صوفی اور غیر صوفی شاعر باندھتا آیا ہے ان شعراء کے یہاں بھی بکثرت ملتے ہیں۔

مہاراجہ کی صوفیانہ شاعری میں بھی ان ہی مضامین کی الٹ پھیر ملتی ہے بعض صوفی شعراء کے یہاں کم از کم اسلوب بیان کی جو جدت ملتی ہے مہاراجہ کے یہاں یہ جدت بھی قریب قریب مفقود ہے۔ تاہم ان کی صوفیانہ شاعری کے تیور سے اس قدر اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ انھیں اس فلسفہ سے قلبی لگاؤ تھا۔

ہندوستان کی ایک بڑی ریاست کے وزیراعظم کی حیثیت سے سیاست سے ان کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ اس لیئے ان کی غزل سیاسی افکار سے بالکلیہ عاری نہیں رہ سکتی تھی خصوصاً ایسی صورت میں کہ ادبی انقلاب نے غزل کا راستہ زندگی کے ہر موضوع کے لئے کھول دیا تھا اور حالی کے اثر سے چکبست، حسرت، اور ظفر علی خاں جیسے شعراء نے غزل میں سیاسی مضامین باندھنے کی روایت قائم کر دی تھی۔ اس روایت سے مہاراجہ نے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ کہیں کہیں جنگ عظیم کی ہولناکی کا ذکر بھی کرتے ہیں۔

ان چار مجموعوں کے علاوہ مہاراجہ کا بہت سا کلام مختلف رسالوں میں بکھرا ہوا ہے جن میں سے مندرجہ ذیل رسائل مقالہ نگار کو دستیاب ہوئے ہیں۔

محبوب الکلام، حیات سخن، گلدستۂ جشن آصفیہ، گلدستۂ دلفگار، گلدستۂ فیض مشاعرہ، بزم رنداں، بزم شاد، لسان الملک، کشکول، شور عاشقاں، نظام المشائخ، گلزار سخن، گلدستۂ دارالسلطنت وغیرہ۔

ان رسائل کے علاوہ یقیناً اور رسائل بھی ہوں گے جن میں مہاراجہ کا کلام شائع ہوا اور جو ہماری تحقیق و تجسس کی گرفت میں نہ آسکے۔

قصیدہ

دکن میں قصیدہ گوئی کا آغاز اس وقت ہوا جب کہ اردو شاعری صوفیائے کرام کی سرپرستی میں ترقی کر کے اس قدر مقبول ہو چلی تھی کہ قطب شاہی اور عادل شاہی سلاطین بھی اس کی ترقی سے دلچسپی لینے لگے تھے۔ محمد قلی قطب شاہ اردو کا وہ پہلا صاحب دیوان شاعر ہے جس نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس نے نعت اور منقبت میں متعدد قصیدے قلم بند کئے ہیں۔ ان قصائد کی زبان کے نامانوس ہو جانے کے باوصف اس کے جوش بیان اور خلوص اظہار کا اندازہ ہوتا ہے۔ نعت اور منقبت کے علاوہ اس نے اپنے بعض محلات اور باغات کی تعریف میں بھی قصیدے لکھے ہیں۔

عبداللہ قطب شاہ غزل کا بہترین شاعر ہے لیکن اس نے قصیدہ نگاری کی طرف توجہ نہیں کی۔ وجہی اور غواصی قطب شاہی دربار کے بلند پایہ شاعر تھے۔ وجہی کے علحدہ اور مستقل قصائد نہیں ملتے البتہ اس نے اپنی مثنوی "قطب مشتری" (۱۰۱۸) ہجری میں حمد و نعت کے بعد ابراہیم قطب شاہ کی تعریف میں اشعر کہے ہیں۔ اسی طرح غواصی نے بھی اپنی مثنوی "طوطی نامہ" ۱۰۴۹ ہجری میں عبداللہ قطب شاہ کی مدح کی ہے۔ ابن نشاطی بھی عبداللہ قطب شاہ کا درباری شاعر تھا۔ اس نے بھی اپنی مثنوی "پھول بن" ۱۰۲۶ میں سلطان وقت کی مدح کی ہے۔ فائز ابوالحسن تاناشاہ کے عہد کا شاعر تھا۔ اس نے

۱۰۹۴ سنہ ہجری میں ایک مثنوی "رضوان شاہ و روح افزاو" تصنیف کی۔ اس نے بھی اپنی مثنوی میں تاناشاہ کی مدح کی ہے۔

سلاطین عادل شاہی نے بھی سلاطین قطب شاہی کی طرح اردو شاعری کی جی کھول کر سرپرستی کی۔ سلاطین عادل شاہیہ میں علی عادل ثانی المتخلص بہ شاہی ۱۰۶۷-۱۰۸۳ ہجری بڑا قادر الکلام شاعر تھا۔ اس کا کلیات شایع ہوچکا ہے[1]۔ اس نے نعت و منقبت میں بڑے پرزور قصیدے کہے ہیں۔ محمدؐ قلی کی طرح شاہی نے بھی اپنے علی داد محل کی تعریف میں نہایت پرلطف قصیدہ لکھا ہے۔ نصرتی علی عادل شاہ ثانی کے دربار کا قادر الکلام شاعر تھا۔ علی عادل شاہ ثانی نے اس کو ملک الشعراء کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔ اس کی مثنوی "علی نامہ" اردو کی بہترین رزمیہ مثنوی ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ علی نامہ کے بعد اردو میں پھر کوئی ایسی رزمیہ مثنوی نہیں لکھی گئی۔ نصرتی نے علی نامہ میں متعدد قصائد بھی لکھے ہیں۔ زبان کے نامانوس ہونے کے باوجود زور بیان کا یہ عالم ہے کہ بعض قصائد اس نے کئی کئی سو شعر کے لکھے ہیں۔ زبان و بیان کی بلند آہنگی سے اس نے قصائد میں شان و شوکت پیدا کی ہے وہ نئی نئی تشبیہات و استعارات استعمال کرتا جاتا ہے۔ ضائع بدایع اس کی زبان کی روانی میں بہتے چلے جاتے ہیں۔ نصرتی کے قصائد کی ایک اور خصوصیت ایسی ہے جس میں نہ کوئی اور دکنی شاعر اس کا شریک ہے اور نہ بعد کو قصیدے کی تاریخ میں کسی اور شاعر نے اس خصوصیت کو پیش کیا ہے۔ نصرتی قصیدے کے طمطراق کو برقرار رکھتے ہوئے تاریخی واقعات کو بیان کرتا جاتا ہے اور پوری صداقت کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ قصیدے میں تاریخی حقایق کی پیش کشی کے باوجود قصیدہ کی آب و تاب کو برقرار رکھنا صرف نصرتی کا حصہ ہے۔

شمالی ہند میں شعراء کی ساری توجہ غزل پر مرکوز رہی۔ مثنوی کی طرف بھی کم توجہ کی گئی۔ سودا پہلے شاعر ہیں جنھوں نے قصیدے کی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ کی اور شاعری میں اس صنف سخن کو اس قدر بلند کیا کہ اردو قصیدہ انوری خاقانی اور عرفی کے قصیدوں سے ٹکر کھانے لگا۔ سودا نے اردو قصیدے میں فارسی قصیدے کے فکر و فن کی تمام روایات کو برتنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہ بعض قصائد کی زمینیں بھی انہوں نے فارسی کے اساتذہ سخن کے قصائد سے لی ہیں۔ درحقیقت فن کے اعتبار سے اردو کو مکمل قصیدہ سودا

---

[1] کلیات شاہی مرتبہ ڈاکٹر زینت ساجدہ

سے ملا ہے۔ قصیدہ کے مقررہ ابواب جیسے تشبیب، گریز، مدح اور دعا میں سے ہر باب میں سودا نے اپنا کمال دکھانے کی کوشش کی ہے یہ اور بات ہے کہ سودا نے اردو قصیدہ کو فارسی قصیدہ کا نقش ثانی تو بنا دیا لیکن نصرتی کی طرح قصیدہ کی فضاء کو ہندوستانی نہ بنا سکے۔

سودا کے بعد انشاؔ اور مصحفی نے قصائد لکھے لیکن ثقیل الفاظ، بعید تلمیحات اور سنگلاخ زمینوں سے قصیدہ کو بوجھل کر دیا سعادت یار خاں رنگین نے بھی اس صنف سخن میں زور طبع دکھانے کی کوشش کی۔ سودا کے بعد ذوق نے قصیدہ گوئی میں شہرت حاصل کی۔ ذوق نے قصائد میں مختلف علوم کی اصطلاحات، آیات، روایات اور روزمرہ اور محاورہ کو برت کر قصیدہ میں تھوڑی بہت انفرادیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ غالب نے بھی دو قصیدے لکھے ہیں۔ مگر اس صنف میں بھی ان کی جدت طراز طبیعت نے اپنا ایک علحدہ راستہ نکال لیا۔ قصیدہ نگار کی حیثیت سے غالب کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی لیکن سچ پوچھئے تو قصیدہ کو نیا آہنگ غالب ہی نے دیا ہے۔ اور غالب ہی نے اس صنف سخن کو پہلی مرتبہ زندگی سے قریب کرنے کی کوشش کی ہے۔ شمالی ہند میں دلی اور لکھنو کے درباروں کے خاتمہ پر قصیدہ گوئی کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

دکن میں سلاطین آصفی اور امرائے آصفی کے درباروں میں قصیدہ گوئی اور قصیدوں پر جاگیر، منصب اور انعام و اکرام کی روایات خانوادۂ آصفی کے آخری فرماں روا نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کے عہد تک قائم رہی۔ اگرچہ یہاں سودا یا ذوق جیسا کوئی باکمال قصیدہ نگار نہیں پیدا ہوا۔ پھر بھی سلاطین و امرائے آصفی کی مدح میں جتنے قصائد کہے گئے ہیں شاید تعداد کے اعتبار سے دربار لکھنو اور دلی میں بھی نہیں کہے گئے ہوں گے۔ اور قصائد کے اس وافر ذخیرے میں بہترین قصائد کی بھی کمی نہیں ہے۔ سلاطین آصفی کے علاوہ جن امراء و اعیان سلطنت کی مدح میں کثرت سے قصیدے کہے ہیں ان میں ارسطو جاہ، چندو لال شاداں، میر عالم، شمس الامراء ثانی، شمس الامراء ثالث اور مہاراجہ سرکشن پرشاد قابل ذکر ہیں۔ صرف ارسطو جاہ کی مدح میں کہے گئے قصائد کے دو ضخیم مجموعے مرتب ہوئے ہیں۔ جن امرائے آصفی کی مدح میں کثرت سے قصیدے کہے گئے ہیں ان میں مہاراجہ سرکشن پرشاد کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ خود انہوں نے بھی بکثرت قصیدے لکھے ہیں۔ مہاراجہ نواب میر محبوب علی خاں کے عہد میں پیشکاری اور وزارت کے اعلیٰ عہدوں پر مامور تھے اور نواب میر عثمان علی خاں کے عہد میں عہدۂ

پیشکاری کے علاوہ مدار المہام اور صدر اعظم باب حکومت بھی رہے تھے۔ ان دونوں سلاطین اور دونوں کے شہزادوں کی مدح میں مہاراجہ نے کئی قصائد لکھے ہیں۔ شہزادوں کی ولادت، سالگرہ تسمیہ خوانی، سے واپسی، صحت یابی جیسے مختلف خوشی کے مواقع پر مہاراجہ نے اس کثرت سے قصائد لکھے ہیں کہ ان تمام قصائد کو مرتب کیا جائے تو یہ ذخیرہ سیکڑوں صفحات پر مشتمل ہوگا۔ لیکن افسوس ہے کہ مہاراجہ کے بیشتر قصائد ان کی کسی تصنیف یا کسی رسالے میں شائع نہ ہونے کی وجہ سے ضایع ہو گئے۔ جو قصائد حیدرآباد اور بیرون حیدرآباد کے مختلف رسائل میں شایع ہوئے ہیں ان تمام رسائل کا فراہم کرنا محال نہیں تو انتہائی دشوار کام ضرور ہے۔

مہاراجہ کی جن تصانیف میں ان کے قصائد شامل ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

تصنیف	قصیدہ	تعداد اشعار
۱۔ باغ شاد	قصیدہ در تہنیت میر عثمان علی خاں بہادر شہزادہ والا تبار ظل سبحانی مدظلہ	۳۰
۲۔ گلبن تاریخ	قصیدہ در مدح اعلیٰ حضرت غفران مکان	۵۸
۳۔ گلبن تاریخ	شہزادہ بلند اقبال کی ولادت کے موقع پر لکھا گیا۔	۳۰
۴۔ گلبن تاریخ	شہزادہ بلند اقبال کی ولادت کے موقع پر لکھا گیا۔	۲۳
۵۔ ارمغان زیبا	شہزادہ بلند اقبال میر غلام عبدالقادر علی خاں کی ولادت کے موقع پر لکھا گیا۔	۹
۶۔ ارمغان زیبا	شہزادہ بلند اقبال میر غلام عبدالقادر علی خاں کی ولادت کے موقع پر لکھا گیا۔	۱۷
۷۔ نسیم سحر	اعلیٰ حضرت غفران مکان کی سالگرہ کے موقع پر لکھا گیا۔	۱۹
۸۔ نسیم سحر	اعلیٰ حضرت غفران مکان کی سالگرہ کے موقع پر لکھا گیا۔	۱۷
۹۔ خمکدۂ رحمت	نعتیہ قصیدہ	۳۳
۱۰۔ سیر و سفر	جلسہ میلاد کے موقع پر لکھا گیا۔	۳۰

۱۱۔ آئینہ عقیدت　　در مدح اعلیٰ حضرت قدر قدرت فلک شوکت ظل سبحانی
حضور پر نور بندگان عالی متعالی سرتاج دکن مدظلہ　　۵۳

جن اخبارات میں مہاراجہ کے قصائد دستیاب ہوئے ان کے نام درج ذیل ہیں۔

نام اخبار	قصیدہ	تعداد اشعار
۱۔ سالنامہ رہبر دکن	قصیدہ در مدح اعلیٰ حضرت قدر قدرت فلک شوکت ظل سبحانی حضور پر نور بندگان عالی سرتاج دکن مدظلہ العالی	۵۱
۲۔ رہبر دکن سالگرہ نمبر ۱۳۵۳ ہجری	اعلیٰ حضرت کی مدح میں لکھا گیا۔	۱۹
۳۔ روزنامہ صبح دکن سالگرہ نمبر ۱۳۵۱ ہجری	اعلیٰ حضرت کی مدح میں لکھا گیا	۴۵

ایک آدھ کے سواء مہاراجہ کی سبھی تصانیف مقالہ نگار کو دستیاب ہوئی ہیں اسلئے جو قصائد ان کی تصانیف میں آگئے ہیں ان کی تعداد پیش کی جاچکی ہے۔ لیکن رسائل میں جو قصائد شایع ہوئے ہیں ان کا حال یہ ہے کہ مندرجہ بالا رسائل میں سے ہر رسالہ کے ایک سے زیادہ شماروں میں مختلف اوقات میں ان کے قصائد شایع ہوتے رہے ہوں گے جو ہماری دسترس سے باہر ہیں۔ نیز جن رسائل کا ذکر کیا گیا ہے ان کے سواء حیدرآباد اور بیرون حیدرآباد کے متعدد رسائل ہوں گے جن میں مہاراجہ کے قصائد شایع ہوئے ہوں گے جن تک ہماری رسائی نہیں ہوسکی ہے

نظم ہو کہ نثر مہاراجہ قلم برداشتہ لکھنے کے عادی تھے۔ اس لئے ان کی نظم ونثر میں سادگی، صفائی، روانی اور بے ساختگی کی خصوصیات پائی جاتی ہے ان خصوصیات کا ذکر ان کی نظم ونثر کی ہر صنف پر تبصرہ کرتے ہوئے خصوصیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ان خصوصیات کا قصیدہ میں نباہ بڑا مشکل کام تھا۔ لیکن انہوں نے اپنے طویل قصیدوں میں بھی ان خصوصیات کو برقرار رکھا ہے۔ اس لیئے وہ قصیدہ بھی طبیعت پر بار ڈال کر نہیں کہتے۔ جو بھی خیالات ان کے دماغ میں ہوتے ہیں اور جو کچھ جذبات ان کے دل میں موجزن ہوتے ہیں وہ ان کو نہ فلسفہ بناتے ہیں نہ ان کے بیان میں جھوٹا تکلف اختیار کرتے ہیں۔ دل کی بات جس طرح زبان پر

آتی ہے اسی انداز سے بیان کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی تشبیب کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

نسیم سحر ہے آج اس طرح کی جان پرور
کہ ہر جگہ متحرک ہے سایۂ دیوار
فلک سے زہرہ رنگین ادا اتر آئے
بجائے گائے سنائے وہ شاد کے اشعار
ہوائے سرد کے جھونکوں کا لطف حاصل ہے
دکھا رہا ہے برس کر بہار ابر بہار
معاف شرع کی تکلیف ہے طریقت میں
عبث ہے زاہد صوفی کا جام سے انکار

گریز ملاحظہ ہو۔

یہ دل میں آیا کروں پیش تہنیت نامہ
لکھوں خلوص ارادت سے میں بھی چند اشعار
سلیقہ گرچہ نہیں شعر کا نہ دعویٰ ہے
کہ شاعری نہ مرا کام ہے نہ میرا اشعار
میں ایک فرد ہوں سیف و قلم کے دفتر کا
ہے میری قوم کو بازیچہ عرصۂ پیکار

اس کے بعد مہاراجہ اپنی عادت کے مطابق اپنے آبائی شرف پر فخر کرتے ہیں۔ اپنے حسب و نسب پر فخر کرنے کے بعد سلاطین آصفی نے انھیں جن مراتب و اعزازات سے نوازا ہے اس کا یکے بعد دیگرے تفصیلی ذکر کرتے جاتے ہیں۔ اس کے بعد مدح کی طرف آتے ہیں۔ مدح کے حصے میں البتہ قصیدے کی روایت کو برتتے ہوئے فارسی تراکیب استعمال کرتے جاتے ہیں

مطیع آل محمد مطاع موجودات — جہاں پناہ فلک پایگاہ عرش وقار
غریب پرور و مسکین نواز و محسن خلق — ہنر در تصفت دستگاہ و علم شعار
بلند اختر و خورشید قدر و فرح بخت — قباد وقت و سکندر خصال و جم کردار

ان اشعار میں فارسی تراکیب کا طنطنہ ملاحظہ ہو۔ مہاراجہ اس اسلوب میں بھی اپنی قدرت بیان کا ثبوت دیتے ہیں۔ لیکن یہ اسلوب ان کے مزاج سے میل نہیں کھاتا۔ اس لئے چند ہی اشعار کے بعد وہ اپنے رنگ پر آجاتے ہیں۔ چنانچہ مندرجہ بالا اشعار کے بعد چار اشعار میں فارسی تراکیب کا زور آہستہ آہستہ کم ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے اصلی

رنگ پر آجاتے ہیں۔

جو دیکھو عقل کی رو سے تو پیر صد سالہ ۔۔۔ جو پوچھو عمر تو دو کم پچاس کا ہے شمار
تمام ملک دکن انکے اختیار میں ہے ۔۔۔ دھنی قلم کے تو فوجوں کے ہیں سپہ سالار

اسی انداز سے مزید نو شعر لکھ کر اس شعر پر قصیدہ کو ختم کیا ہے۔

یہ مجھ سے شاد رہیں اور خدا ہو ان سے شاد ۔۔۔ بہ حق احمد مختار و حیدر کرار

مہاراجہ کے قصائد میں نہ سودا کی سی نزاکت تخیل ہے نہ ذوق کا سا شکوہ لفظی۔ لیکن سلاطین آصفی کے ساتھ اپنی وفاداری اور جان نثاری کے جذبات کو جس خلوص اور سادگی کے ساتھ بیان کرتے جاتے ہیں اس سے ان کے قصائد میں زندگی کی حرارت اور حسن کا احساس ہوتا ہے یہ وہ وصف ہے جو قصائد میں کم یاب ہے۔

مثنوی

مثنوی ہیئت کی سہولت اور موضوعات کے تنوع اور وسعت کی وجہ سے جس طرح فارسی شاعری میں مقبول و مروج رہی اسی طرح سلطنت بہمنیہ اور اس کی جانشین سلطنتوں میں بھی شاہانہ سرپرستی اور امن و امان کی فضاء کی وجہ سے متعدد طویل مثنویاں لکھی گئیں۔ جیسے نظامی بیدری کی "کدم راؤ پدم راؤ" رستمی کا "خاور نامہ" اشرف کی "نوسرہار" قدرتی کی مثنوی "قصص الانبیاء" ہاشمی کی "یوسف زلیخا" جیسی بیسیوں طویل مثنویاں مرتب ہوئیں۔ دکن پر اورنگ زیب کے قبضہ کے بعد یہاں کا وہ سکون و اطمینان ختم ہوگیا جو طویل مثنویوں کی تخلیق میں ممد و معاون تھا۔ اس انتشاری دور میں طویل ادبی کارناموں کی بجائے مختصر ادبی کارناموں کی طرف توجہ دی جانے لگی غزل کو اس دور میں فروغ ہوا اور طویل مثنویوں کی بجائے مختصر مثنویاں لکھی جانے لگیں[1]

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ مختلف موضوعات اور مسائل کے اظہار کے لئے چونکہ نظم جیسی صنف سخن نہیں تھی اس لئے ابتدا ہی سے صوفیائے کرام تصوف کے مسائل و نکات کو بیان کرنے کے لئے صنف مثنوی ہی سے کام لیتے رہے۔ چنانچہ دکن میں طویل مثنویوں کے ساتھ ساتھ صوفیائے کرام کی لکھی ہوئی چھوٹی چھوٹی مثنویاں بھی ملتی ہیں۔ شمالی ہند میں مثنوی کو زیادہ مقبولیت حاصل نہ ہوسکی۔ میر اور سودا نے چند چھوٹی چھوٹی مثنویاں لکھیں۔ میر حسن کی سحر البیان اور نسیم کی گلزار نسیم کسی قدر طویل مثنویاں ہیں۔ اور ادب عالیہ میں شمار کی جاتی ہیں۔ مرزا شوق کی مثنویاں بھی مختصر ہیں۔

---

[1] اردو مثنوی کا ارتقاء باب ۸ دور متوسط کی ابتدائی مثنویاں

ادبی انقلاب کے بعد زندگی کے متنوع موضوعات کو شاعری میں جگہ دینے کا میلان پیدا ہوا تو اس مقصد کے لئے اسی صنف کو برتا جانے لگا۔ آج بھی جب کہ نظم کے لئے نئی نئی ہیئتیں وضع ہو چکی ہیں اور ہوتی جا رہی ہیں مثنوی کی ہیئت بھی ان نئی نئی ہیئتوں کے ساتھ برابر ہوتی جاتی ہے۔

مہاراجہ نے دوسری اصناف سخن کے ساتھ اس صنف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی جملہ چھ مثنویاں دستیاب ہوئی ہیں۔

۱۔ نسیم سحر۔ ۲۔ عرض حال ۔ ۳۔ پریم درپن۔ ۴۔ جلوۂ کرشن۔ ۵۔ خمار شاد

۶۔ بزم توحید۔

دو مثنویوں کے صرف نام ملتے ہیں۔ مثنویاں نایاب ہیں۔

۱۔ مثنوی شمع توحید ۔ ۲۔ مثنوی موجود

مہاراجہ نے فارسی میں بھی تین مثنویاں کہی ہیں۔

۱۔ مثنوی آئینہ وحدت ۔ ۲۔ مثنوی آئینہ وجود۔ ۳۔ مثنوی مہر وجود

مہاراجہ کے طرز فکر کی سادگی اور طرز بیان کی بے ساختگی کے لئے مثنوی کی صنف بہت موزوں نظر آتی ہے۔ اس صنف میں وہ اپنے مخصوص خیالات اور معتقدات بڑی بے تکلفی اور بے ساختگی کے ساتھ بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ شعر سے شعر پیوستہ ہوتا جاتا ہے اور سلسلہ بیان آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ وہ اپنے دل کی بات بڑی توضیح اور تکمیل کے ساتھ بیان کر کے مثنوی کو ختم کر دیتے ہیں

مہاراجہ زندگی کے حقایق سے اپنی مثنویوں کے موضوعات حاصل کرتے ہیں اس لئے ان کی مثنویوں میں خارجی زندگی کا بھرپور نکھار بھی ملتا ہے اور نفسی کیفیات کا مدوجزر بھی۔ جذبات میں شدت ہوتی ہے تو ان کے انداز بیان میں بھی تیزی اور تندی آجاتی ہے۔ پریم درپن اور جلوۂ کرشن کے موضوعات مہاراجہ نے تاریخ سے لئے ہیں۔ لیکن تاریخی کرداروں کو بھی اس طرح ابھارا ہے کہ ان میں زندگی انگڑائیاں لیتی نظر آتی ہے۔ خصوصاً جلوۂ کرشن میں بزمیہ شاعری کے جمال اور رزمیہ شاعری کے جلال کو منعکس کرنے کے لئے مہاراجہ نے اپنی قدرت بیان کا اعجاز دکھایا ہے۔

صنف مثنوی میں شاعری کا ہر طرح کا کمال دکھانے کی گنجائش ہوتی ہے۔ شعرائے لکھنو نے اس صنف میں بھی صناعی کا کمال دکھانے کی کوشش کی ہے۔ مہاراجہ طبعاً ایسے تکلفات سے احتراز کرتے تھے۔ ان کی مثنوی کا حسن سادگی، ربط و تسلسل اور جوش بیان ہے۔ اچھی مثنوی ہمیشہ مقصدی ہوتی ہے اس نقطۂ نظر سے بھی مہاراجہ

کی مثنویاں کامیاب ہیں ۔ ان کی ہر مثنوی مقصدی ہونے کے علاوہ مکمل بھی ہوتی ہے ۔ کسی مثنوی کے اختتام پر تشنگی کا احساس نہیں ہوتا ۔

نسیم سحر | مثنوی، قصیدہ، قطعات اور رباعیات کا یہ مجموعہ علاقۂ پیشکاری حیدرآباد دکن میں طبع ہوا ۔ سائز $10 \times 6\frac{1}{2}$ سنہ طباعت درج نہیں نسیم سحر کے تمام اشعار اعلیٰ حضرت غفران مکان میر محبوب علی خاں کی سالگرہ کے موقع پر کہے گئے ہیں ۔ غالباً یہ اشعار ایک ہی سالگرہ کے موقع پر موزوں کئے گئے ہیں ۔ ایک قطعہ تاریخی سے سنہ ۱۳۰۷ ف نکلتا ہے اور دوسرے سے ۱۳۱۶ ہجری ۔

ابتداء میں مثنوی ہے جو ۴۶ اشعار پر مشتمل ہے ۔ یہ مثنوی صنعت توشیخ میں کہی گئی ہے ۔ مثنوی کے ہر شعر کے سر حرف کو جمع کرنے سے مرحوم اعلیٰ حضرت کا نام نبتا ہے ۔ جیسے "اعلیٰ حضرت ظل سبحانی آصف جاہ نواب میر محبوب علی خاں شاہ دکن" اس پورے نام میں (۴۶) حروف ہیں اسی مناسبت سے مثنوی کے (۴۶) اشعار ہیں ۔ مثال کے لئے چند ابتدائی اشعار دیئے جاتے ہیں ۔

الف ۔ اللہ کی حمد لکھ رہا ہوں   مداح رسولِ کبریا ہوں
ع ۔ عاشق ہوں دل سے پنجتن کا   وصاف حسین اور حسن کا
ل ۔ لا ساقی پلا شراب توحید   ہو جائے ہمارے گھر میں بھی عید
ی ۔ یاروں کو ہے خواہش صبوحی   صدقے تیرے فداک روحی
ح ۔ حاصل ہے جہاں کی آج شادی   کر دو ہر شہر میں منادی
ض ۔ ضرغام دکن سکندر اقبال   تینتسواں آج ان کا ہے سال
ر ۔ راحت کے ہیں بجتے شادیانے   کیا دن یہ دکھائے ہیں خدا نے
ت ۔ تابندہ ہے مہر آصفی راج   لیتے ہیں شہان ہند سے باج

عرض حال | عرض حال مہاراجہ کی لکھی ہوئی مثنوی ہے ۔ فاعلاتن مفاعلن فعلن کی بحر میں لکھی گئی ہے ۔ ۱۵۶ اشعار پر مشتمل ہے سائز $7 \times 4\frac{1}{2}$ سنہ تصنیف ۱۳۴۰ ہجری م ۱۹۲۱ء ہے ۔ نظامی پریس بدایوں میں طبع ہوئی ۔

اس مثنوی میں مہاراجہ نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ انھیں دنیا میں جو سرخ روئی اور سر بلندی حاصل ہوئی ہے وہ سب خدائے تعالیٰ کے فضل اور اس کی عطا کا نتیجہ ہے اور جتنے خطابات اور اعزازات انھیں ملے ہیں وہ سب خدا کی دین ہے ۔

حمد کے بعد مہاراجہ لکھتے ہیں ۔

نیست سے ہست تو نے مجھ کو کیا ذرے کو رتبہ مہر کا بخشا
تو نے راجا بنا دیا مجھ کو سر پہ طرہ لگا دیا مجھ کو
اور مہاراجہ کا خطاب دیا سر کے ٹیٹل سے سرفراز کیا
تو نے ہی کے سی آئی سی بخشی جی سی اور آئی ای بھی تو نے دی
مجھ کو اقبال اور دولت دی ساری دنیا میں تو نے عزت دی
پیشکاری کی تو نے خدمت دی فوج کی پھر مجھے وزارت دی
اور اس سے بھی بڑھ کے رتبہ دیا شہ کا دستور خاص مجھ کو کیا
تو ہی عزت کا دینے والا ہے تو ہی ذلت کا دینے والا ہے

مندرجہ بالا اشعار میں آخری شعر قرآنی آیت " تُعِزُّ مَن تَشَاءُ و تُذِلُّ مَن تَشَاءُ " کا منظوم ترجمہ ہے۔

اس کے بعد مہاراجہ نے اپنی مالی پریشانیوں کا ذکر کیا ہے۔ ضرورت سے مجبور ہو کر انہیں قرض بھی لینا پڑا جس کی ادائی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اسی ضمن میں قحط سالی اور روز افزوں گرانی کا حال بھی لکھا ہے چنانچہ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

دو برس سے ہے عام خلق تباہ ہے پریشاں گدا ہے یا شاہ
قحط سالی ہے عام دنیا میں بند ہیں جملہ کام دنیا میں
شاہ عثمان سے میں نے عرض کیا میرے معروضہ پر یہ حکم دیا
ملک کا قحط جب کہ جائے گا شاد تب ہم کو پائے گا
دور کب ہوگا قحط اے مولا ہوگی اصلاح اس فساد سے کیا

لوگوں کو عام طور پر یہ بدگمانی تھی کہ مہاراجہ کے پاس معتدبہ رقم جمع ہے اور وہ بلا وجہ خود کو مفلس و نادار ظاہر کرتے ہیں۔ مہاراجہ نے ان کا جواب دیتے ہوئے خدا سے دعا کی ہے کہ وہ انہیں افراط سے دولت دے تاکہ محتاجوں اور غریبوں کو دینے میں وہ کوتاہی نہ کریں اور ان کا سائل کبھی مایوس نہ لوٹے۔ ان ہی خیالات کو شعر کی صورت میں اس طرح پیش کیا ہے۔

ہے گماں سب کا جمع دولت ہے قرض لینا بھی ایک حکمت ہے
گھر میں میرے بڑے خزانے ہیں اور جواہر بہت پرانے ہیں
بدگمانوں کی باتیں سنتا ہوں نکتہ چینوں کے نکتے چنتا ہوں
ایسی باتوں کا کیا جواب میں دوں اور کہوں بھی تو ان سے کیا میں کہوں

رکھ کے دولت اگر کروں انکار — توبہ توبہ الٰہی استغفار
رکھ کے دولت کروں میں ناشکری — نہ ہوا مجھ سے اور نہ ہوگا کبھی
انبیاء کا گھرانہ ہے یارب — جمع دولت رکھی کسی نے کب
حاسدوں کا گماں تو سچ کر — مثل قارون کے دے مجھے تو زر
گنج قارون اگر مجھے تو دے — ڈنکے بج جائیں گے سخاوت کے
تیرے بندوں کے کام آؤں گا — انکی خدمت سے اجر پاؤں گا

آخر میں مہاراجہ نے خدا سے دعا کی ہے کہ وہ انھیں ہمیشہ خوش رکھے۔ غم واندوہ کو پاس پھٹکنے نہ دے۔ ان کی اولاد کو شاد و نیک نام رکھے اور ان کی خوشیاں دکھائے۔ مثنوی کے آخری اشعار یہ ہیں۔

شاد کو کر دے اے خدا دل شاد — رکھ سلامت اسے تو با اولاد
کوئی غم اور اب اسے نہ دکھا — واسطہ پنجتن کا اے مولا
خوشی اولاد کی دکھا تو اسے — سارے ارمان پورے تو کر دے
اس کی اولاد کی حفاظت کر — دولت و بخت و علم دے داور
اب تغافل نہ کر مرے مولا — غم آوارگی سے مجھ کو بچا
میری اولاد کے فرائض سے — اب سبکدوش مجھ کو تو کر دے
ان کی اولاد بس دکھا دے جلد — شاد کو شادماں بنا دے جلد

مثنوی کی زبان سادہ ہے، ربط بیان قائم ہے اشعار میں بندش کی چستی بھی ہے۔ لیکن فکر و جذبہ کے امتزاج سے جو شعریت پیدا ہوتی ہے وہ بہت کم ملتی ہے۔

پریم درپن

"نظم دل کشا" موسوم بہ "پریم درپن" کے دو مختلف نسخے دستیاب ہوئے ہیں۔ دونوں کا سنہ طباعت ۱۳۴۵ ہجری م ۱۹۲۷ء ہی ہے ایک نسخہ دارالطبع سرکار عالی حیدرآباد میں چھپا ہے جو ۶" × ۴½" سائز کے ۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ دوسرا انگار مشین پریس نظیرآباد لکھنؤ میں طبع ہوا ہے۔ اس دوسرے نسخے کے ساتھ نیاز فتح پوری کا مقدمہ ہے برموقع رنگین تصویریں بھی دی گئی ہیں طباعت اور کاغذ نہایت عمدہ ہے۔ ٹائیٹل بھی خوب ہے۔ ۷½" × ۵" سائز کے (۴۶) صفحات پر مشتمل ہے۔ پریم درپن کا یہ نسخہ نیاز فتح پوری کے اہتمام ہی سے شائع ہوا ہے۔ جس کا ثبوت ان کے اس خط سے ملتا ہے جو انہوں نے مہاراجہ کو لکھا تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔

"پریم درپن کی تصاویر تیار ہو رہی ہیں انشاء اللہ اخیر جون

میں خود حاضر ہو کر پیش کروں گا۔"[1]

ایک اور خط میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

"پریم درپن کا بڑا کام ختم ہو چکا یعنی سات بلاک تصاویر کے تیار ہو چکے۔ کتابت ہو رہی ہے۔"[2]

مقدمہ کے (۱۹) صفحات ہیں۔ پریم درپن پر کچھ لکھنے سے پہلے نیاز فتح پوری نے مہاراجہ کے سلسلۂ نسب اور خاندانی شان و شوکت کے بارے میں اپنی رائے لکھی ہے۔ مہاراجہ کی عظیم شخصیت کے متعلق لکھتے ہیں۔

"شاید کم لوگ واقف ہوں گے کہ شاد صرف مہاراجہ نہیں، حکومت آصفیہ کے صرف صدر اعظم نہیں بلکہ ان تمام حیثیات سے زیادہ ایک اور عظیم حیثیت انسانِ کامل ہونے کی بھی رکھتے ہیں اور ان کا دل ان جذباتِ بلند ان مقاصد اعلیٰ اور ان احساساتِ رفیع سے مالا مال ہے جس سے آج خانقاہوں، مسجدوں اور کلیساؤں کے گوشے بھی خالی نظر آتے ہیں۔"

مصنف کی تعریف و تعارف کے بعد ان کے زیر نظر کارنامے۔ پر اس طرح اظہار خیال کیا ہے۔

"مہاراجہ شاد کی متعدد تصنیفات ہیں اور ایک نگاہ دقیقہ رس بہ آسانی معلوم کر سکتی ہے کہ ان کی تمام تحریروں میں وہی ایک رنگ خلوص وہی ایک جلوۂ محبت و صداقت اور وہی ایک جذبۂ لطف و رافت نظر آتا ہے جس میں روز الست ہی سے ان کی روح ڈوب کر نکلی تھی۔ لیکن پریم درپن ایک ایسا آئینہ محبت ہے جس میں شاد نے اپنے آپ کو بغیر کسی حجاب کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ ...... وہ ایک نغمۂ محبت ہے فضائے آسمانی سے اترنے والا ایک دعوت نجات ہے اعماق روح سے نکلنے والی ایک پیام سرمدی ہے جو فرشتہ لایا اور شاد کے دل میں ودیعت کر گیا۔ اور ایک نوید حیات ہے جو ذاتِ خداوندی کی طرف سے شاد کے قلم میں جنبش بال جبرئیل ہو کر منتقل ہو گئی۔"

---

[1] خط مخزونہ حیدری گشتی کتب خانہ حیدر آباد دکن [2] خط مخزونہ حیدری گشتی کتب خانہ حیدر آباد دکن

مثنوی پریم درپن ۱۴۲۱... اشعار پر مشتمل ہے فعلن فعلن فعلن فعلن کی بحر میں لکھی گئی ہے۔
اس مثنوی میں مہاراجہ نے تاریخ اور روایات کی روشنی میں اسلاف کی بے تعصبی اور اتحاد و اتفاق کا جائزہ لینے کے بعد عہد حاضر کے تعصب و تنگ نظری پر ماتم کیا ہے۔ ابتداء میں آٹھ شعر "ساقی نامہ" کے لکھ کر اپنی وسیع المشربی اور مذہبی رواداری کا اس طرح اظہار کیا ہے

میں ہوں موحد میں ہوں صوفی — عارف بے خود مجنون صوفی
دیکھتا ہوں وحدت میں کثرت — کثرت میں پاتا ہوں وحدت
میں ہوں ہندو میں ہوں مسلماں — ہر مذہب ہے میرا ایماں
شاد کا مذہب شاد ہی جانے — آزادی آزاد ہی جانے

تاریخی شہادتوں سے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ماضی میں ہندو مسلم اتحاد کو کس قدر اہمیت حاصل تھی۔ اکبر کے عہد کے واقعات لکھنے کے بعد جہانگیر سے متعلق ایک تاریخی قصہ لکھا ہے کہ کس طرح اس نے روپا نامی ایک ہندو لڑکی کو اپنی بیٹی بنا کر اس کی پرورش اور شادی بیاہ کا ذمہ لیا تھا۔ روپا کا سراپا ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

دیکھا وہاں اک حور لقا کو — حسن کی دیوی ہوش ربا کو
سر سے پا تک نور کی صورت — تھی وہ پری یا حور کی صورت
ماتھے پر چندن کا ٹیکا — جس سے قمر کا رنگ ہو پھیکا
میلی سی بوسیدہ ساڑی — اس پہ بھی صورت پیاری پیاری
تھا ایسا سنسان وہ صحرا — ہوتا تھا اس پر دھوکہ پری کا

جہانگیر روپا کو اپنی بیٹی اور اس کی ماں کو اپنی ماں بنا لیتا ہے اور ان دونوں کو ساتھ لے جا کر اپنے محل میں رکھتا ہے۔ جہانگیر روپا کی شادی تالی کوٹہ کے ایک برہمن سے کر دیتا ہے اور تالی کوٹہ کی ریاست اس منہ بولی بیٹی کے نام کر دیتا ہے روپا کی شادی کے سلسلے میں برات، جہیز اور جاگیر کا ذکر کرتے ہوئے جو جزئیات نگاری کی ہے اس سے مہاراجہ کی قوت مشاہدہ اور قوت اظہار دونوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس سبق آموز تاریخی واقعہ کو ختم کرنے کے بعد وہ اپنی قوم کی پستی اور جہالت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور رنج و تاسف کا اظہار کرتے ہیں۔

اب کچھ قوم کی حالت دیکھو — دیکھا علم، جہالت دیکھو
آئے دن کی جنگ و جدل ہے — آپس ہی میں رد و بدل ہے
گائے کی قربانی پہ جھگڑا — آگ پہ جھگڑا پانی پہ جھگڑا

مسجد کی دیوار پہ جھگڑا ‏ ‏ ‏ ‏ باجوں کی جھنکار پہ جھگڑا
جھنڈے اور نشانوں پہ جھگڑا ‏ ‏ ‏ ‏ مذہب اور ایمانوں پہ جھگڑا
اس پر ہیں سوراج کے طالب ‏ ‏ ‏ ‏ تخت کے طالب تاج کے طالب
شاد جو ہو دل شاد تو کیوں کر ‏ ‏ ‏ ‏ ہو پابند آزاد تو کیوں کر

آخر میں مہاراجہ مثنوی لکھنے کا سبب یہ بیان کرتے ہیں کہ چونکہ قوم کا رجحان پستی کی طرف ہے اور اس تباہی کے خطرے سے اس کو آگاہ کرنا اور نقصان سے بچانا ضروری ہے اس لئے قوم کو بیدار کرنے کی خاطر انہوں نے یہ مثنوی لکھی ہے۔ مثنوی کا اختتام ذیل کے اشعار پر ہوا ہے۔

تاریخی لکھا یہ قصہ ‏ ‏ ‏ ‏ میرے قلم کا تھا یہ حصہ
نظم مرصع ہے یہ ساری ‏ ‏ ‏ ‏ تاکہ قوم کو ہو بیداری
آمد ہے آورد نہیں ہے ‏ ‏ ‏ ‏ صاف ہے یہ مئے درد نہیں ہے

مثنوی کی زبان سادہ بیان میں روانی اور جوش اور لب و لہجہ میں بڑا خلوص ہے۔ جزئیات نگاری اور واقعات کی تصویر کشی میں بھی مہاراجہ نے اپنی قوت مشاہدہ اور قدرت بیان کا کمال دکھایا ہے۔ مثنوی "پریم درپن" شاد کی بہترین مثنویوں میں سے ہے۔

جلوۂ کرشن

جلوۂ کرشن مہاراجہ کی ایک دلچسپ اور اہم مثنوی ہے جو ۵۹۸ اشعار پر مشتمل ہے۔ سائز ۶½″ × ۴½″ احمدیہ پریس حیدرآباد دکن میں طبع ہوئی۔ سنہ تصنیف درج نہیں ہے۔ مثنوی کی بحر مفعول مفاعلن فعلن ہے۔ اس بحر میں جذبات اور خیالات کا زور دکھانے کی بڑی گنجائش ہوتی ہے۔ مثنوی کا موضوع سری کرشن جی کے حالات اور ان کی تعلیمات ہے۔

مہاراجہ نے اس مثنوی کو سات حصوں میں تقسیم کیا ہے۔
۱۔ سورج بنسی و چندر بنسی خاندان ۔ ۲۔ ظہور نور ۔ ۳۔ صبح صادق
۴۔ بالسری ۔ ۵۔ ساقی نامہ ۔ ۶۔ کنس اور دنگل ۔ ۷۔ تاج بخشی

مثنوی سے پہلے ناظر الحسن ہوش بلگرامی کا لکھا ہوا مقدمہ ہے۔ جو تقریباً سولہ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہوش نے مقدمہ میں پہلے سری کرشن جی کے حالات بیان کئے ہیں۔

"بیسویں صدی میں حیدرآباد کے "کشن" کی شاعرانہ طبیعت کا دریا

موجیں مارتا ہے صرف اس عقیدے کو لئے ہوئے کہ یہ بھی اس کے نام پر ۶۵ سال سے زندہ ہے۔ گو شاد ہے مگر زمانہ کی رفتار اور اپنی افراط شرافت سے ناشاد گو خاندانی امیر ہے مگر اپنی ذات سے فقیر۔ نام کی برکت ہزاروں سال گزر جانے پر بھی اس حد تک تو باقی رہی کہ واسدیو کا کشن ہند کا بادشاہ تھا۔ چندو لال کا کشن دکن کا وزیر ہے۔

اس کے بعد انہوں نے مہاراجہ اور ان کے خاندان کی سرپرستوں کا ذکر کیا ہے۔ مہاراجہ چندو لال شاداںؔ کے درباری شعراء کا تذکرہ کرتے ہوئے خصوصیت سے شاہ نصیرالدین دہلوی کا ذکر کیا ہے اور مہاراجہ کے درباری شعراء میں سرشارؔ، داغؔ، جلیلؔ، اخترؔ ضیاءؔ، محوؔ، ثاقبؔ، عمادؔ اور بیگم کا تذکرہ کیا ہے۔ آخر میں مثنوی کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے مختلف حصوں سے مثالیں دی ہیں۔

مثنوی کے آخر میں دو تقریظیں ہیں۔ پہلی تقریظ نظم طباطبائی کی ہے۔ نظم نے اس تقریظ میں 'کرشن جی' ان کی گوپیوں اور ان کے مقابلوں کو استعارہ بنا کر اس کی فلسفیانہ تعبیر پیش کی ہے۔

دوسری تقریظ جوش ملیح آبادی کی ہے۔ مہاراجہ شادؔ کے کمال شعری کا اعتراف کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

وہ کرشن کی کہانی پھر کشن کی زبانی، جادو کا اثر کیوں نہ کرے۔

ع ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

مثنوی کے ہر مصرعہ میں مصنف کا خون دوڑ رہا ہے اور ہر نکتہ میں مصنف کا دل دھڑک رہا ہے۔"

دو تقریظوں کے بعد مشہور ریختی گو شاعر عابد مرزا بیگم کے چھ شعر ہیں۔ آخری شعر میں انہوں نے تاریخ تصنیف کہی ہے۔

شاد کی خدمت میں یہ تاریخ بیگم نذر دو
مثنوی ان کی نویلی ہے چھیتی موہنی
۱۳۴۷ھ

پہلے عنوان کے تحت مہاراجہ نے اپنے مسلک اور نسبی سلسلہ کو بیان کرنے کے بعد سری کرشن جی کے خاندان، پیدائش اور ابتدائی حالات پر روشنی ڈالی ہے۔ اپنے مسلک کے بارے میں لکھتے ہیں۔

ہے میرا طریق صوفیانہ — توحید ہے بس مرا ترانہ
ہرگز نہ دوئی کو نیک سمجھا — میں دیر و حرم کو ایک سمجھا
صوفی ہوں موحدانہ مسلک — کی میں نے نہ بت پرستی اب تک

مہاراجہ نے "کنس اور دنگل" کے عنوان سے سری کرشن جی اور ان کے ماموں کنس کی لڑائی کا حال لکھا ہے۔ کنس نے اپنے ظلم وستم سے سری کرشن جی کے چھ بھائیوں کو نہایت ہی بے دردی سے ختم کردیا تھا۔ اس کا انتقام سری کرشن جی نے اس طرح لیا کہ کنس کو میدان جنگ میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مہاراجہ نے لڑائی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

وہ بیچ گیا کرشن جی نے — لی سانس تلک نہ مدعی نے
سینے پہ اسے گرا کے بیٹھے — اٹھا نہ وہ یوں دبا کے بیٹھے
راجہ نے کیا جو یہ نظارہ — بے دم ہوا ایسا دم نہ مارا
لشکر کی طرف نظر اٹھائی — یعنی کریں مل کے سب چڑھائی
راجہ کا سمجھ گیا جو منشا — شہزادہ کو اب تو غیظ آیا
مٹھی میں پکڑ کے بال سر کے — جھٹکا دیا تن کو فتنہ گر کے
کشتی میں پچھاڑ کر اسے پھر — کام اس کا کیا تمام آخر
جلد اپنی کمر سے کھینچ خنجر — بے جان کیا اس کو کاٹ کر سر

کنس کے خاتمہ کے بعد سری کرشن جی کنس کے بقیہ آٹھ بھائیوں سے مقابلہ کرتے ہیں اور انھیں بھی ختم کردیتے ہیں "تاج بخشی" کے عنوان سے مہاراجہ نے سری کرشن جی کے بارے میں لکھا ہے کہ جب تخت وتاج لینے کے لئے اصرار کیا گیا تو انہوں نے انکار کردیا۔ سری کرشن جی کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

مجھ کو نہیں خواہش حکومت — جائز نہیں رکھتا میں خصومت
ظالم نہیں میں جو خوں بہاؤں — غاصب نہیں میں جو ملک پاؤں
میرا یہی فرض منصبی تھا — قصہ کروں پاک فتنہ گر کا

مثنوی کے ختم پر مہاراجہ نے اپنے چہیتے فرزند خواجہ پرشاد کے لئے دعا کی ہے۔ دعائیہ اشعار درج ذیل ہیں۔

ہے نور نظر جو خواجہ پرشاد — ہے وہ ہی میرے چمن کا شمشاد
وہ شاد کا تیرے جانشین ہے — وہ خاتم شاد کا نگین ہے
آنکھ اس کی ذرا بگڑ گئی ہے — پتلی سے نظر اکھڑ گئی ہے

کر دو تم آنکھ کا اشارا — کرنے لگے چشم وہ نظارا
میری جو مراد ہے تو یہ ہے — خوش کامی شاد ہے تو یہ ہے

اس مثنوی میں مذہبی جذبات کا جوش اور خلوص دونوں موجود ہیں۔ سری کرشن جی سے مہاراجہ کو بڑی عقیدت تھی۔ نظم و نثر میں جہاں بھی سری کرشن جی کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں تو ان کا جوشِ عقیدت بولنے لگتا ہے۔ اسی جوشِ عقیدت کی وجہ سے ان کے بیان میں چستی آگئی ہے شری کرشن جی اور کمنس کی لڑائی کے ذکر میں رزمیہ شاعری کی شان پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس شاعری کا طنطنہ مہاراجہ کے بس کا نہیں ہے۔ پھر بھی معرکہ آرائی کا جیسا کچھ بھی نقشہ مہاراجہ نے پیش کیا ہے دلچسپی سے خالی نہیں۔

خمار شاد مثنوی خمار شاد ۱۸۷ اشعار پر مشتمل ہے۔ سائز ۹"×۵½" سنہ تصنیف اور سنہ طباعت درج نہیں ہے محبوب پریس علاقہ پیشکاری حیدرآباد دکن میں طبع ہوئی مثنوی کا آغاز حافظ کی غزل کے اس شعر سے کیا ہے ؎

منم کہ گوشہ میخانہ خانقاہ من است — دعائے پیر مغاں ورد صبح گاہ من است

مثنوی کے درمیان میں جگہ جگہ حافظ کی اسی غزل کے اشعار نقل کئے ہیں۔ مہاراجہ نے یہ مثنوی اپنے پیر طریقت حضرت خواجہ حسن نظامی سے خماری شاہ کا خطاب ملنے پر لکھی ہے۔ جس میں انہوں نے حسب عادت اپنے مذہب و مسلک کو پیش کیا ہے۔ چنانچہ خواجہ صاحب سے اس خطاب کے ملنے کا ذکر کرنے کے بعد ہر مذہب و ملت میں اپنی تلاش حق کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ حق پرستی کی وجہ سے ہر مذہب و مسلک کے لوگوں نے انھیں اپنا منصور کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

کبیر پنتھ میں جا کر کبیر کہلایا — ملے جو نانکی ان سے بھی مرتبہ پایا
جو ہیں اداسی و بیراگی اور سنیاسی — سبھوں کا بندۂ بے دام اور ہوں داسی
ہوا جو میکدۂ قادری میں میرا گزر — سبھوں شراب محبت سے مست آئے نظر
شراب ایک ہے لیکن جدا ہے لذت میں — مئے طہور سے بھی کچھ سوا ہے لذت میں
یوں ہی جو میکدۂ چشت میں گیا پھرتا — تو دیکھا میں نے یہاں کا کچھ اور ہی نقشا
ہر ایک بادۂ الفت سے مست پھرتا ہے — خراب بادہ روز الست پھرتا ہے
یہاں کے پیر مغاں ہیں میرے معین الدین — یہاں کے جانِ جہاں ہیں میرے معین الدین

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ بادشاہ کی طرف سے کسی کو جرنل و کرنل، راجہ یا نواب، خاں بہادر، جنگ یا دولہ جیسے خطابات ملتے ہیں ان پر کوئی معترض نہیں ہوتا۔ ان خطابات سے مذہب میں کوئی فرق نہیں آتا۔ نہ اس سے ہندو کا دھرم بھرشٹ ہوتا ہے نہ مسلمان کافر ہوتا ہے۔ ولایت جاکر

آنے والے ہندو ہوٹلوں میں کھاتے ہیں شراب پیتے ہیں مگر ان کا دھرم نہیں جاتا۔ مہاراجہ اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ انھیں بھی یمین السلطنت اور مہر کے خطابات ملے مگر ان خطابات سے نہ اُن کی قومیت بدلی نہ دین پر آنچ آئی۔ لیکن جب سے وہ چشتی مشہور ہوئے اور خماری شاہ کا خطاب ملا اس سے وہ ذات باہر ہو گئے۔ مہاراجہ شاد لکھتے ہیں ؎

یمین سلطنت و مہر کا جب خطاب ملا — نہ قوم میری گئی جب نہ دین میرا گیا
عجیب بات ہے چشتی جو ہو گیا مشہور — خماری شہ کے لقب سے جو میں ہوا مخمور
اسی سے ہو گیا مسلم اسی سے ذات گئی — گیا اسی سے دھرم اور کائنات گئی
اسی کا نام حسد ہے یہی تعصب ہے — یہی تو عادت بد ہے یہی تعصب ہے
لقب کے ملنے سے اے شاد جاتی ہے گر ذات — یہ ذات ذات نہیں ہے نہ ہو گا اس کو ثبات

اس کے بعد صوفیا کے مسلک کو سمجھاتے ہوئے صاف اور صریح الفاظ میں شاد نے حسبِ عادت اپنے مسلک کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے ؎

یہ فخر کم نہیں کھتری بیا ہی زادہ ہوں — معاصرین سے ہر فن میں میں زیادہ ہوں
یہ جیسے قوم سے اپنی مجھے فضیلت ہے — اسی طرح مجھے مذہب سے اپنے عزت ہے
کہ ہوں موحد صوفی فقیر ہوں آزاد — خدا ہے مذہب ملت مجھے مبارک باد
میرا دھرم کہو ایمان کہو ہے اک توحید — ہے صلح کل مرا مشرب بحق رب مجید
پھرا تلاش میں اس کی حرم میں مندر میں — مگر ملا جو وہ دلبر تو اپنے ہی گھر میں

اس وضاحت کے بعد شاد نے حسبِ عادت رام چندر جی اور منصور کے مسلک توحید کو سراہا ہے۔ مثنوی کے آخر میں اپنے شیخ طریقت سے بادۂ عرفاں عطا کرنے کی درخواست کی ہے۔ مثنوی کو بادشاہ کے ساتھ اپنی پشتینی نمک خواری اور خدمت گزاری کے ذکر پر ختم کیا ہے۔

مثنوی کی زبان بہت سادہ اور رواں ہے۔ شروع سے آخر تک ربط بیان قائم ہے۔ درمیان میں جگہ جگہ حافظ کی غزل کے اشعار دے کر جدت پیدا کی ہے۔ فکر کی گہرائی یوں تو شاد کی شاعری میں کم ہی نظر آتی ہے لیکن اس مثنوی میں مسائل و مباحث کے اعتبار سے توقع تھی کہ کم از کم یہاں تخیل کی بلندی اور فکر و نظر کی دور رسی ملے گی۔ لیکن اس مثنوی میں بھی مہاراجہ نے مختلف مسائل کا اسی عمومی انداز میں جائزہ لیا ہے جو ان کی دوسری مثنویوں میں ملتا ہے۔ توحید تصوف، مذہب اور تعصب و بے تعصبی کے تعلق سے وہ ہر جگہ کچھ نہ کچھ کہتے جاتے ہیں اور ہر جگہ کہنے کا انداز و اسلوب ایک جیسا ہوتا ہے۔

بزم توحید مثنوی بزم توحید علٰحدہ کتابی صورت میں دستیاب نہیں ہوئی۔ "روزنامچہ گلبرگہ"

میں مہاراجہ نے اس مثنوی کو نقل کیا ہے۔ یہ مثنوی ۱۰۵ اشعار پر مشتمل ہے۔ ابتداء میں مہاراجہ نے توحید کے مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد ایک خواب کا ذکر ہے جس میں انہوں نے دیکھا کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ انھیں الائچی کے سات دانے عطا کر رہے ہیں۔ مہاراجہ نے یہ دانے نہایت عقیدت سے لئے اور ان کی قدم بوسی کا شرف حاصل کیا۔ اس خواب کے بیان کرنے سے شاد کا مقصد جہاں اپنی سرفرازی کا اظہار ہے وہیں خواجہ صاحب سے اپنی عقیدت خاص کا اظہار بھی معلوم ہوتا ہے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی منقبت میں لکھتے ہیں۔

ہند کا پیر مغاں تو ہی ہے ۔۔۔ ساقیٔ بادہ کشاں تو ہی ہے
تجھ سے پوشیدہ نہیں ہے اصلا ۔۔۔ تو ہے گنجینۂ اسرار خدا
صورت آئینہ ہے تجھ پہ عیاں ۔۔۔ نہیں ممکن کہ ہو کچھ تجھ سے نہاں

مثنوی کے آخری اشعار میں مہاراجہ نے اپنی اور اپنی اولاد کی خوشحالی اور سرخ روئی کے لئے دعا مانگی ہے۔ نیز دشمن کی پامالی کی بھی خواہش ظاہر کی ہے۔ اشعار درج ذیل ہیں۔

دفع سب میری پریشانی ہو ۔۔۔ مہر کی مجھ پہ فراوانی ہو
سارے پامال مرے ہوں دشمن ۔۔۔ ان کا باقی نہ رہے سر اور تن
ان کی امید نہ بر آئے کوئی ۔۔۔ ہو جلی یا کہ الہٰی ہو خفی
شاد کا نیک ہو یارب انجام ۔۔۔ رہے منصور و مظفر وہ مدام

مسدس۔ آشوب عظیم یہ مسدس ۵"×۸" کی تختی پر ۱۳۳۸ھ م ۱۹۲۰ء میں محبوب پریس علاقہ پیشکاری میں طبع ہوا۔ حالی کا مسدس "مدوجزر اسلام" اس قدر مقبول ہوا کہ مختلف مسائل و موضوعات پر مسدس لکھنے کا رجحان عام ہو گیا۔ خود مدوجزر اسلام کے خطوط پر کئی مسدس لکھے گئے۔ مہاراجہ نے بھی مسدس نگاری کے اسی میلان کے اثر سے پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء کی قیامت خیزی پر "آشوب عظیم" کے نام سے زیر نظر مسدس قلم بند کیا۔

یہ مختصر مسدس (۳۷) بندوں پر مشتمل ہے اس مسدس میں مہاراجہ نے یہ جدت پیدا کی ہے کہ ہر بند کے پہلے دو شعر اردو میں لکھے ہیں اور آخری شعر فارسی میں لکھا ہے۔ یہ فارسی اشعار بیشتر مہاراجہ ہی کے ہیں۔ بعض اشعار اساتذہ کے بھی درج کر دیئے ہیں۔ اس مسدس میں مہاراجہ نے جرمنی کے اعلان جنگ، ترکی اور جرمنی کے اتحاد اور ان کے مقابلہ میں فرانس برطانیہ اور روس کا ایکا اور ان کی معرکہ آرائی کا اختصار کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے روس میں زار سے بغاوت اور انقلاب کا ذکر کیا ہے اس کے بعد قیصر جرمنی سے اہل جرمنی کی بغاوت کے ذکر کے بعد اتحادیوں کی فتح کے ذکر پر مسدس کو ختم کیا ہے۔ درمیان میں ہندوستان کی طرف

سے جو برطانیہ کی مدد لی گئی تھی اس کے تذکرہ کے ضمن میں شہریار دکن کی مدد کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے
مہاراجہ نے اس مسدس کے لئے جس موضوع کا انتخاب کیا ہے وہ بہت اہم بھی ہے اور وسیع بھی مگر انہوں نے اس قدر اختصار سے کام لیا ہے کہ یہ مسدس جنگ عظیم کے واقعات کا محض ایک اشاریہ بن کر رہ گیا ہے۔ بیان کی چستی کے اعتبار سے یہ مسدس اچھا ہے مگر واقعات کے اچٹتے سے اشاروں کی وجہ سے پڑھنے والے کو گھٹن سی محسوس ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسا موضوع جو طوالت اور تفصیل کا تقاضا کرتا ہو مہاراجہ جیسے معروف انسان کو ایسے موضوع پر قلم اٹھانا نہیں چاہئے تھا۔

مرثیہ

اردو شاعری کی روایتی اصناف میں مرثیہ ہی ایک ایسی صنف سخن ہے جس کو ہم غیر تقلیدی کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ اردو مرثیہ اپنی تمام فنی خصوصیات اور مخصوص شعری روایات کی وجہ سے خالص اردو کی چیز ہے۔ صرف مرثیہ کہنے کا رجحان فارسی شاعری سے لیا گیا ہے۔ دکنی مراثی میں بھی جو اردو کے ابتدائی مراثی ہیں ہندستانی تہذیب کی ایسی گہری چھاپ ملتی ہے کہ مرزا، شاہی، ہاشمی وغیرہ جیسے دکنی مرثیہ گو شعراء کے مراثی بھی فارسی مراثی سے بہت کچھ مختلف ہو گئے ہیں۔ مرثیہ گوئی کو جو مقبولیت دکن میں حاصل تھی شمالی ہند میں اردو شاعری کے آغاز کے بعد باقی نہیں رہی۔ سودا تک دو چار ہی مرثیہ گو شعراء کے نام ملتے ہیں۔ خود سودا کے ہم عصروں میں چند غیر معروف مرثیہ گو شاعروں کا پتہ چلتا ہے اور وہ بھی شاعر کی حیثیت سے وقعت کی نظر سے نہیں دیکھے جاتے تھے۔ اس لئے کہ عام خیال یہ ہو گیا تھا کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو بن جاتا ہے۔ سودا نے اس صنف سخن پر بھی خصوصیت سے توجہ دی۔ خصوصاً ہیئت کے اعتبار سے نئے نئے تجربے کئے گئے پھر بھی وہ اس صنف میں وہ کمال پیدا نہیں کر سکے جو انہوں نے دوسری اصناف سخن میں پیدا کیا ہے۔ دکن اسکول کے بعد اردو مرثیہ کو لکھنؤ اسکول میں دوبارہ عروج حاصل ہوا۔ ضمیر اور خلیق نے مرثیہ کی ابواب بندی کر کے اس کو باقاعدہ بھی بنایا اور وسعت بھی دی۔ انیس اور دبیر نے ان ہی کے ڈالے ہوئے خطوط پر مرثیہ کی ایسی عظیم الشان عمارت کھڑی کی کہ پھر کوئی اس پر اضافہ نہ کر سکا۔ بالخصوص میر انیس نے اپنی زبان کی وسعت اور بیان کے حسن سے مرثیہ کو اس قدر چمکایا کہ ہر چھوٹا بڑا شاعر اس صنف میں طبع آزمائی کرنے لگا۔ اور میر انیس کی کامیاب تقلید مرثیہ گوئی کا کمال سمجھی جانے لگی۔

مہاراجہ شاد جو شعر و ادب کی ہر صنف میں زور آزمائی کا شوق رکھتے تھے بھلا مرثیہ جیسی مقبول صنف کو وہ اچھوتا کیسے چھوڑ سکتے تھے۔ ان کا مسلک جو کچھ بھی ہو وہ مذہباً ہندو ہی تھے۔ لیکن چونکہ ان کی نشو و نما اسلامی تہذیب کے ماحول میں ہوئی تھی اور اسلامی علوم

کا تھوڑا بہت مطالعہ بھی کیا تھا اور تاریخ اسلام سے واقفیت بھی رکھتے تھے اس لئے یہ پورا ذہنی سرمایہ مرثیہ گوئی میں ممد و معاون ثابت ہوا۔ مہاراجہ بھی دوسرے شعراء کی طرح میر انیس ہی کی تقلید کرتے ہیں۔ ان کے صرف چھ مراثی دستیاب ہوئے ہیں، جن میں سے "ماتم حسین" اور "نوحۂ شاد" مذہبی مرثیے ہیں۔ تین مرثیے نظم طباطبائی، شمس الملک اور اپنے فرزند آصف یار شاد کی وفات پر لکھے ہیں۔ ناوک غم مذہبی مرثیہ ہے۔ لیکن فارسی میں کہا گیا ہے۔ ماتم حسین اور نوحۂ شاد یہ دونوں مرثیے واقعات کربلا سے متعلق ہیں۔ مہاراجہ کا مذہب و مسلک جو کچھ بھی ہو ان مراثی میں امام حسینؑ کے ساتھ ان کے جذبات عقیدت اور محبت میں خلوص اور گرمی محسوس ہوتی ہے۔

عزیز و اقارب کی موت پر مرثیہ کہنے کی روایت بھی اردو شاعری میں بہت قدیم ہے اس نوع کا پہلا مرثیہ دکنی شعراء میں برہان الدین جانم کے پاس ملتا ہے جو انہوں نے اپنے والد اور بیجاپور کے عالی مرتبت بزرگ میراں جی شمس العشاق کی وفات پر کہا ہے۔[1]

ادبی انقلاب کے بعد نظم نگاری کے رواج کے باعث اس طرح کے غیر مذہبی مراثی زیادہ کہے جانے لگے تھے۔ مہاراجہ شاد کے غیر مذہبی مراثی بھی اسی جدید میلان کا نتیجہ قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ یہ مرثیے فکر اور فن دونوں کے اعتبار سے کامیاب مراثی کہے جا سکتے ہیں۔

ماتم حسین یہ مرثیہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت پر مسدس کی ہئیت میں لکھا گیا ہے، جو ۲۷۶ اشعار پر مشتمل ہے آخر میں ایک رباعی ہے۔ سائز ۸½" × ۵½" سید ناظر الحسن ہوش بلگرامی کے اہتمام سے ذخیرہ پریس حیدرآباد میں طبع ہوا۔ سنہ تصنیف درج نہیں۔

شاعر کی قادر الکلامی ہی سے مرثیہ میں زور اور تاثر پیدا ہوتا ہے۔ جذبات نگاری کردار نگاری، منظر نگاری الفاظ کا برجستہ استعمال سلیس اور موثر انداز بیان تمام ایسی خوبیاں ہیں جو اچھے مرثیہ کے لئے ضروری ہیں۔ ماتم حسین میں مہاراجہ نے مرثیہ کے تمام اہم اجزا کو پیش نظر رکھا ہے۔ اور تمام واقعات اور حقائق کو آسان زبان اور موثر انداز میں قلم بند کیا ہے۔

---

[1] قدیم اردو مولوی عبدالحق ص ۳۷

حضرت امام حسین نے اپنے چچازاد بھائی مسلم کو اپنے روانہ ہونے سے قبل کوفہ بھیجا تھا تاکہ وہاں کے حالات معلوم کرکے آئیں۔ کوفہ میں مسلم کو بے دردی سے شہید کر دیا گیا ان کے بعد ان کے دو کمسن بچوں کو بھی شہید کر دیا گیا۔ ان تینوں کی شہادت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

کرکے قتل آپ کو خوش دل ہوا ابن زیاد
ہو گیا آپ کے حق میں وہ مسلماں جلاد
لاش کو پھینک دیا کوٹھے کے نیچے فریاد
تاکہ مخلوق ہو کوفے کی بہت دیکھ کے شاد
نہ فقط حضرت مسلم کا ہوا کام تمام
وہ بھی کھلا گئے ساتھ آئے جو تھے دو گلفام
ہو گئے ظلم کی تلوار سے بے سر دونوں
رہ گئے خاک میں اور خوں میں تڑپ کر دونوں

ان کے قتل کے بعد حضرت امام حسینؑ مقابلہ کے لئے جاتے ہیں۔ شہادت سے قبل ان کی جماعت کے تمام افراد پر پانی بند کر دیا جاتا ہے۔ اس واقعہ کو بیان کرنے کے لئے شاعر نے نہایت سادہ زبان اور پُر اثر اسلوب اختیار کیا ہے۔

پیاس ایسی تھی کہ بچوں کا بہت غیر تھا حال
گھر میں سلطان دو عالم کے یہ پانی کا تھا کال
جب سکینہ نے کیا آن کے پانی کا سوال
دل پہ عباسؑ کے گزرا قلق و رنج و ملال
لے کے مشکیزہ چلے جانب دریائے فرات
قصد کوثر کا بھی اور طالب دریائے فرات
حملہ ہر سو سے کیا مل کے ستم گاروں نے
کر کے ہیمنہ تعاقب کیا اسواروں نے
تیر برسا دیئے غازی پہ کماں داروں نے
ہاتھ شانوں سے جدا کر دیئے تلواروں نے

میر انیس نے مرثیہ کو فکر و فن کے اعتبار سے اس قدر بلندی عطا کر دی ہے کہ ان کے بعد ہر مرثیہ نگار ان کے سامنے بودا نظر آتا ہے۔ اس لئے میر انیس کے معیار مرثیہ سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو شاد کا مرثیہ اچھا خاصا ہے۔ خصوصاً ایک اسلامی موضوع

کے ساتھ ان کا اس درجہ خلوص اور بھی حیرت انگیز ہے۔

مرثیہ کے ختم پر ذیل کی رباعی درج ہے۔

معلوم ہوئے علی سے اسرار خدا
اور سرّ کمال قلب قوسین کھلا
اے شاؔد یہ مسئلہ بھی حل ہو نہ سکا
اللہ علی ہے یا علی ہے مولا

مرثیہ

یہ مرثیہ سید علی حیدر صاحب نظم طبا طبائی کی موت پر لکھا گیا ہے۔ مرثیہ کے لئے مسدس کی ہیئت اس قدر مخصوص ہوگئی تھی کہ شاؔد نے غیر مذہبی مرثیہ کے لئے بھی اسی ہیئت کا استعمال کیا ہے۔

سائز $6\frac{1}{2}$″ × ۴″ تعداد اشعار ۴۸ ہے۔ مطبع برقی میں طبع ہوا۔ سنہ تصنیف درج نہیں ہے۔

نظم طبا طبائی سے مہاراجہ کو بے حد محبت اور عقیدت تھی وہ نظم کی شاعری اور نثر نگاری کا لوہا مانتے تھے اور ان کی بلند شخصیت سے متاثر تھے۔ نظم کی موت پر مرثیہ کے ابتدائی اشعار میں یوں نوحہ کیا ہے۔

تیغ الم سے آج مرا دل فگار ہے | خونِ جگر سے دیدۂ دل اشکبار ہے
مضطر ہے قلب جان حزیں بیقرار ہے | مخلوق نوحہ خواں ہے جہاں سوگوار ہے
دامنِ شکیب و صبر کا اشکوں سے بھر گیا | اونچا ہوا یہ پانی کہ سر سے گزر گیا

نظم طبا طبائیؒ کے کمال شعری کو ایک جگہ یوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے ۔

علامہ تھے ادیب تھے شیریں بیاں تھے | بیشک زمین شعر کے وہ آسماں تھے

نظم کی موت کو علم و فن کی موت ٹھیراتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

موت ایسے باکمال کی ہے علم و فن کی موت
ہے انجمن نواز کی موت انجمن کی موت
بلبل نہیں تو گل کی ہے رحلت چمن کی موت
ہاں جب سخن طراز نہ ہو ہے سخن کی موت
مرنے سے نظم کے ہوا دل شق ہزار حیف
بزم ادب کی اٹھ گئی رونق ہزار حیف

بعض مقامات پر جوش بیان انیسؔ کی یاد دلاتا ہے ۔

اک شور ہے جہاں سے علی حیدر اٹھ گئے
اس تیرہ خاکدان سے علی حیدر اٹھ گئے
دنیا کے بوستان سے علی حیدر اٹھ گئے
بزم سخنوران سے علی حیدر اٹھ گئے
نالہ لبوں پہ آتا ہے ہر ہر نفس کے ساتھ
اٹھا ہے میرا قافلہ بانگِ جرس کے ساتھ

شاعری کے اعتبار سے شادؔ کے اِس مرثیہ کی سطح ان کے دوسرے شعری کارناموں کے مقابلہ میں بلند ہے ۔ ان کے جذبات میں خلوص اور شدت ہے ۔ شاید اسی لئے ان کے بیان میں چستی اور ادبی شگفتگی ہے ۔ لفظوں کے درو بست، بیان کی چستی و روانی، جذبات کی گرمی اور اسلوب کی ادبیت میں میر انیسؔ کا فیضان شعری صاف جھلکتا ہے

نوحۂ شادؔ نوحۂ شادؔ حضرت امام حسینؑ علیہ السلام کی شہادت پر لکھا گیا ہے ۔ $8\frac{1}{2} \times 5\frac{1}{2}$ سائز کے ۱۵ صفحات پر مشتمل ہے ۔ تاج پریس حیدرآباد دکن میں طبع ہوا ۔ سنہ طباعت درج نہیں ہے ۔ مرثیہ گوئی میں شادؔ نے میر انیسؔ سے استفادہ کیا ہے ۔ اس کا ذکر "نوحہ شاد" میں وہ ایک جگہ اس طرح کرتے ہیں ۔

اس مرثیہ سے مجھ کو غرض شاؔد ہے ثواب
میں نے کیا انیسؔ سے اس فن کا اکتساب

ایک اور شعر میں مرثیہ گوئی میں اُنسؔ اور انیسؔ کے کمال شعری کا یوں اعتراف کیا ہے۔

اُنسؔ و انیسؔ مرثیہ میں نامدار تھے
ملک سخن کے شاؔد وہی تاجدار تھے

شاؔد نے اِس مرثیہ کے ابتدائی اشعار میں حضرت امام حسین علیہ السلام کے کردار اوصاف اور ان کی بلند حوصلگی کی تعریف کی ہے۔ ایک بند میں لکھتے ہیں۔

حق کو دیا نہ ہاتھ سے سر اپنا دے دیا
راہِ خدا میں جان کو اپنی فدا کیا
درگاہ حق میں شیوہ تھا تسلیم اور رضا
راضی رسول ان سے تھے خوشنود کبریا
وصف حسین کوئی کرے کیا مجال ہے
اس جا زبان ناطقہ خلق لال ہے

حضرت امام حسین علیہ السلام کے مخالفوں اور ان کے دشمنوں نے جو جو مظالم ڈھائے ان سب کا ذکر کر کے مہاراجہ نے اظہار افسوس کیا ہے اور دشمنوں پر ملامت کی ہے۔ یزید اور اس کی جماعت کے لئے بد دعا کی ہے کہ جس طرح انہوں نے حضرت امام حسین ع اور ان کے رفقاء پر مظالم ڈھائے ہیں اسی طرح یزید اور اس کی جماعت کا بھی خاتمہ ہو جائے۔

روندا گیا ہے جسم مطہر جو گھوڑوں سے
ارمان پورے دشمنوں کے دل کے اب ہوئے
یارب تو منتقم ہے سزا اس کی ان کو دے
اعدا کا خاندان۔ یوں ہی خاک میں ملے
مقہور بارگاہِ الہٰی یزید ہو
اور روسیاہ دونوں جہاں میں پلید ہو

اسی ضمن میں مہاراجہ نے اپنے مذہب اور مذہبی عقائد پر بھی روشنی ڈالی ہے اس سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

ہوں قوم کا سپاہی رہوں گا سپاہی میں
توحید میرا دین ہے دوں گا گواہی میں
صوفی ہوں اور عارف ذات الٰہی میں
اور ہوں طریق عشق میں اے شاد راہی میں
جیسا کہ اعتقاد مجھے انبیاء سے ہے
ویسا ہی اعتقاد مجھے اولیاء سے ہے

آخر میں شادؔ نے اپنی نیک نامی اور سرخ روئی کے لئے اس طرح دعا مانگی ہے۔

اپنے خدا سے دل سے دعا مانگ تو یہ شادؔ
بہر حسین و شیر خدا دل کی دے مراد
کر ذوالفقار قہر سے اعدا کا انسداد
اولادِ شادؔ شاد رہے عمر ہو زیاد
ایمان پر ہو خاتمہ دنیا میں آبرو
دل میں ہو عشق تیرا رہے تیری آرزو

الفاظ و تراکیب کی برجستگی، بندش کی چستی اور جذبات کی وارفتگی کے اعتبار سے مرثیہ "ماتم حسین" کے مقابلہ میں "نوحہ شادؔ" کا رنگ پھیکا نظر آتا ہے۔

نوحہ شمس الملک یہ مرثیہ شمس الملک کی موت پر لکھا گیا ہے جو ۵۸ اشعار پر مشتمل ہے۔ دکن ریویو ص ۱۶ تا ۱۹ نمبر ۲ - جلد ۲ ڈسمبر ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا ہے۔ مرثیہ کی ابتداء میں مہاراجہ نے دنیا کی بے ثباتی سے متعلق اشعار قلم بند کئے ہیں۔ چند اشعار درج ذیل ہیں۔

کوئی اس موت سے بچے کیوں کر — زندگی بھی ہے فتنۂ محشر
عیش دنیا کا حال ہے معلوم — آخرش رنج و غم ہے اس کا اثر
کیا ہے دنیا طلسم فانی ہے — کس طرح اس میں ہو بقا کا گزر

موت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس کو زمانے سے پرخاش ہے۔ نوجوان، بچے بوڑھے سبھی اس کا شکار بن کر تہ خاک چلے جاتے ہیں اس کے بعد ان کی کوئی خبر نہیں ملتی۔ موت کی حیات دشمنی اور تباہ کاری کے ذکر کے بعد مہاراجہ اپنے مرحوم دوست کے محاسن بیان

کرتے ہیں۔

شاد کا دوست اور خواجہ تاش — پاک دل نیک خو وفا پرور
یعنی رفعت مآب شمس الملک — چشم خورشید کا وہ نور نظر
اس میں شان محاسن اسلام — جلوہ گر تھی مگر بہ رنگ دگر
کفر و اسلام سے نہ تھا کچھ کام — تھی حقیقت پہ صرف اس کی نظر

اس طرح کئی اشعار میں شمس الملک کی سادگی، راست گوئی، ملنساری، بلند حوصلگی ہمت، شجاعت، سخاوت اور خاکساری جیسی اعلیٰ خوبیوں کو سراہا ہے۔ آخری اشعار میں شمس الملک کی جواں مرگی پر بڑے پُر درد انداز میں ماتم کیا ہے۔ زور بیان کی وجہ سے ان اشعار سے انیسؔ کا رنگ جھلکتا ہے۔

نوجواں موت کا شکار ہوا — ہو گیا ہر طرف بپا محشر
قرص خورشید چھپ گیا افسوس — دے گیا دوستوں کو درد جگر
اب کہاں جا کے اسکو ڈھونڈیں ہم — اب کہاں پائیں اس طرح کا بشر
اس کے مرنے کا سب کو ہے اندوہ — دوست دشمن سبھی ہیں خاک بسر
کس کو امید تھی جدائی کی — کیا خبر تھی ملے گا داغ جگر

مہاراجہ کا یہ مرثیہ بھی نظم طباطبائی کی موت پر کہے گئے مرثیہ کی طرح خلوص و محبت کے جذبات سے مملو ہے۔ اسی وجہ سے الفاظ و تراکیب کے بہاؤ میں زور اور روانی ہے۔ مذہبی مراثی کے مقابلہ میں مہاراجہ کے غیر مذہبی مراثی کی یہ کامیابی اس حقیقت کو واشگاف کرتی ہے کہ جب تک موضوع شاعر کے افکار و جذبات میں رس بس کر اس کی شخصیت کا جزو نہیں بن جاتا شاعری میں زندگی کی حرارت محسوس نہیں ہوتی۔

نوحۂ آصف پرشاد

شاد نے یہ نوحہ آصف پرشاد کی موت پر لکھا ہے جو ١٢٧ اشعار پر مشتمل ہے اور انتہائی درد انگیز ہے۔ اپنے دل کی کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

ایک میں ہوں کہ دلفگار ہوں میں — ایک میں ہوں کہ بیقرار ہوں میں
ایک میں ہوں کہ روز روتا ہوں — منہ کو اشکوں سے اپنے دھوتا ہوں
ایک میں ہوں کہ لب پہ ہے مرے آہ — ایک میں ہوں کہ ہوں بہ حال تباہ
غم سے فرزند کے ہے دل ناشاد — کس سے جا کے کروں فریاد
داغ تو ہیں الٰہی سینے میں — تو ہی سوراخ ہیں سفینے میں

داغ پر داغ یا الٰہی پناہ — ایک سے ایک بڑھ کے ہے جانکاہ
عمر کٹتی ہے آہ و زاری میں — شام سے صبح بے قراری میں

اسی سلسلہ میں اپنے مشرب اور مذہب کے بارے میں مہاراجہ لکھتے ہیں۔

نہ تو ہندو نہ میں مسلمان ہوں — بزم وحدت کی شمع ایمان ہوں
نہ ہوں کافر نہ میں نصارا ہوں — جو محقق ہیں ان کا پیارا ہوں
میں موحد ہوں اور عارف ہوں — نہیں ہوتا میں اپنی حد سے بروں
مجھ کو کافی ہے اک خدا کی ذات — ہے خلاصہ یہ جس کی موجودات

ان تمہیدی اشعار کے بعد غم اولاد کا وہی دکھڑا' آصف پرشاد کی ولادت' علالت علاج' دعا طلبی اور وفات غرض وہ سب کچھ منظوم کر دیا ہے جو وہ اپنی نثر میں لکھ چکے ہیں۔ اس تفصیل کے بعد بیٹے کی موت پر نوحہ کیا ہے۔

جی میں آتا ہے خوب سر پیٹوں — مار کے دھاڑیں خوب سا روؤں
مرغ بسمل کی طرح تڑپوں خوب — خاک پر گر کے ہائے لوٹوں خوب
جیب و داماں کو اپنے خاک کروں — خاک کوے کے اپنے سر پہ ملوں
خودکشی کا خیال آتا ہے — غم کلیجے کو کھائے جاتا ہے
جی بہلتا نہیں ہے اب گھر میں — رہ نوردی کا ہے جنوں سر میں
رات دن اس کا ہی تصور ہے — مثل آئینہ کے تحیر ہے

آخر میں شاد اپنے آپ کو صبر کی تلقین کرتے ہیں۔

قوم کا اپنی جو کھتری ہے — یعنی اے شاد جب سپاہی ہے
اور رکھتا ہے عارفانہ طریق — کہتے ہیں لوگ تجھ کو مرد لئیق
اور مذہب ہے صوفیانہ تیرا — باغ وحدت شراب خانہ تیرا
چاہیے تجھ کو یہ کہ صبر کرے — چاہے زندہ رہے کوئی کہ مرے
رہ تو راضی رضا پہ مولا کی — کر اطاعت ہمیشہ آقا کی
چھوڑ ہرگز نہ تو طریقت کو — جان لے اپنی تو حقیقت کو
یہی معراج ہے یہی ہے نجات — لاکھوں باتوں کی ہے یہی اک بات
ورد ہر وقت کر اس کا تو — وحدہ لا الٰہ الا ہو

رباعیات وقطعات

اردو میں رباعی کہنے کا رواج بھی ابتدا ہی سے رہا ہے۔ دکنی دور میں بھی یہ صنف سخن مروج رہی ہے شمالی ہند میں شعراء متقدمین کی زیادہ توجہ بالکلیہ طور پر غزل پر مرکوز رہی اس کے باوجود شاید تنوع کے لئے ہر شاعر نے کچھ نہ کچھ رباعیاں ضرور کہی ہیں۔ لیکن کسی شاعر نے بھی اس صنف کو کوئی خصوصی اہمیت نہیں دی۔ لکھنو اسکول میں مرثیہ گو شعراء خصوصاً انیس اور دبیر نے زیادہ رباعیاں کہیں۔ ان مرثیہ گو شعراء کے اثر سے اس صنف سخن کی مقبولیت بڑھی۔ پھر بھی چونکہ اس صنف کے محدود کینوس کی وجہ سے اس میں کسی طولانی مضمون کی گنجائش نہیں تھی اس لئے یہ صنف سخن قصیدہ، مثنوی اور غزل کی طرح برتی نہیں جا سکتی تھی۔ ادبی انقلاب کے بعد جب نظم نگاری کا رجحان بڑھنے لگا اور نظموں کے نئے نئے سانچے وضع ہونے لگے تو قدیم موضوعات شعری کے ساتھ قدیم شاعری کی ہئتیں بھی ٹکسال باہر ہونے لگیں۔ لیکن یہ عجب واقعہ ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں جب کہ خود غزل جیسی مقبول اور ہمہ گیر صنف سخن اپنی وقعت اور مقبولیت کھوتی جا رہی تھی امجد حیدرآبادی نے اردو شاعری میں پہلی مرتبہ رباعی کو مستقل ذریعہ اظہار بنایا۔ انھیں اس صنف سخن سے طبعی مناسبت تھی۔ رباعی کے اوزان ان کے ذوق نغمہ پر اس قدر چھا گئے تھے کہ وہ کبھی کبھی غزل تک رباعی کے وزن میں کہتے تھے۔ امجد ایک قادر الکلام صوفی شاعر تھے۔ انہوں نے رباعی کی فنی اور فکری روایات کو قائم رکھتے ہوئے اس صنف کو اس قدر چمکایا کہ اس اثر سے حیدرآباد کے شعراء خصوصاً اور شمالی ہند کے شعراء عموماً اس صنف سخن پر زیادہ توجہ دینے لگے۔ اسی زمانے میں جوش اور فراق دونوں نے بکثرت رباعیاں کہیں۔ ان دونوں نے اس صنف سخن کو اس کی موضوعی روایات سے ہٹ کر شبابیاتی اور مسائلی موضوعات کے لئے بڑی کامیابی کے ساتھ استعمال کیا۔ اسی زمانے میں شاد نے بھی بکثرت رباعیاں کہی ہیں۔ ان کا یہ میلان بلاواسطہ یا بالواسطہ یقیناً امجد کے اثر کا ممنون منت ہے۔ مقالہ نگار کو شاد کی رباعیات اور قطعات کے دس مجموعے دستیاب ہوئے۔

۱۔ صبح امید ۔ ۲۔ شگوفۂ بہار ۔ ۳ ۔ نذر سلطان ۔ ۴۔ رباعیات شاد
۵۔ رباعیات شاد ۔ ۶۔ آئینہ عقیدت ۔ ۷۔ رباعیات شاد ۔ ۸۔ ارمغان زیبا
۹۔ گلبن تاریخ ۔ ۱۰۔ نذر شاد۔

صبح امید

یہ قطعات ورباعیات کا مجموعہ ہے جو اعلیٰ حضرت غفران مکان نواب میر محبوب علی خاں کے سفر کلکتہ سے مراجعت کے موقع پر

لکھے گئے ہیں۔ ½۹ × ½۶ سائز کے ۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۳۱۷ھ ہجری م ۱۸۹۹ء میں محبوب پریس علاقہ پیشکاری میں طبع ہوا۔ ابتداء میں چار تاریخی قطعات ہیں جن میں تین فارسی ہیں چوتھا قطعہ اردو ہے جو درج ذیل ہے۔

دی تم کو لارڈ کرزن نے ایک خاص دعوت
اقبال و فتح مندی دونوں کا ہے نشاں یہ
کی عرض شاد نے یوں تاریخ سال ہجری
تجھ کو سفر مبارک ہو آصف زماں یہ

۱۷ ۱۳ ہجری

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لارڈ کرزن سے ملاقات کی غرض سے اعلیٰ حضرت مرحوم نے یہ سفر اختیار کیا تھا۔ ان کی واپسی پر مہاراجہ نے متعدد قطعات، رباعیات اور تاریخیں لکھی تھیں جن کو مجموعے کی شکل میں شایع کیا گیا ہے اس مجموعے میں صرف تین اردو رباعیاں ہیں بقیہ فارسی ہیں اردو رباعیاں درج ذیل ہیں۔

کلکتہ سے آصف جو دکن میں آئے
مانند بہاراں وہ چمن میں آئے
با فتح و ظفر شاد سفر سے آصف
المنتہ للہ وطن میں آئے

○

دیتا ہے دعا دل سے یہ شوال کا ماہ
سرسبز رہے باغ دکن تیرا شاہ
پامال عدو ہوں تیرے سبزہ کی طرح
تو سرخ رو اور شاد رہے آصف جاہ

○

محبوب علی کا ہے وہ اعلیٰ پایہ
کرسی یہ ہے تخت سلطنت کا پایہ
دربار میں آج ایک عالم ہے جمع
مجرے کو لسنت بھی ادب سے آیا

شگوفۂ بہار قطعات اور رباعیات کا یہ مجموعہ ۹" × ۶" سائز کے ۱۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ ٹائیٹل پر تاریخ طباعت درج نہیں لیکن اس مجموعے کی تمام رباعیاں اور قطعات ان شاہانہ عنایات پر بطور اظہار تشکر لکھے گئے ہیں جو سنہ ۱۳۲۷ھ م ۱۹۰۹ء میں مہاراجہ پر مبذول ہوئیں۔ اس لئے یہ مجموعہ ۱۳۲۷ھ یا اس کے بعد کے کسی قریبی سنہ میں زیور طبع سے آراستہ ہوا ہوگا۔ مجموعہ کا آغاز پیشگاہ خسروی سے ایک پیوندی آم زمرد کی سرفرازی پر لکھے ہوئے ایک قطعہ اور رباعی سے ہوا ہے۔ رباعی درج ذیل ہے۔

آصف سے عنایت جو ہوا آم اے شاد — اب تجھ کو خدا دے گا نرینہ اولاد
نعمت ہی نہیں ہے یہ کرامت بھی ہے — صد شکر کو ثمر دار ہوا نخل مراد

اس رباعی سے شاد کے جذبات تشکر کے اظہار کے ساتھ ساتھ مہاراجہ کی نرینہ اولاد کی آرزو کا بھی بڑے دلچسپ پیرائے میں اظہار ہوا ہے۔ اس کے بعد ۲۱/ جمادی الثانی ۱۳۲۷ھ کو پیشگاہ خداوند نعمت سے مہاراجہ کو ایک قبضۂ شمشیر عطا ہوا۔ جس کی سپاس گزاری میں شاد نے چار رباعیاں اور ایک قطعہ لکھ کر پیش کیا۔ ایک رباعی درج ذیل ہے۔

شہ نے جو فدائی کو یہ اعزاز دیا — خوش ہو کے غلام نے سر آنکھوں پہ لیا
جن لوگوں نے اک آگ لگا رکھی تھی — اس تیغ کے پانی نے انھیں سرد کیا

اس رباعی میں کوئی ادبی حسن تو نہیں ہے لیکن اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں نے مہاراجہ کے خلاف دربار میں کچھ ریشہ دوانیاں کی تھیں۔ جن کی طرف انہوں نے اس رباعی میں اشارہ کیا ہے۔

۲۳/ جمادی الثانی سنہ ۱۳۲۷ ہجری کو اعلیٰ حضرت نے پھر شاد کے یہاں آموں کا تحفہ بھیجا۔ اس کی شکر گزاری میں انہوں نے سات رباعیاں عرض کیں۔ ساتوں رباعیاں بہت سیدھی سادھی ہیں۔ جن میں جذبات عقیدت و تشکر کا بے ساختہ اظہار کیا گیا ہے۔ ایک رباعی میں پھر مہاراجہ شاد نے اپنے حاسدوں کی فتنہ پردازی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اکیس جو آم آج آصف سے ملے — سو غنچے مرادوں کے میرے شاد کھلے
حساد نے خار رشک کھائے کیا کیا — جب شہ سے اطاعت کے ملے مجھ کو صلے

۴۔ رجب سنہ ۱۳۲۷ ہجری کو حضور نے دو گھڑیاں مرحمت فرمائیں جن کے شکریہ میں مہاراجہ نے چار رباعیاں گزرانیں۔ ان رباعیوں میں انہوں نے لفظ "گھڑی" کی تکرار سے صنعت تجنیس کا لطف پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک رباعی درج ذیل ہے۔

گھڑیاں ہیں یہ وہ جن پہ دل و جاں نثار
ہے عمر کی گھڑیوں کا انھیں پر تو مدار
آتی ہے گھڑی گھڑی زباں پر یہ دعا
پل پل دیکھیں خوشی کی گھڑیاں سرکار

۹/ رجب سنہ ۱۳۲۷ ہجری کو اعلیٰ حضرت نے مہاراجہ کو شاہزادوں کی تصویریں عنایت فرمائیں جن کی سپاس گزاری میں انہوں نے سترہ رباعیاں پیش کیں۔ ان رباعیوں میں مہاراجہ نے اپنا زور بیان بھی دکھایا ہے۔ ایک رباعی یہ ہے —

آنکھوں میں سمائیں یہ وہ تصویریں ہیں | دل میں تڑ آئیں یہ وہ تصویریں ہیں
جوان کا نظارہ کرے اسکو اے شاد | تصویر بنائیں یہ وہ تصویریں ہیں

۱۰۔ رجب سنہ ۱۳۲۷ھ کو اعلیٰ حضرت مرحوم کے ایک شاہزادے کی سالگرہ کے موقع پر مہاراجہ نے نو رباعیاں عرض کیں۔ ان رباعیوں میں بھی مہاراجہ نے حسن بیان پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

نذر سلطان

رباعیات کا ایک اور مختصر مجموعہ ۱۳۲۹ ہجری م ۱۹۱۱ء یا اس کے بعد کے کسی قریبی سنہ میں بڑے اہتمام سے شایع ہوا ہے۔ مقالہ نگار کو جو نسخہ دستیاب ہوا ہے وہ ناقص الاول ہے اس لئے نہ تو اس مجموعہ کے نام کا پتہ چل سکا ہے نہ ہی یہ معلوم ہو سکا کہ یہ مجموعہ کس سنہ میں طبع ہوا۔ اس مجموعہ کا کوئی دوسرا نسخہ بھی دستیاب نہ ہو سکا۔ لیکن چونکہ اس مجموعہ کی تمام رباعیات کا تعلق سنہ ۱۳۲۹ھ کے واقعات اور شاہانہ سرفرازیوں سے ہے اور نواب میر عثمان علی خاں کی تخت نشینی کا سنہ یہی ہے اس لئے غالب گمان یہی ہے کہ یہ مجموعہ اسی سنہ میں طبع ہوا ہے۔ مہاراجہ شاد کی جو کتابیں دستیاب نہیں ہوئیں ان میں ایک نذر سلطان بھی ہے۔ چونکہ اس مجموعہ کی تمام رباعیاں بادشاہ وقت کی شکرگزاری اور سپاس گزاری میں ہیں اس لئے "نذر سلطان" اسی مجموعہ کا نام ہو سکتا ہے۔ رباعیات کا یہ مجموعہ ۹ × ۵½ سائز کے ۷۵ صفحات پر مشتمل ہے ابتداء میں تین قطعات اعلیٰ حضرت کی تخت نشینی کی تہنیت میں کہے گئے ہیں۔ پہلے قطعہ کے آخری مصرع "مبارک ہو سرکار مسند نشینی" سے تخت نشینی کا سنہ نکالا گیا ہے۔ اس مجموعہ کی رباعیوں کا موضوع نئے فرماں روا نواب میر عثمان علی خاں کی عنایات پر سپاس گزاری دعاگوئی اور اظہار وفاداری ہے۔ مجموعہ کے آغاز میں سولہ رباعیاں نئے بادشاہ کے شاد کے گھر رونق افروز ہونے سے متعلق ہیں۔ ان رباعیوں میں شاد نے مرحوم اعلیٰ حضرت کی جدائی اور ان سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے نئے فرماں روا کی تشریف آوری کو اپنے لئے بڑی دلجوئی اور سرفرازی سے تعبیر کیا ہے۔ ایک رباعی درج ذیل ہے۔

محبوب کے غم میں تھا بصد سوز و گداز
سمجھا تھا نہیں کوئی میرا اب دم ساز
عثمان علی خاں نے جلایا مجھکو
یہ لطف و کرم نہیں مگر ہے اعجاز

عطائے خلعت وجواہر پر سات رباعیاں کہی ہیں۔ عطائے تصاویر صاحبزادگان بلند اقبال پر دو رباعیاں لکھی ہیں۔ اسی طرح عطائے انبہ پر چھ رباعیاں بچوں کو کھلونوں سے سرفراز کرنے پر چھ رباعیاں اور اسٹشنری سے سرفراز کرنے پر سات رباعیاں عرض کی ہیں۔ جن میں آخری دو رباعیوں میں اپنی تنگ دستی اور قرض داری کا ذکر کیا ہے۔ مہاراجہ شاہ خرچ بھی تھے اور جود وسخا میں تو اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے اس لئے ہمیشہ قرضدار اور تنگ دست رہتے تھے جس کا ذکر انہوں نے اپنی نظم ونثر میں جگہ جگہ کیا ہے۔ آخری رباعی درج ذیل ہے۔

دین دار ہوں اس واسطے ہے دین کا بار
عادت نہیں ہے جو مانگوں ہمیشہ سرکار
تکیہ ہے توکل پہ خدا سے ہے امید
ہو جائے گا ادا سب جو چاہے کرتار

رباعیات شاد

یہ شاد کی رباعیات کا چوتھا مجموعہ ہے جو آرٹ پیپر پر شایع ہوا ہے اور متذکرہ بالا تین مجموعوں سے زیادہ ضخیم ہے۔ لیکن اس مجموعہ کا جو نسخہ مجھے ملا ہے اس کا بھی ٹائیٹل غائب ہے۔ اس لئے نہ اصل مجموعہ کے نام کا پتہ ہے نہ سنہ طباعت کا۔ البتہ پہلے صفحہ پر غلط نامہ کی فہرست کا عنوان "فہرست غلط نامہ رباعیات شاد" لکھا ہے۔ ممکن ہے اس مجموعہ کا نام "رباعیات شاد" ہی ہو اس قیاس کی تائید یوں بھی ہوتی ہے کہ رباعیات کے پانچویں اور ساتویں مجموعے کا نام بھی "رباعیات شاد" ہی ہے۔ اس مجموعہ کے آخر میں قطعات تاریخی کے عنوان سے جو قطعات دیئے گئے ہیں وہ سنہ ۱۲۹۶ ہجری م ۱۸۶۹ء سے ۱۳۲۹ ہجری م ۱۹۱۱ء تک مختلف سنین سے متعلق ہیں اس لئے یہ مجموعہ بھی نذر سلطان کی طرح ۱۳۲۹ ہجری یا اس کے بعد کے کسی قریبی سنہ میں شایع ہوا ہوگا۔ سائز ۹×۶" ہے۔

اس مجموعہ میں صفحہ نمبر ۱ سے صفحہ نمبر ۸ تک ۲۰۴ رباعیاں ہیں اس کے بعد قطعات ہیں جو ۳۰ صفحات پر مشتمل ہیں تیسرے حصے میں قطعات تاریخی ہیں جو ۲۱ صفحات پر مشتمل ہیں اس مجموعہ میں مہاراجہ نے یہ اہتمام کیا ہے کہ رباعیات اور قطعات کو ردیف وار ترتیب دیا ہے اور ہر ردیف میں مختلف عنوانات قائم کر کے ہر عنوان کے تحت رباعیاں دی ہیں اور ان عنوانات میں بھی موضوع کی مناسبت کا لحاظ رکھا ہے۔ چنانچہ ردیف الف کے عنوانات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ توحید۔ ۲۔ تصوف ۔ ۳۔ نعت ۔ ۴۔ منقبت ۔ ۵۔ عزائے حضرت سیدنا امام حسین علیہ السلام ۔ ۶۔ مدح سلطان غریب نوازؒ ۔ ۷۔ مدح حضرت امیر خسروؒ ۔ ۸۔ مدح ظل اللہ ۔ ۹۔ واپسی ظل اللہ از سفر ۔ ۱۰۔ تشریف آوری ظل اللہ ۔ ۱۱۔ یادِ زعفران مکان ۔ ۱۲۔ دعا ۔ ۱۳۔ اعتقاد خود ۔ ۱۴۔ عشق ۔ ۱۵۔ ہجر ۔ ۱۶۔ عطایا۔ ۱۷۔ حضوری دربار شاہ ۔ ۱۸۔ درضمن شعر گوئی خود تمنائے شاہ ۔ ۱۹۔ تمنائے رضامندی بادشاہ ۔ ۲۰۔ تمنائے عزت از بادشاہ ۔ ۲۱۔ پند ۔ ۲۲۔ تاسف بر زندگی ۔ ۲۳۔ انجام زندگی ۔ ۲۴۔ حالتِ زندگی ۔ ۲۵۔ جہانی احباب ۔ ۲۶۔ یاد وطن ۔ ۲۷۔ واپسی خود از سفر دہلی ۔ ۲۸۔ حالت خود ۔ ۲۹۔ ذکر طلب شےء۔

اس مجموعہ میں (۲۷) رباعیات "شگوفۂ بہار" کی درج ہیں۔ سترہ رباعیات "نذر سلطان" سے لی گئی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مجموعہ کو مرتب کرتے وقت شاد نے پچھلے مجموعوں میں سے بھی پسندیدہ رباعیاں اس مجموعہ میں شامل کرلی ہیں اس مجموعہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی رباعیاں صرف مدح سلطان کے لئے وقف نہیں ہیں اس میں توحید، نعت اور منقبت کے علاوہ زندگی کے مختلف مسائل پر کہی گئی رباعیات بھی شامل ہیں چند رباعیات حسب ذیل ہیں۔

پند

تو مال کو کہتا ہے کہ یہ ہے میرا
تیرا نہیں کہیں وہم نے تجھ کو گھیرا
جب سر پہ اجل آئے گی اس دم اے شاد
رہ جائے گا سب یہیں یہ میرا تیرا

حالت زندگی

خنداں نہ کوئی عدم سے آتے دیکھا
لیکن گریاں یہاں سے جاتے دیکھا
اے شاد جہاں بے بقا میں ہم نے
ہر فرد بشر کو خاک اڑاتے دیکھا

حالتِ خود

اے شاد نہ بچپن میں خوش اوقات ہوا
آیا جو شباب مورد آفات ہوا
جب پیر ہوا ہوا تو پیر کامل
صد شکر کہ اب پیر خرابات ہوا

مہاراجہ تنوع پسند واقع ہوئے تھے۔ زندگی کے کسی ایک میدان میں وہ مقید نہیں رہ سکتے تھے۔ رباعیات میں مضامین کا یہ تنوع ان کے مزاج کی رنگارنگی کی عکاسی کر رہا ہے۔

رباعیات شاد

رباعیات کا یہ مجموعہ ۷ × ۵ سائز کے (۱۲۹) صفحات پر مشتمل ہے ٹائیٹل پر سنہ طباعت درج نہیں۔ نظامی پریس بدایوں میں طبع ہوا۔ اس مجموعہ میں (۲۵۷) رباعیاں فارسی ہیں۔ یہ سب رباعیاں ۱۳۴۱ ہجری م ۱۹۲۲ء اور ۱۳۴۲ ہجری م ۱۹۲۳ء میں بمقام مسند مبارک کہی گئی ہیں۔ اس مجموعے میں شاد نے سنہ تاریخ اور دن کی وضاحت کے ساتھ رباعیاں لکھی ہیں۔ اس مجموعہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کوئی رباعی بادشاہ سے متعلق نہیں ہے۔ ان رباعیوں کے موضوعات توحید، تصوف، اخلاق حکمت اور کیفیات سے متعلق بھی ہیں۔ جیسے ایک رباعی میں وہ اپنے فرزند خواجہ پرشاد کو بصارت عطا کرنے کے لئے بارگاہ ایزدی میں دعا کرتے ہیں۔

قدرت ہے تری بہت بڑی اے مولا
حاجت مری سامنے ہے اس کے ادنیٰ
عاصی کا جو فرزند ہے خواجہ پرشاد
اللہ تو کر جلد بصر اس کو عطا

اس مجموعہ سے چند رباعیاں بطور نمونہ درج ہیں۔

جس کو تو سمجھتا ہے کہ ہے تیرا وجود
غفلت ہے تیری شاد وہ ہوگا مفقود
تو اپنے تعین کو بھلا دے پھر دیکھ
اس شکل میں تری کون یاں ہے موجود

دنیا کے بدلتے ہیں ہمیشہ احوال
ہو جاتا ہے ہر شے کا یقین وہم و خیال
شادی ہو جہاں میں شاد تجھ کو یا غم
اس کی نہ خوشی کر تو نہ کر اس کا ملال

تصوف مہاراجہ کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ صوفیاء کے مسلک کو وہ اپنا مذہب سمجھتے تھے۔ اسی لئے ان کی شاعری میں تصوف کے مضامین کی بہتات ہے۔ تصوف اردو شاعری کا روایتی موضوع رہا ہے اس لئے صوفیانہ مضامین کو بیان کرنے کے اسالیب و علائم کی بھی ایک روایت قائم ہو گئی ہے۔ چنانچہ صوفیانہ شاعری میں تجربہ کی انفرادیت شاذ و نادر ہی نظر آتی ہے۔ شاد کی صوفیانہ شاعری کا رنگ و آہنگ بھی کم و بیش وہی ہے جو عام طور پر صوفیانہ شاعری میں نظر آتا ہے۔ مگر جہاں وہ تصوف کی نری اصطلاحات پر اتر آتے ہیں تو ان کی شاعری مسائل کی تفہیم و تشریح کی کوشش معلوم ہونے لگتی ہے۔ جب وہ رباعی کے مختصر سانچے میں اصطلاحات برتنے لگتے ہیں تو صنف کی تنگ دامانی کی وجہ سے ہر اصطلاح گھٹ کر رہ جاتی ہے۔ البتہ اس صنف میں حکیمہ مضامین کے بیان کرنے میں مہاراجہ نے بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔

آئینۂ عقیدت آئینۂ عقیدت مہاراجہ کی رباعیوں کا چھوٹا مجموعہ ہے جو ۲۲×۴ ½ سائز کے ۷۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ بہ اہتمام ابو الاشرف مجید آغائی ابو العلائی چشتیہ پریس چھتہ بازار میں طبع ہوا۔ ٹائٹیل پر سنہ طباعت درج نہیں ہے۔ لیکن مجموعہ کے آخر میں ابو العلائی صاحب نے ایک قطعہ لکھا ہے جس کے آخری مصرع میں سنہ فصلی میں تاریخ طباعت نکالی ہے۔

درس دفا ہے اے شاد آئینۂ عقیدت

۱۳۴۲ ف

اس مجموعہ میں (۵۰) رباعیاں (۱۲) قطعات اور ایک قصیدہ شامل ہے صرف ایک رباعی اور ایک قطعہ فارسی ہے بقیہ اردو ہیں ابتداء میں ابوالاشرف مجید آغائی ابو العلائی کا لکھا ہوا مقدمہ ہے جو نو صفحات پر مشتمل ہے اس میں انہوں نے مہاراجہ کی بے لوث سیاسی خدمات اور بادشاہ وقت کی اطاعت اور فرماں برداری جیسی صفات کو سراہا ہے۔ آخر میں مہاراجہ کی شاعرانہ خصوصیات کے بارے میں لکھتے ہیں۔

" طرز بیان کی بے ساختگی، بندش کی چستی، حسن تخیل، زبان کی سلاست خداداد چیزیں ہیں۔ دائرہ صداقت میں رہ کر اس قدر جولانیاں دکھانا حضرت

شاد مدظلہ کی ایک بلند پایہ شاعرانہ طبع کا انداز خاص ہے۔ اور ہر شعر سے
آپ کی کہنہ مشقی، اسلوب بیان اور مناسبت لفظی برابر ظاہر ہے۔ اس کو پڑھنے
کے بعد خود بہ خود ہر شخص بہ آسانی یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ یہی ذات ستودہ
صفات آپ کی ہے جو لایق ستایش و آفریں ہے اور ملک و مالک کی بہی خواہ کہلانے
کی بدرجہ اتم مستحق ہے۔"

آئینہ عقیدت کی (۴۲) رباعیات "نذر سلطان" سے نقل کی گئی ہیں۔ نیز تین اردو قطعات ایسے ہیں جو "نذر سلطان" میں بھی ملتے ہیں۔ مجموعہ کے آخر میں نواب ضیاء یار جنگ بہادر ضیا کی تقریظ ہے۔ نواب ضیاء یار جنگ بہادر عربی اور فارسی کے بڑے عالم اور اردو کے اچھے ادیب اور شاعر تھے۔ تقریظ میں وہ لکھتے ہیں۔

"یہ رسالۂ منظوم درحقیقت سپاس نامہ ہے۔ بہ اعتبار رتبہ شعر کے اگر میں یہ
کہوں کہ یہ ایک بے مثل و لاجواب کتاب ہے تو مجھ پر بھی نقادوں کا وہی اعتراض
ہوگا کہ اس نے غلط کہا ہے جس کو میں پسند نہیں کرتا۔ میں اس امر کے کہنے کے لئے
آمادہ نہیں ہوں کہ بہ لحاظ فن شاعری کے یہ ایک بے مثل و لاجواب کتاب ہے
مگر اسی کو اس ادعا کے ثبوت میں پیش کرتا ہوں کہ طبقہ امراء میں آج
ایسا کہنے والا نہیں ہے۔"

• تقریظ کے بعد "قطعات و تواریخات" کے عنوان سے مندرجہ ذیل اہل قلم حضرات کے قطعات اور تاریخیں درج ہیں۔

۱۔ مولانا الحاج محمد عبداللہ خاں صاحب کامل۔ ۲۔ نرسنگ راج بہادر عالی
۳۔ ماہر القادری۔ ۴۔ فانی بدایونی۔ ۵۔ محمد جہانگیر مجید آغائی ابوالعلائی

اس میں کامل صاحب کا قطعہ فارسی ہے بقیہ اردو ہیں۔ آئینۂ عقیدت کی (۴۲) رباعیات، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے "نذر سلطان" میں درج ہیں۔ اس لئے اس مجموعہ کی تقریباً تمام رباعیوں کے موضوعات وہی ہیں جو "نذر سلطان" کے ہیں۔ البتہ تین رباعیات جو مہاراجہ نے عہدہ مدار المہامی سے استعفیٰ دینے کے بعد لکھی ہیں وہ اس مجموعے کے لئے بالکل نئی ہیں رباعیات درج ذیل ہیں۔

صد شکر کہ مشہور ہوں فدوی حضور	میں گرچہ ہوں سرکار کے قدموں سے دور
ہر حال میں ممنون ہوں اور ہوں مشکور	کام آئیگی اک روز عقیدت میری

ہر چند کہ منصب بھی ہے اور ہے جاگیر
دوری سے حضوری کی مگر ہوں دلگیر

گو لاکھ عدو کہیں خطادار مجھے
شاہا ہے مگر خدا کہ ہوں بے تقصیر

خدمت کے چلے جانے کا کچھ بھی نہیں غم
قدموں سے جو دوری ہے اس کا ہے الم

خود تو ہی کر انصاف میرے ان داتا
بندے ترے کہلا کے کہاں جائیں ہم

ان رباعیوں سے مہاراجہ کے اس اضطراب اور الجھن کا اندازہ ہوتا ہے جو صدارت عظمیٰ سے مستعفی ہونے کے بعد ان کے دل و دماغ میں پیدا ہو گئے تھے۔ مہاراجہ کی زندگی کا یہ دور شاید ان کی زندگی کا سب سے زیادہ تلخ و تاریک دور رہا ہے۔

رباعیات شاد

مہاراجہ کی رباعیوں کا یہ ساتواں مجموعہ ہے سنہ ۱۳۵۸ ہجری م ۱۹۲۷ء میں عہد آفریں برقی پریس حیدرآباد دکن میں طبع ہوا۔ سائز $\frac{1}{2}$۵" × ۴" ہے۔ اس مجموعہ میں (۱۹۰) رباعیاں ہیں ہر رباعی ایک علٰحدہ صفحہ پر لکھی ہوئی ہے اور تمام رباعیاں اردو ہیں۔

ابتداء میں مسعود علی محوی صاحب کا لکھا ہوا چار صفحات کا مختصر سا دیباچہ ہے۔ جس میں محوی صاحب نے رباعی کی تعریف۔ اس کے مخصوص اوزان اور ردیف و قافیہ وغیرہ کے بارے میں لکھنے کے بعد بتایا ہے کہ رباعی اہلِ ایران کی ایجاد ہے۔ اور رباعی کو معراج کمال پر پہونچانے والے لکھنو کے مرثیہ گو شعراء انیس و دبیر اور ان کے جانشین ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے مہاراجہ کے علمی اور ادبی ذوق کو ان الفاظ میں سراہا ہے۔

> "عالی جناب راجہ راجایاں مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنت کے سی۔ آئی۔ ای۔ جی۔ سی۔ آئی۔ ای۔ ایل۔ ایل۔ ڈی۔ سابق صدر اعظم باب حکومت سرکار نظام دام اقبالہ کو جو شغف اور دلچسپی ادبیات اور خصوصاً شعر سے ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ عالی جناب ممدوح اس فن کے بڑے سرپرست اور پورے ماہر ہیں اور ہر صنف شعر پر کامل قدرت رکھتے ہیں۔"

رباعیات شاد کے پانچویں مجموعہ کی طرح اس مجموعہ میں کوئی رباعی ایسی نہیں ملتی جو بادشاہ کی تعریف سپاس گزاری یا اظہار تشکر کے لئے لکھی گئی ہو۔ بلکہ تمام رباعیات میں وحدت الوجود، خودی، عرفان، فنا و بقا، رسالت، توحید اور دیگر مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی مضامین باندھے گئے ہیں

مہاراجہ ہندو مسلم اتحاد کے شدت سے حامی تھے انہوں نے اس موضوع پر کئی مستقل مضامین بھی لکھے ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی آپس کی نا اتفاقی کے بارے میں لکھتے ہوئے عارف کا مقام بتایا ہے۔

ہندو ہیں کسی راہ پہ اے شاد اڑے　　مسلم ہیں کسی راستے پہ جا کے کھڑے
عارف تو پہنچ چکے جہاں جانا تھا　　"میں تو" میں قیامت کے پڑے ہیں جھگڑے

مہاراجہ کو جہاں سری کرشن جی سے والہانہ محبت تھی وہیں وہ آنحضرت صلعم سے بھی بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے نعتیہ اشعار بکثرت کہے ہیں ذیل کی رباعی بھی نعت میں کہی ہے۔

ہاں بھیجو رسول پہ درود اور سلام　　وہ جانب حق سے لائے ہیں شاد پیام
ہیں مظہر و مظہر وہ خدا کے اے شاد　　احمد ہے لقب اور محمدؐ ہے نام

رباعی کا مخصوص فن ہے۔ اس کے اوزان مقرر ہیں پہلے دو ہے اور چوتھے مصرع کا نہایت درجہ چست ہونا ضروری ہے۔ تیسرے مصرع کا وزن، عموماً لاحول ولا قوۃ الا باللہ پر ہوتا ہے۔ اس لئے اس مصرع کی بندش میں جھول ہوتا ہے۔ مضمون کے اعتبار سے اس میں تشنگی رکھی جاتی ہے۔ چوتھے مصرع پر رباعی کے پورے مضمون کی تان ٹوٹتی ہے۔ رباعی کا چوتھا مصرع جس قدر چست اور مکمل ہوتا ہے اسی قدر رباعی میں تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ مہاراجہ شاد رباعی کے فن سے واقف ہیں اور اور اس پر قدرت بھی رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان کی متعدد رباعیاں رباعی کے اونچے سے اونچے معیار پر بھی کامیاب کہی جا سکتی ہیں۔ لیکن اس کو کیا کیجیئے کہ مہاراجہ ہر صنف سخن تھوڑی عجلت میں سر انجام کرتے ہیں اس لئے جو کمال ریاض سے پیدا ہوتا ہے مہاراجہ کے کلام میں پیدا نہیں ہو سکتا۔

ارمغان زیبا یہ کتاب ۷ × ۵ سائز کے ۱۵ صفحات پر مشتمل ہے سنہ ۱۸۹۵ء میں بہ اہتمام ہیرالال نشاط مطبع برہانیہ حیدرآباد دکن میں طبع ہوئی۔ یہ اردو اور فارسی قطعات اور قصائد کا مجموعہ ہے۔ ابتداء میں ایک قطعہ اعلیٰ حضرت غفران مکان کی شان میں کہا گیا ہے۔ دوسرا قصیدہ ہے جو فارسی میں ہے۔ یہ قصیدہ اعلیٰ حضرت کے شہزادہ بلند اقبال نواب میر غلام عبدالقادر علی خاں کی ولادت پر لکھا گیا ہے۔ اس قصیدہ کے (۲۰) اشعار ہیں دوسرے دو قصائد بھی انھیں کی ولادت پر لکھے گئے ہیں جو اردو میں ہیں۔ پہلا قصیدہ (۹) اشعار پر مشتمل ہے اور دوسرا قصیدہ (۱۷) اشعار پر مشتمل ہے۔

قصائد کے بعد ۸ فارسی قطعات ہیں جو شہزادہ بلند اقبال کی ولادت ہی پر لکھے گئے ہیں۔ فارسی قطعات کے بعد دو اردو تاریخی قطعات ہیں ایک قطعہ درج ذیل ہے۔

خسرو ملک دکن کے گھر میں　　ہوا خورشید منور طالع
شاد کے دل سے یہ نکلی تاریخ　　قرۃ العین وسکندر طالع
۱۳۱۲ھ

اس کے بعد مہاراجہ نے ارمغان زیبا کی تاریخ طباعت لکھی ہے جو فارسی میں ہے۔ آخری

چار قطعات رائے ٹھاکر پرشاد شوقؔ کے لکھے ہوئے ہیں۔ ان میں تین فارسی اور ایک اردو ہے۔

اردو قطعہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔

قصائد تواریخ یہ طبع کر گئے	سعادت جو کی شاد صاحب نے حاصل
لکھی شوقؔ نے اس کی تاریخ طبعی	چھپا ہدیہ خسرو شاہ عادل
	۱۲ ۱۳ھ

مظفر الدین صاحب نے دو قطعات تاریخ لکھے ہیں۔ پہلا فارسی اور دوسرا اردو میں ہے

گلبن تاریخ یہ مجموعہ $\frac{1}{2}$۷" × $\frac{1}{2}$۵" سائز کے ۲۲ صفحات پر مشتمل ہے سنہ ۱۳۱۳ ہجری م ۱۸۹۵ء میں بہ اہتمام رائے ٹھاکر پرشاد شوق مطبع برہانیہ حیدرآباد دکن میں طبع ہوا۔ ابتداء میں تین اردو رباعیاں ہیں جو اعلیٰ حضرت غفران مکان کی مدح میں لکھی گئی ہیں۔

پہلی رباعی درج ذیل ہے۔

حضرت کا غلام خانہ زاد آتا ہے	ہاں واصف رزنگ کیقباد آتا ہے
ہو نذر قبول میرے پیارے آقا	تحفہ لئے تاریخ کا شاد آتا ہے

رباعیات کے بعد اردو قصیدہ صنعت توشیخ میں لکھا گیا ہے جو ۵۸ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ قصیدہ بھی اعلیٰ حضرت کی شان میں کہا گیا ہے۔ دوسرا قصیدہ بھی صنعت توشیخ میں لکھا گیا ہے۔ یہ فارسی میں ہے اور (۱۵) اشعار پر مشتمل ہے یہ قصیدہ نواب میر غلام محی الدین علی خاں کی ولادت کی تہنیت کے موقع پر لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد چار فارسی قطعات ہیں جو نواب میر غلام محی الدین علی خاں کی ہی ولادت کے موقع پر لکھے گئے ہیں۔

قطعات کے بعد دو اور اردو قصائد ہیں جو شہزادہ بلند اقبال مذکور کی ولادت کے موقع پر موزوں ہوئے ہیں۔ پہلا قصیدہ (۳۰) اشعار پر مشتمل ہے۔ دوسرا قصیدہ (۲۳) اشعار پر مشتمل ہے۔ قصائد کے بعد دو اردو قطعات ہیں۔ یہ اردو قطعات بھی نواب میر غلام محی الدین علی خاں کی ولادت پر لکھے گئے ہیں۔ آخر میں تین قطعات تاریخی ہیں۔ ایک قطعہ مظفر الدین صاحب کا لکھا ہوا ہے اور دو قطعات رائے ٹھاکر پرشاد شوقؔ کے لکھے ہوئے ہیں

نذر شاد "نذر شاد" قطعات و رباعیات کا مجموعہ ہے جو ۸" × $\frac{1}{2}$۵" سائز کے ۱۴ صفحات پر مشتمل ہے محبوب پریس علاقہ پیشکاری سے شائع ہوا۔ سنہ تصنیف اور سنہ طباعت درج نہیں۔ ابتداء میں پانچ اردو قطعات ہیں جو اعلیٰ حضرت غفران مکان کی مدح میں لکھے گئے ہیں ایک قطعہ بطور نمونہ دیا جاتا ہے۔

اے شاہ سلامت رہو با حشمت و جاہ — ہو فضل خدا سے تیرا ملکوں میں راج

فدوی در دولت کا نمک خوار قدیم — دیتا ہے دعا دل سے وزیر افواج

رباعیات اور قطعات کے بعد (۱۳) تاریخیں ہیں جو اعلیٰ حضرت کے شکار شیر کے موقع پر کہی گئی ہیں۔ تاریخوں کے بعد (۲۲) قطعات تاریخ در رباعیات ہیں۔ یہ اعلیٰ حضرت کی شکار سے واپسی کے موقع پر کہے گئے ہیں۔

ان مجموعوں میں جس قدر بھی قطعات ہیں سب کے سب مدحیہ ہیں۔ ان میں سے بیشتر میں تاریخ کہی گئی ہے۔ یہ سب قطعات چار مصرعوں پر مشتمل ہیں۔ اس لئے ان میں اور رباعیات میں صرف وزن کا فرق ہے۔ ادبی انقلاب سے پہلے تسلسل بیان کے لئے مثنوی اور قطعہ دو ہی اصناف سخن مخصوص تھے۔ مثنوی عموماً طویل موضوعات کے لئے برتی جاتی تھی اور قطعہ مختصر موضوع کے لئے برتا جاتا تھا۔ ادبی انقلاب کے بعد حالی نے مختلف موضوعات کے مسلسل بیان کے لئے ان دونوں اصناف کو مقبول بنانے کی کوشش کی لیکن مہاراجہ شاد کی قطعہ نگاری حالی سے متاثر نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ وہ عموماً تاریخ گوئی کے مقصد سے چار مصرعوں کا قطعہ لکھتے ہیں اس لئے صنف قطعہ کے فنی خصائص نمایاں نہیں ہو سکے۔

ہندی شاعری

مہاراجہ نے ہندی زبان میں بکثرت ٹھمریاں، کافیاں، بھجن، خیال اور بارہ ماسے مختلف دھنوں میں لکھے ہیں۔ ان کے ہندی کلام کے دو مجموعے "نغمۂ شاد" اور "ترانۂ شاد" کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ یہ شاعری برج بھاشا میں کی گئی ہے اور تمام شعری روایات بھی برج بھاشا ہی سے لی گئی ہیں۔ مہاراجہ کے اس کلام کا جائزہ مقالہ کے حدود سے خارج ہے۔ تاہم ان مجموعوں میں دو تین چیزیں اردو میں بھی کہی گئی ہیں مثلاً نغمۂ شاد مطبوعہ ۱۳۲۵ھ م ۱۹۰۵ء کی ابتداء حمد سے کی گئی ہے۔ جو ایمن کی دھن میں ہے۔ لیکن حمد اردو میں کہی گئی ہے۔ صرف ایک مصرع میں اردو ضمیر تنکیر "کوئی" کی جگہ برج کی ضمیر تنکیر "کوؤ" استعمال کی ہے۔ اسی طرح "نہیں" کی جگہ "ناہیں" اور مقطع میں لفظ "غم" کو "گرج" لکھا ہے۔

صاحب تیرے گھر سب کچھ ہے تو قادر ہے سب کا
تو ہے دانا تو ہے بینا تو عالم کا داتا
ظاہر تو ہے باطن تو ہے اول آخر تو ہے
گل گلشن میں گل میں بو ہے ناہیں کوؤ برج دوجا
تیرے در پر عاجز بندہ شاد گرج لایا ہے
کر دے احمد خواجہ کے صدقے سے اس کو پورا

اسی طرح "غزل بہ زبان بھاکا" میں اردو اور برج کی ملی جلی زبان استعمال کی ہے۔

نثار اپنے من کو کیا چاہتا ہوں — تیرا بندہ خواجہ بنا چاہتا ہوں
مرے برج راج اب تو رکھو لاج میری — من اپنا میں تو کو دیا چاہتا ہوں

نثر

مقالات و مضامین فرانسیسی ادیب مانٹین کے (ESSAYS) جن خصوصیات کے حامل تھے امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ خصوصیات بدلتی گئیں۔ مانٹین کے انتقال کے بعد انگلستان کے ادیب اور فلسفی بیکن نے مانٹین کے اتباع میں جو (ESSAYS) لکھے ان کا نام اس نے "افکار پریشان" رکھا۔ اس کے باوجود مانٹین کے (ESSAYS) کے برخلاف بیکن کے (ESSAYS) میں بڑا ربط وتسلسل ہے اور مانٹین کی سادگی اور خوش طبعی کے برخلاف بیکن کے (ESSAYS) فلسفیانہ افکار سے بوجھل ہیں ویسے ہر زمانے میں انگریزی ادب میں مانٹین کے (ESSAYS) جیسے ادب پارے بھی لکھے جاتے رہے لیکن عموماً (ESSAYS) کے نام سے مختلف سنجیدہ موضوعات اور سنجیدہ علمی مسائل پر رائے زنی اور خیال آرائی کی جاتی رہی۔ اسی لئے انگریزی ادب میں (ESSAYS) کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک (FORMAL ESSAYS) یعنی رسمی انشائیہ جس کو ہم اپنی سہولت کے لئے مقالہ کہہ سکتے ہیں۔ دوسری قسم (FAMILIAR ESSAYS) کی قرار دی گئی ہے جس کو ہم تخفی انشائیہ کہہ سکتے ہیں۔ اردو میں سہولت کے لئے پہلی قسم کو مقالہ اور دوسری قسم کو انشائیہ یا مضمون کہنا مناسب ہے۔

اردو میں مقالہ نگاری کا آغاز سنہ ۱۸۵۷ء کے ادبی انقلاب سے پہلے ہی ہو چکا تھا
ادبی انقلاب کے بعد سرسید اور ان کے رفقاء نے مقالہ نگاری
پر باقاعدہ توجہ دی۔ ان ادیبوں نے مقالوں کے علاوہ چند اچھے انشائیے لکھنے میں بھی کامیابی حاصل کی۔ ادبی انقلاب کے ان علم برداروں کے بعد کے دور میں مہدی افادی ایک اچھے انشائیہ نگار سمجھے جا سکتے ہیں۔ ان کے مقالوں میں بھی انشائیوں کا لطف بیان پیدا ہو گیا ہے۔ جنگ عظیم کے بعد کے ادیبوں کی بیشتر توجہ مقالہ نگاری پر رہی۔ تاہم ان ادیبوں میں خواجہ حسن نظامی، سلطان حیدر جوش، سجاد حیدر یلدرم نے بہترین انشائیے بھی تحریر کئے گذشتہ تیس چالیس سال کا زمانہ ہندستان میں سیاسی سماجی اور مذہبی تحریکوں کے اژدہام کا زمانہ ہے ان مقاصد کے لئے ادیبوں نے مقالہ نگاری سے بڑا کام لیا ہے اور زندگی کے ہر پہلو پر بکثرت مقالے تحریر کئے ہیں۔

مہاراجہ کشن پرشاد کا تعلق ہندستان کے اسی بحرانی دور سے ہے۔ چونکہ مہاراجہ شاد نے شعوری طور پر نظم و نثر کی ہر صنف میں زور آزمائی کی کوشش کی ہے اس لئے ان کی مقالہ نگاری کو بھی ان کی اسی تنوع پسندی پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ لیکن مہاراجہ غور و فکر کرنے والے انسان تھے ان کے ہاں زندگی کا ایک خاص تصور تھا۔ ان کے مسلک میں بڑی وسعت تھی اس لئے اگر ان میں تنوع پسندی نہ بھی ہوتی تب بھی مقالہ نگاری پر توجہ دینا ان کے لئے فطری بات تھی۔

حیرت تو اس پر ہے کہ مہاراجہ نے انشائیہ کا کوئی نمونہ نہیں چھوڑا۔ حالانکہ ان کے تخیل کی جولانی سے اچھی انشائیہ نگاری کی توقع کی جاسکتی تھی۔ ان کی نثری تخلیقات میں سے "فریاد شاد" اور "جذبات شاد" دو ایسی تخلیقات ہیں جن میں انشائیہ کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ لیکن "فریاد شاد" کے ساتھ ایک سفرنامہ کو اس طرح منسلک کیا ہے کہ اونٹ کے گلے میں باندھی ہوئی بلی اونٹ سے زیادہ قیمتی ہوگئی ہے۔ جذبات شاد کے ابتدائی صفحات جن میں مہاراجہ نے اپنی شخصیت اپنے معتقدات اور اپنے تصورات کو سمجھایا ہے ان میں انشائیہ کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں لیکن اس کے بعد اولیاء اللہ کے حالات اور گلبرگہ کے سفر کی روداد کو اس طرح نتھی کیا ہے کہ ان کی یہ تحریر بھی انشائیہ کے حدود سے نکل گئی ہے۔

جہاں تک مقالہ نگاری کا تعلق ہے شاد ایک کامیاب مقالہ نگار کہے جاسکتے ہیں ان کے مقالوں میں عام طور پر طوالت کے ساتھ ساتھ معلومات کی پیش کشی میں مباحث کی تقسیم اور ترتیب کا بڑا سلیقہ ملتا ہے۔ ان کا ہر مقالہ کسی نہ کسی اخلاقی نقطۂ نظر کو پیش کرتا ہے اور مجموعی طور پر سب مقالے ان کی وسیع المشربی، رواداری انسان دوستی جیسی اعلیٰ اخلاقی قدروں کو پیش کرتے ہیں۔

شاد کے مندرجہ ذیل مقالات دستیاب ہوئے ہیں۔

۱۔ دسہرا ۔ ۲۔ ہندو بھائیوں سے خطاب ۔ ۳۔ معراج ترقی ۔ ۴۔ کرشن کلا۔
۵۔ فریاد شاد ۔ ۶۔ آزادی ۔ ۷۔ سوریہ پرکاش ۔ ۸۔ رن بیر ۔ ۹۔ گیان درپن ۔
۱۰۔ دین حسین ۔ ۱۱۔ نور چشم ۔ ۱۲۔ موتیوں کی لڑی ۔ ۱۳۔ ارض الرمل۔

دسہرا

یہ مقالہ رام چندرجی کی بہادری کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔ جو ۳۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ سنہ تصنیف کا پتہ نہیں چلتا۔ محبوب پریس علاقہ پیشکاری حیدرآباد دکن سے رسالہ کی صورت میں شائع ہوا ہے۔ ابتداء میں سکھ رام داس صاحب کی فرمائش پر "ویر نمبر" کے لئے لکھا گیا تھا لیکن بقول مہاراجہ ان کے "پریشان تاریخی حالات" کو ویر نمبر میں جگہ نہیں دی گئی۔ بعد میں احباب کی فرمائش سے اسے شائع کیا گیا۔ رام چندر جی کی

بہادری اور جواں مردی پر قلم اٹھانے سے پیشتر بہادری کی قسمیں بتائی ہیں کہ اس کا اطلاق عام اور خاص دونوں معنوں پر ہو سکتا ہے۔ شاد لکھتے ہیں۔

"عام تو وہ بہادری ہے کہ جاہل اور وحشی بھی اس لفظ سے پکارے جانے کا مستحق ہو سکتا ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک مارنا اور مرنا ایک معمولی چیز ہے...... خاص بہادری وہ ہے جس کا تعلق اصل شجاعت سے ہو۔ خواہ وہ عورتوں سے متعلق ہو خواہ مردوں سے۔"

زمانۂ قدیم کی عورتوں کی بہادری اور ان کے کارناموں کے متعلق زیادہ معلومات ہم تک نہیں پہونچیں۔ اور معلومات کا جو کچھ ذخیرہ فراہم ہوا ہے وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ میدانِ جنگ میں مردوں کے دوش بدوش لڑنے سے زیادہ ان کی بہادری اس امر سے ظاہر ہوتی ہے کہ وہ ستی ہونے میں ذرہ برابر پیچھے نہیں ہٹتیں۔

رام چندرجی کی بہادری تاریخی شہرت حاصل کر چکی ہے۔ مختلف تاریخوں اور تذکروں میں اس کا ذکر مستقل ابواب میں کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں بھی رام چندرجی، سیتاجی، لچھمن، ہنومان، راون جیسے کرداروں کو تاریخ کی روشنی میں پیش کر کے ان کی اصلیت اور ان کے مقام کا تعین کیا گیا ہے۔ رام چندرجی کی شجاعت اور مستقل مزاجی، سیتاجی کی پاکدامنی، ہنومان کی جان نثاری اور راون کے فریب اور ظلم کو قصہ کے پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ واقعات کی پیش کشی میں منظر نگاری کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ لنکا کا ذکر اس انداز سے کیا ہے کہ سارا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ رام چندرجی کی راون سے لڑائی اور فتح، دشمنوں کی زبردست شکست اور بالآخر میں سیتاجی سے ملاقات، اپنی آبائی حکومت کو سنبھالنے کا ذکر، ان تمام واقعات کی پیش کشی میں جزئیات نگاری کی ہے۔ آخری تیرہ صفحات میں رام نومی کے عنوان سے ایک اور مضمون لکھا ہے۔ جس کے بارے میں مہاراجہ نے بتایا کہ یہ مضمون اپنے ایک دوست کی فرمائش پر رام نمبر کے لئے لکھا تھا۔

مہاراجہ اپنی انشاپردازی اور نثاری کے متعلق انکسار برتتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"مجھ کو یہ دعویٰ نہیں ہے کہ جس آفتاب آسمان شجاعت کا تذکرہ ان چند سطور میں کرنے والا ہوں وہ ایسا ہوگا کہ بلحاظ انشاپردازی کے بے نظیر ہوگا یا شاعرانہ آب ورنگ سے یہ تصویر محبوب خلایق ہوگی۔ نہیں، نہیں کہاں میں بے مایہ اور بے علم اور کہاں ایسا دعویٰ۔ میں اور نثاری کا دعویٰ مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ جو تذکرہ اپنے علم اور واقفیت کی حد تک لکھوں گا۔

انشاء اللہ مبالغہ کی آرائش اور بیجا ستائش کی زیبائش اور خوشامدانہ نازک خیالی سے مزین نہ ہوگا۔ بلکہ میرے دلی جذبات جو زبان پر ہیں وہی نوک قلم کی نقاشی سے حروف بن کر سادے سفید کاغذ کے صفحہ پر اپنا سین دکھائیں گے۔"

مہاراجہ کا انداز بیان عموماً نہایت سادہ اور سلجھا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن بعض وقت وہ تشبیہوں اور استعاروں کی کثرت سے عبارت کو پُر تکلف بنا دیتے ہیں۔ ذیل کی عبارت سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ کس طرح سادہ عبارت لکھتے لکھتے تکلف اور تصنع پر اتر آتے ہیں۔

"زندگی جاوید اسی کا نام ہے اسی کو دوسرے الفاظ میں روح کے لئے مکتی اور شانتی کہہ سکتے ہیں۔ یہی سبب تھا جس کے سبب خدا نے بنی نوع انسان کی بھلائی کے لئے ایسے سخت اور تاریک زمانہ میں جب کہ ہم پر جہالت کا سیاہ بادل چھتر شاہی بنا ہوا تھا اور چاروں طرف سے جہالت، وحشیانہ بجلی مخلوق خدا کی خرمن ہستی کو جلا کر نیست و نابود کر رہی تھی اور قوم کا ستارہ عفیفی نکبت میں دھندلا چراغ سحری کی طرح ٹمٹما رہا تھا اور بہادر راجپوت کی مردانگی اور شجاعت کا خون ہمالہ کے برف کی طرح منجمد ہوگیا تھا اور ممالک جرمن اور یونان کے عقلا حکما اور فلاسفروں کی عقل و دانش پر غفلت کا پردہ پڑ گیا تھا۔ ایسے وقت میں بھارت ورش کے سورج بنسی آفتاب نے اپنے نور کو کافور کی طرح بکھیر کر اصلی وحدانیت اور راستی کی روشنی سے دنیا کو منور کر دیا تھا۔"

رام چندرجی کی بہادری اور ان کے صبر و استقلال کو واضح کرنے کے لئے مختلف تاریخی واقعات کی مثالیں دے کر بتایا کہ صبر و شکر اور رضا جوئی۔ میں ان کے ہم پلہ ہونے کا دعویٰ کوئی نہیں کرسکتا مہاراجہ نے رامچندرجی کی بہادری کے متعلق کئی مضامین لکھے ہیں اور ہر جگہ انھیں ایک نئے روپ میں پیش کیا ہے اس لئے اس موضوع پر ان کا ہر مضمون اپنی جداگانہ تاریخی اور ادبی اہمیت رکھتا ہے

ہندو بھائیوں سے خطاب یہ مقالہ ۱۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ جو ایک مستقل رسالہ کی صورت میں شایع ہوا ہے سائز $8\frac{1}{2} \times 5\frac{1}{2}$ ہے سنہ ۱۳۴۸ ف م ۱۹۳۸ء میں دار الطبع سرکار عالی میں طبع ہوا۔ مہاراجہ شاد اپنے ہندو بھائیوں سے مخاطب ہیں۔ اور ملک میں جو عام سیاسی بے چینی محسوس ہو رہی ہے اس کے اسباب و نتائج پر غور کر کے اسے دور کرنے کی کوشش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ مہاراجہ کا خیال ہے کہ ملک میں فرقہ پرستی کے رجحان کی زیادتی کی وجہ سے افراتفری اور پریشانی پھیلی ہوئی ہے۔ فرقہ پرستی کی مخالفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"بنیادی طور پر ہمارے ملک کو نہ ان سے کبھی پہلے تعلق تھا اور نہ اب ہوسکتا ہے

حیدر آباد کا دامن ہمیشہ سے اس قسم کی ہنگامہ آرائیوں سے پاک رہا ہے اور یہ ایک واقعہ ہے کہ اس سرزمین میں بسنے والے ہندو، مسلمان، پارسی، عیسائی ایک دوسرے کو برادرانہ محبت سے دیکھتے رہے ہیں اور ان کے دل میں کبھی کوئی تنخالف کا احساس پیدا ہی نہیں ہوا"

مسلمان بادشاہوں کے عدل و انصاف کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بہمنی، بریدشاہی، قطب شاہی اور آصف جاہی سلطنتوں میں ہر قوم اور ہر مذہب وملت کے لوگوں کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کیا جاتا رہا ہے۔ نیز ان سب حکومتوں کے اصول وقوانین میں مذہب کو دخیل ہونے نہیں دیا گیا۔ ان سلاطین کی مثالیں دیتے ہوئے مہاراجہ نے عوام کے اس دعویٰ کو غلط اور بے بنیاد ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حکومت کے اصول وقوانین مذہب پر مبنی تھے نیز انہوں نے اس بات کا بھی یقین دلایا ہے کہ ہندومت پر چلنے والوں کی ہر طرح مدد کی جائے گی اور ہر ضرورت کو پورا کیا جائے گا۔

مہاراجہ ہندو مسلم اتحاد کے حامی اور فرقہ پرستی کے مخالف تھے۔ اس لئے انہوں نے ہندو قوم کو ہر طرح سے یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ دکن کے مسلم اور ہندو اس سلطنت کے دو بازو ہیں اور ان میں اختلاف ناممکن ہے۔ یہاں اسلامی حکومت ہونے کی وجہ سے بیرون ملک کے افراد اس غلط فہمی کا شکار تھے کہ ریاست کی غیر مسلم رعایا کے ساتھ نہایت تحقیر آمیز سلوک کیا جاتا ہے۔ مہاراجہ انھیں اس طرح یقین دلاتے ہیں۔

"آئین حکومت میں جو مساوات کا برتاؤ ہمارے ساتھ کیا جاتا ہے اس کی نظیر کسی دوسرے مقام پر نہیں مل سکتی۔ جس قدر مذہبی آزادی یہاں ہم کو حاصل ہے اس کی گواہی منادر کے وہ دروازے دے سکتے ہیں جو عبادتوں کے لئے ہر وقت کھلے رہتے ہیں اور لاکھوں روپیہ سالانہ کی بڑی بڑی جاگیریں ان منادر کے انتظام کے لئے بادشاہوں نے عطا کی ہیں مذہبی رسوم جو خالص ہندومت کے طریقہ پر ہوتے ہیں اس میں مسلمان بھی برادرانہ محبت کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ اور رتھ گشتی کے موقع پر موجود رہتے ہیں"

اسلامی حکومت میں ہندوؤں کو جو شاہی اعزازات دئے گئے ہیں اس کے ثبوت میں مہاراجہ نے خود اپنی اور اپنے خاندان کی مثال پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ خاندان سالہا سال سے اسلامی حکومت میں بڑے عہدوں پر فائز رہا ہے۔ خود مسلمان بھی ان پر رشک کرتے رہے ہیں آریا سماجیوں کی بے جا مداخلت کو مہاراجہ کسی صورت پسند نہیں کرتے ان کے تمام دعووں کو بے بنیاد

شمایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"آخر ہمارے ساتھ آریا سماجیوں کی یہ ہمدردی کیوں؟ ہم ان کی انسانیت سوز حرکتوں سے کسی نوع کے حقوق حاصل کرنا نہیں چاہتے۔ اور وہ کون سے حقوق ہیں جو اس وقت ہم کو حاصل نہیں ہیں۔ کاشت کاری ہماری ہے۔ تجارت ہماری ہے، ساہوکار ہمارا ہے، پٹیل پٹواری ہم ہی ہیں دیسمکھ دیس پانڈے ہم ہی ہیں۔ وطن دار ہم ہی ہیں۔ غرض کہ زندگی کا کونسا ایسا شعبہ ہے جس پر ہم قابض نہیں ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ہم بیرون ملک کا کوئی احسان لینا نہیں چاہتے۔ اور نہ ہم ان کی مدد کے محتاج ہیں۔"

آخر میں اعلیٰ حضرت کے رواداری سلوک اور ان کی بے تعصبی کی تعریف کرتے ہوئے ہندوؤں کو یقین دلاتے ہیں کہ ان کی بھلائی اسی میں ہے کہ بادشاہ کی اطاعت کریں اور بیرونی اثرات سے بچے رہیں۔

معراج ترقی

معراج ترقی ۳۳ صفحات کا مقالہ ہے۔ سائز ۷" × ۵" ہے محمد عبدالولی کے اہتمام سے محبوب پریس علاقہ پیشکاری میں طبع ہوا۔ نہ سنہ تصنیف درج ہے نہ سنہ اشاعت۔ فہرست مضامین میں مندرجہ ذیل سات عنوانات شامل ہیں۔

۱۔ تقریظ ۔ ۲۔ دیباچہ ۔ ۳ ہندوستان کس طرح ترقی حاصل کرسکتا ہے ۔ ۴۔ کیا مذہب بھی مانع ترقی ہے ۔ ۵۔ فلسفۂ محبت ۔ ۶۔ کیا صنعت وحرفت معراج ترقی نہیں ۷۔ غلط نامہ۔

ابتداء میں مدن موہن شرما نے تقریباً (۱۶) صفحات کی تقریظ لکھی ہے۔ اس میں انہوں نے بتایا کہ اس سے قبل بھی ان کی فرمائش پر مہاراجہ نے ایک مضمون "کرشن کلا" لکھا تھا اور رسالہ "معراج ترقی" بھی ان ہی کی التجا پر لکھا گیا ہے۔ اس رسالہ کے بارے میں مدن موہن شرما لکھتے ہیں۔

"جس رسالہ کا ریویو کرنے کے لئے مجھے آج سنہری موقع ملا ہے وہ بھی آپ کی اعلیٰ تصانیف میں سے ایک انمول رتن ہے اور اس کو بھی آپ نے بڑی محنت کے ساتھ محض میری التجا کرنے پر قلم بند کیا ہے۔ ٹائیٹل پیج ہی اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ یہ رسالہ اس بات کو مدنظر رکھ کر لکھا گیا ہے مجھے ایسی باتیں لکھنے کا بڑا فخر ہوتا ہے۔"

تقریظ کے بعد مہاراجہ نے بارہ سطروں کا نوٹ دیباچہ کے عنوان سے لکھا ہے۔ اس میں

بتایا ہے کہ ان کے دوست مدن موہن شرما نے کوئی اخلاقی مضمون قوم کی درستی کے لئے لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ مہاراجہ کا خیال ہے کہ ایسا مضمون لکھنے سے پہلے قوم کی ترقی اور زوال کے اسباب لازماً بتائے جانے چاہئیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ انہوں نے حتی الامکان اس بات کی کوشش کی ہے کہ اس موضوع سے متعلق اپنے تمام خیالات کا نچوڑ عوام کے سامنے پیش کریں۔

"ہندوستان کس طرح ترقی کر سکتا ہے" اس عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ ملک و قوم کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ سماجی اور تجارتی ترقی کے ساتھ ساتھ اخلاقی، ادبی اور روحانی ترقی کا بھی خیال رکھا جائے۔ ملک کی عام ترقی کا راز اسی میں پوشیدہ ہے ترقی کے سلسلہ میں یورپ کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "علم و ہنر آج یورپ کی موجودہ ترقی کی جان ہیں اور جب تک اہل ہند دونوں امور میں ترقی نہیں کریں گے ان کی مالی حالت اور حیثیت کبھی لائق اعتبار نہ سمجھی جائے گی۔"

بے عملی، پست خیالی اور مذہبی امور سے لاپروائی کو بھی مہاراجہ ترقی کی راہوں میں رکاوٹ خیال کرتے ہیں۔ مذہبی اصولوں کے بارے میں مہاراجہ کا یہ خیال ہے۔

> "ہماری یہ آرزو ہے کہ لوگ مذہبی امور میں سچے دل سے غور کریں۔ اس کے بہترین اصول کے مطابق اپنی زندگی صرف کرنا قومی عزت تصور کر کے اپنے آپ کو شائستہ بنائیں۔ کیونکہ مقصد حیات کی تکمیل ابتدائے آفرینش سے ہی مذہبی پابندی باہمی الفت و محبت کی بدولت ہوئی ہے۔"

اسی سلسلہ میں آگے کے تقریباً چار صفحات کی عبارت مرصع ہے مہاراجہ عموماً بہت سادہ عبارت لکھتے ہیں۔ کبھی کبھی سادہ اور بے تکلف عبارت لکھتے لکھتے مسجع مقفیٰ اور پر تکلف اسلوب اختیار کر لیتے ہیں۔ مندرجہ بالا اقتباسات کی زبان اور اسلوب کی سادگی سے ذیل کی عبارت کی پرکاری کا مقابلہ کیجئے۔

> "بہار آرائے قدرت کے نشو و نما دینے والے نے آب و گل کے اجتماع سے گل ہائے وجود پیدا کر دیئے ہیں اور گلوں کی فراوانی سے گلشن دنیا کو ہمیشہ سر سبز آراستہ رکھا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ قدرت کے اور اسرار دیکھو کہ جب سورج چمکتا ہے تو اس کے پرتو سے عالم بقعہ نور بن جاتا ہے باد صبا اور نسیم سحری کے لطافت انگیز روح افزا جھونکے گلوں کو ہر ایک چمن میں شگفتہ و خنداں کرتے ہیں۔ گلوں کے دیدار کے اشتیاق میں عنادل اپنی ترانہ سنجی میں مست

رہتے ہیں اور ابر نیساں جب قطرہ باری کرتا ہے تو صرف تشنہ دہان اپنے لب کھول دیتی ہے اور جو قطرہ اسکے کام آرزو میں ٹپکتا ہے تو قدرت اس کو گوہر شاہوار ہونے کی آبرو بخشی ہے۔"

رسالہ کا اختتام ایک شعر پر ہوا ہے جس کے بارے میں مہاراجہ کہتے ہیں کہ انہوں نے کسی فلسفی کے قول کو شعر کا جامہ پہنایا ہے۔ شعر درج ذیل ہے۔

خواب غفلت سے ذرا ہشیار ہو سعی کر جب تک کہ جاں ہے جسم میں

کرشن کلا یہ مقالہ مہاراجہ نے اپنے دوست مدن موہن شرما کی درخواست پر لکھا تھا۔ مدن موہن شرما نے مہاراجہ سے یہ درخواست کی تھی کہ کمار سبھا کے جلسہ منعقدہ ۲۹/ جولائی کے لئے وہ کوئی ایسا اخلاقی مضمون لکھ بھیجیں جس سے ہندو نوجوانوں کے خیالات کی اصلاح ہو۔ مہاراجہ نے اسی فرمائش کی بناء پر یہ مقالہ قلم بند کیا تھا جو ایک رسالہ کی صورت میں محبوب پریس علاقہ پیشکاری سے شائع ہوا۔ ۹ × ۷ سائز کے ۶ صفحات پر مشتمل ہے اس رسالہ پر سنہ تصنیف درج نہیں ہے۔ جس جلسہ کے لئے یہ مضمون لکھا گیا تھا اس کا بھی سنہ نہیں دیا گیا ہے۔ آخر میں ۱۶ صفحات کا صحت نامہ دیا گیا ہے۔ فہرست مضامین میں چھوٹے بڑے اردو ہندی اور فارسی کے (۱۴) دلچسپ عنوان ہیں جو درج ذیل ہیں۔

۱۔ دیباچہ ۔ ۲۔ ستارہ بدرخشید وماہ مجلس شد ۔ ۳۔ زبردست عقیدت اور سچا خلوص ۔ ۴۔ ادھر کا یہ ہے حال ادھر کی سنو ۔ ۵۔ من ازاں حسن روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم ۔ ۶۔ اس موقع پر ۔ ۷۔ ایک روز ۔ ۸۔ جگ کی صبح ۔ ۹۔ مہاراجہ سری کرشن کا عدل ۱۰۔ اختلاف آراو ۔ ۱۱۔ کیا میں ایسا کہنے سے بجز شٹ یا ویشن یا شودر ہوگیا ۔ ۱۲۔ اس ہادی برحق کی تعلیم ۔ ۱۳۔ پیغمبر اسلام ۔ ۱۴۔ پریم پریم سے ہوئے پریم سوں پار ہی جیئے ۔

دیباچہ میں بتایا ہے کہ نصیحت وہی شخص کرسکتا ہے جو خود بھی عمل کرتا ہو۔ اس کے بعد نفس موضوع کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"اس مضمون کی ابتداء فقیر نے مہاراجہ سری کرشن کی مدح سے کی ہے جو مظہر عشق الٰہی اور راز سربستہ عبودیت ہیں اور کتاب عقل و دانش کا دیباچہ اور تہذیب واخلاق وتمدن کا مجموعہ ہیں اور ضمناً اسی ہادی برحق کی مختصر سوانح عمری کے بعد ان کی تعلیم کے متعلق گفتگو کی ہے جو ہر وقت اور ہر زمانے میں لائق موعظت متصور ہوسکتی ہے۔"

شری کرشن جی سے شاد کو جو عقیدت ہے اس کا اظہار اپنی نظم ونثر میں انہوں نے جگہ جگہ

کیا ہے۔ اس مضمون میں بھی کرشن جی کی تعریف میں کئی صفحات رنگ دیئے ہیں ان کے اوصاف اور کارناموں کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"یہ وہ کرشن ہے جو مذہب ہنود کے نقطۂ نظر سے لافانی، کمال ذات واجب الوجود کا خاص مظہر، عشق کی مورت، سندر صورت، گوپی گوالن کا محبوب (من موہن) ماں باپ کی آنکھوں کا تارا، جسو دابائی کا راج دلارا، نند جی کے حقیقی فرزند سے کہیں برتر، مرجع عالم ہندستان کا پیغمبر، گمراہوں کا راہبر، غریبوں کا پالن ہار، چنچل منوں کا ادھار، پاپیوں کا ادھار کرنے والا تھا۔"

سری کرشن جی سے ان کے حقیقی ماموں کنس کو بے حد دشمنی تھی اس لئے کہ نجومیوں نے کنس کو بتایا تھا کہ اس کا قاتل اس کی بہن کا لڑکا ہوگا۔ چنانچہ کئی بار کنس نے کرشن جی کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ کرشن جی کو کس طرح بچایا گیا اور بعد میں کنس کا کس طرح خاتمہ ہوا یہ تمام حالات مہاراجہ نے "جلوہ کرشن" میں تفصیل سے قلم بند کر دیئے ہیں۔ یہاں صرف کرشن جی کی تعلیمات اور ان کے بتائے ہوئے اصولوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مہاراجہ نے یہ واضح کیا ہے کہ کرشن جی نے کس طرح عوام کو گمراہی کے خطرے سے آگاہ کیا تھا۔ اور جو غلط عقائد اس زمانے میں لوگوں کے دل و دماغ پر مسلط تھے انھیں کس طرح دور کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسی ضمن میں مہاراجہ نے مختلف مذاہب اور ان کی درستی پر روشنی ڈالتے ہوئے مذہب اسلام کی تعریف کی ہے کہ وحدت پرستی میں اس مذہب کا کوئی دوسرا مذہب مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ان کا خیال ہے کہ ہندومت میں وحدت پرستی کی بجائے کثرت پرستی رائج ہوگی۔ اور شرک وبت پرستی کا زور ہوا تو کبیر داس اور گرو نانک نے پھر ایک مرتبہ ہندوؤں کو توحید کی تعلیم دی۔ اسی سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں کہ اسلام میں بھی جب توحید سے توجہ ہٹنے لگی تو خواجہ اجمیری اور ان کے سلسلے کے دوسرے بزرگوں نے دین اسلام کی بنیادی تعلیم کو از سر نو زندہ کیا۔ صوفیا نے خلائق کو دنیا کی آزادی سے نکال کر دین کی طرف لانے کا کام انجام دیا۔ بہر حال صوفیائے کرام کی تعریف و توصیف کے بعد وہ کہتے ہیں کہ ان بزرگوں کی تعریف کرنے سے ان کے آبائی مذہب میں کوئی فرق نہیں آسکتا۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں۔

"میرا یہ جسم سورج بنسی کھتری کے جوہر سے بنا ہے۔ کوئی ہزار چاہے کہ قلب ماہیت ہو جائے مگر نس نہیں بدل سکتا۔ میری رگ، رگ میں سورج بنسی کھتری کا خون اس طرح دوڑ رہا ہے جیسے کہ روح تمام جسم پر محیط ہے اور پانی انگور کے درخت میں دوڑ تک ہے۔"

اس کے بعد سری کرشن جی کی بتائی ہوئی (۱۲) ہدایتوں کو سلسلہ وار لکھا ہے۔ ان میں

شجاعت، دلیری، حق پرستی، راست گوئی، جان نثاری اور صبر و استقلال جیسی اعلیٰ خوبیوں کو حاصل کرنے کا سبق دیا گیا ہے۔ آخر میں لوگوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے انہوں نے وعظ و نصیحت کا پُر اثر اسلوب اختیار کیا ہے۔ یہ پوری عبارت مقفیٰ و مسجع ہے۔ شادؔ لکھتے ہیں۔

"مجھ خادم فقیر کی التجا یہی ہے کہ اب ہوشیار ہو جاؤ بہت دیر تک گھوڑے بیچ کر میٹھی نیند سوئے ہو۔ اپنی بے خبری سے آپ غفلت شعار کہلائے ہو۔ بس ایک دل اور ایک زبان ہو جاؤ۔ ایکائیت کو اپنی عزت سمجھو۔ اپنایت کو سعادت جانو۔ اور حسد کے تخم کو جلا دو۔ تعصب کی بیخ و بنیاد اکھڑ کو پھینک دو۔ حق پرستی کا تاج پہنو۔ عدالت کی قبا زیب تن کرو۔ ہمت کی زرہ پہن کر شجاعت کی تلوار لو۔ استقلال کے سپر کو پشت ہمت سے زینت دو۔ جواں مردی کے گھوڑے پر سوار ہو۔ صبر کو منطقہ بناؤ۔ راستی کو گلے کا ہار شجاعت کو دست بند بناؤ ارادوں کے میدان میں تدبیر کو رفیق گردانو۔ اور ایشور کی کرپا کو اپنا نشان بناؤ۔ ہر ایک میدان تمہارے ہاتھ رہے گا۔ پھر دیکھو کہ تم کیا ہو گئے۔"

فریاد شاد

مہاراجہ کا یہ مقالہ ۸" × ۵½" سائز کے ۱۴۷ صفحات پر مشتمل ہے سنہ تصنیف ۱۳۲۹ ہجری م ۱۹۱۱ء مطبع اختر دکن بازار افضل گنج میں چھپا۔ اس رسالہ میں مہاراجہ نے اپنے لڑکے آصف پرشاد کی بیماری سے لے کر وفات تک کے حالات مفصل اور موثر انداز میں قلمبند کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں اپنے سفر کی روداد بھی قلمبند کی ہے۔ مہاراجہ نے یہ سفر اپنے غم و الم کو دور کرنے کے لئے اختیار کیا تھا۔

ابتدائی صفحات میں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ ہر انسان کو عیش و عشرت کے ساتھ پریشانیوں اور مصیبتوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ روحانی صدمہ کے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ پاس عزت و ناموس عشق اور محبت یہ تین چیزیں ایسی ہیں جن میں کسی ایک سے انسان کو کسی نہ کسی طرح سابقہ پڑتا ہے۔ جذبۂ محبت کی بڑائی اور عظمت پر لکھتے ہوئے اولاد کی محبت کے متعلق یہ خیال پیش کیا ہے کہ اس کے لئے انسان سخت سے سخت مشکلات کا سامنا کرتا ہے اور کڑی مصیبتیں جھیلتا ہے۔

"اپنی بیتی" کے زیر عنوان درد انگیز پیرایہ میں اپنے لڑکوں کی موت پر اظہار افسوس کیا ہے۔ آٹھ لڑکے جو کم سنی ہی میں موت کا شکار ہو گئے تھے۔ ان کے نام سنہ ولادت اور سنہ وفات کے ساتھ درج کئے ہیں۔ چھوٹے لڑکے نریندر پرشاد کی وفات کے بعد اولاد نرینہ نہ ہونے کی مختلف لوگوں نے مختلف افواہیں مشہور کر رکھی تھیں۔ بعض یہ کہتے تھے کہ مہاراجہ شادؔ اپنے رشتہ داروں

میں سے کسی کے لڑکے کو متبنیٰ کریں گے بعض از راہِ مذاق بلکہ تضحیک کے پیرائے میں کہتے کہ وہ لڑکے کے لئے بزرگانِ دین سے دعا کروا رہے ہیں۔ ایک موقع پر چند فقرا نے دعویٰ سے کہا تھا کہ لڑکا ہوگا لیکن اتفاق سے اس دفعہ بھی لڑکی ہوئی۔ البتہ چند سال بعد دعا قبول ہوئی اور ایک ہندو محل سے انھیں لڑکا ہوا۔ اس واقعہ کو ذیل کے فقروں میں بیان کیا ہے۔ پوری عبارت چُست اور جذبات سے پُر ہے۔

"لِلّٰہ الحمد کہ خدا نے آن بان رکھلی۔ ایک زمانہ کی کایا پلٹ اور مخالفین کے ارادوں کا نتیجہ برعکس نکلا سال گذشتہ صفر کی بارھویں شب سنہ ۱۳۳۸ھ کو دعائے سحری نے قبولیت کا خلعت پایا نسیم عنایت الٰہی کا جھونکا چلا۔ نخل امید بارور ہوئی۔ یعنی خداوند عالم جل شانہٗ میری وہ مہری بیوی جو اہل ہنود سے ہے اس کے بطن سے فرزند نرینہ کا نور ظہور میں لایا۔ اشتیاق نے امید کی گودی میں لیا۔ سعادت کا چہرہ روشن ہوا۔ محبت کے جھولے میں جھلایا۔ بخت وسعادت نے عمر درازی کی پینگ دی۔"

اس بچے کا نام آصف پرشاد رکھا گیا۔ یہ بچہ تین ماہ کا ہونے کے بعد بیمار ہوا اور نو ماہ کی طویل بیماری کے بعد اس کا انتقال ہوگیا۔ اس کے علاج کے لئے جن جن ڈاکٹروں اور جن ملاؤں، فقیروں اور بزرگوں سے رجوع کیا۔ اس کی دلچسپ اور سبق آموز تفصیل دی ہے۔ تمام بزرگوں نے بالاتفاق یقین دلایا تھا کہ یہ بچہ اچھا ہو جائے گا۔ اور وہی جانشین ہوگا لیکن کسی کی بات سچ نہ نکلی۔ بچہ کی بیماری بڑھتی ہی گئی اور بالآخر وہ رحلت کرگیا۔ بزرگوں، رشیوں اور منجموں کی پیشن گوئیاں غلط نکلیں تو ان کی بندگی اور مجبوری کے متعلق شاد لکھتے ہیں۔

"الغرض اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان خواہ روحانی ترقیات کی بدولت کسی درجہ کمال کی معراج حاصل کرے مگر بندگی کا طوق جو ازل سے پڑا ہوا ہے وہ جبر وقدر کے مسئلہ کو صاف طور سے حل کردیتا ہے۔ بعض خوارق عادت اور کرامات کا جو تذکرہ کتب میں درج ہے ان کے متعلق ہمارا کسی طرح سے اس میں چوں وچرا نہ کرنا ہی اچھا ہے یہ ظاہر ہے کہ روح کے کئی مدارج ہیں۔ جن میں ایک وہ مرتبہ ہے جو قرب نوافل کی بدولت حاصل ہوتا ہے۔ اب اس پایہ کے لوگ شاید بمصداق النادر کالمعدوم ہوں گے تو کم ہوں گے۔"

ذیل کی عبارت سے ان کے جذبات غم کی شدت و فراوانی کا ہی اندازہ نہیں ہوتا بلکہ اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ جذبات کی شدت تحریر میں کس قدر ادبیت پیدا کر دیتی ہے۔

"جس باپ کے تاریک گھر کا روشن کرنے والا آفتاب اور جس باپ کی شب غم کا مہتاب، جس باپ کی اجڑی ہوئی بزم کی شمع جس باپ کی برباد شدہ بستیوں کا آباد کرنے والا جس باپ کے خزان رسیدہ باغ کی بہار جس باپ کی آنکھوں کا نور، جس باپ کے دل کا سرور جس باپ کی قوت کا سرمایہ جس باپ کے تخت حکومت کا پایہ جس باپ کی دولت کی کنجی، جس باپ کے فرق اقبال کا تاج جس باپ کی عزت کا دراہ جس باپ کے گلے کا ہار جس باپ کی قوت بازو، جس باپ کے سر کا سہرا، جس باپ کا عصائے پیری وارث جائز کلاں اور جانشین صادق قدرتاً فطرتاً، رواجاً، شرعاً، شاستراً مسلم ہو اس عالم مثال میں چند روز کے لیے آفتاب کے مانند طلوع ہوتے ہی قبل از وقت غروب ہو گیا۔ اس باپ کے دل کی حالت کیا کچھ ہوگی۔"

آصف پرشاد کی موت پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک طویل درد انگیز نوحہ لکھا ہے جو (۱۶۷) اشعار پر مشتمل ہے۔ اس مرثیہ کے ابتدائی اشعار میں دنیا والوں کی مختلف دلچسپیوں اور مسلکوں کا ذکر کرنے کے بعد درد و غم کی حالت اس طرح بیان کی ہے۔

ایک میں ہوں کہ دلفگار رہوں میں
ایک میں ہوں کہ بے قرار ہوں میں
ایک میں ہوں کہ روز روتا ہوں
منہ کو اشکوں سے اپنے دھوتا ہوں
ایک میں ہوں کہ لب پہ ہے میرے آہ
ایک میں ہوں کہ ہوں بہ حال تباہ
غم سے فرزند کے ہے دل ناشاد
کس سے تیرے سوا کروں فریاد

شدت غم سے عاجز آ کر مہاراجہ نے اورنگ آباد کے سفر کا ارادہ کیا۔ راستے میں منوہر آباد جاگیر آصف نواز ونت، نظام آباد، بھنی، پرتور (جاگیر مہاراجہ) میں قیام کرتے ہوئے اورنگ آباد پہونچے مہاراجہ نے ۱۳ صفر سے ۲۵ صفر تک کا روزنامچہ قلم بند کیا ہے۔ جس میں ہر مقام پر شناز شخصیتوں اور مقامی عہدہ داروں سے اپنی ملاقات اہم تاریخی مقامات کا ذکر کرتے ہوئے بہت سی

کام کی باتیں بھی لکھتے گئے ہیں۔ بعض اشخاص کے خاندانی حالات اور اپنے خاندان سے ان کے مراسم کا تذکرہ کیا ہے۔ عہدہ داروں کے کام اور ان کی اہم خدمات کو سراہا ہے۔

سفر کے دوران میں جب کبھی طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل ہوتی وہ اشعار بھی کہتے جاتے۔ چنانچہ اس مدت میں پانچ مختصر مثنویاں انہوں نے لکھیں جن میں سے ایک فارسی میں ہے۔ ایک نظم قافیہ و ردیف کے التزام کے ساتھ لکھی ہے اور چار غزلیں بھی کہی ہیں۔ ان تمام نظموں اور غزلوں میں شاد نے بیٹے کی موت کا ماتم کیا ہے اور اپنے درد و غم کے جذبات کی عکاسی کی ہے اس کتاب کی عبارت میں بڑی چستی اور برجستگی ہے وفور جذبات میں شاد نے کہیں مقفیٰ اور مسجع عبارت لکھ دی ہے کہیں پے در پے تشبیہات و استعارات استعمال کر گئے ہیں۔ اور کہیں چھوٹے چھوٹے جملوں سے اپنے جذبات کی شدت کا اظہار کیا ہے اس طرح پوری عبارت میں ادبیت کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ ورنہ شاد عام طور پر سادہ اور بے تکلف نثر لکھنے کے عادی ہیں۔

آزادی مہاراجہ کا یہ مقالہ ایک مستقل رسالہ کی صورت میں شائع ہوا ہے۔ ۹" × ۶" سائز کے ۲۹ صفحات پر مشتمل ہے سنہ تصنیف ۱۹۰۵ء اور مطبع اختر دکن میں سخاوت علی کے اہتمام سے طبع ہوا ہے۔ اس مقالہ میں مہاراجہ نے آزادی کے مفہوم اس کی قسمیں اور اس کے استعمال کے صحیح طریقوں سے روشناس کرایا ہے۔ آزادی کے معنی بتاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "اس میں شک نہیں کہ آزادی جس کے لغوی معنی بے قیدی کے ہیں۔ نہایت ہی بیش بہا جوہر اور اس بحر ناپیدکنار دنیا میں انمول موتی ہے۔ جس شناور نے اس بحر کے مد و جزر کا مشاہدہ کیا ہے وہ درحقیقت پابندی کا غلام بننا نہیں چاہتا۔ بلند خیال اور عالی حوصلہ شخص جس کا ذہن ایجاد کی قابلیت رکھتا ہو وہ آزادی کا دلدادہ، والہ، شیدا، فریفتہ ہوتا ہے۔ ہرگز ہرگز پابندی کی سنگین بیڑی اور مجبوری کا مجاری طوق اپنی گردن میں ڈال کر قیدی بننا گوارا نہیں۔ مگر غور کے قابل یہ امر ہے کہ جس قدر آزادی کی وادی کو وسعت ہے اس قدر بہار ہے باغ خیال کا نہال سرو و شمشاد کی طرح آزاد ہے یا نہیں۔ اس سوال کا جواب ضرور نفی میں ملے گا۔"

آزادی اور پابندی کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے ان کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ طبعی اور تمدنی۔ روزمرہ زندگی میں رونما ہونے والے واقعات اور مشاہدات سے مختلف مثالیں دے کر ان اصطلاحات کے مفہوم کو واضح کیا ہے۔ طبعی آزادی کے زیر عنوان بچپن ہی کو

اصلی آزادی کا زمانہ قرار دیا ہے اس لئے کہ اس عمر میں انسان معاشی جدوجہد اور دیگر ذہنی تفکرات سے بالکلیہ طور پر آزاد ہوتا ہے۔ آزادی کے ساتھ ساتھ پابندی بھی ہے۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ پابندی طبیعی بھی ہوسکتی ہے اور تمدنی بھی پابندی کی تفصیل اس طرح بتائی ہے۔

۱۔ قوم کی پابندی۔ ۲۔ مذہب کی قید۔ ۳۔ رسم و رواج کی بیڑی۔ ۴۔ محکومیت کا طوق۔ ۵۔ جان کا خطرہ۔

مندرجہ بالا عنوانات کی تشریح اور وضاحت کے لئے روزمرہ زندگی سے مثالیں دیتے ہوئے آسان اور عام فہم طرز تحریر اختیار کیا ہے۔ آزادی کے صحیح مفہوم کو بتلانے کے بعد سچے آزاد کی ان الفاظ میں تعریف کی ہے۔

"دراصل سچا آزاد وہی عالی حوصلہ خوش وقت بلند بخت بندہ ہے جو اولاً صفت راستی و راست بازی سے متصف ہو۔ یعنی جس کا پندار، گفتار، رفتار متحد ہو"

آخری صفحات میں ان لوگوں کو نصیحت کی ہے جو آزادی کا غلط مفہوم لیتے ہیں اور اس کی آڑ میں دنیاوی عیش میں اپنی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں شاد لکھتے ہیں

"آزادی صرف اسی کا نام نہیں کہ صبح اٹھتے ہی چھوٹی حاضری کھائی۔ دوپہر کو بریک فاسٹ، سہ پہر کو چائے، شب میں ڈنر اور سلیپنگ سوٹ پہن کر بڈروم میں گھسے اور دراز ہو گئے۔ یا یہ کہ وسکی سوڈا پیا، شامپین کی بوتل خالی کی، دو درجن سگریٹ کا دھواں اڑایا۔ کوئی گھر میں بیمار ہے تو اس کی خبر نہ لی اور کوئی مرگیا تو اس کا غم نہ کیا۔ بگھی منگائی اور سوار ہوکر ہوکر ہوا خوری کو چلتے ہوئے۔ یہ باتیں کام نہیں آتیں اس کو نفس پرستی یا دوسرے الفاظ میں شہد اپن کہتے ہیں۔ کوشش کرو کہ اس نفس پرستی کو چھوڑ کر سچے آزاد بنو"

سوریہ پرکاش یہ مقالہ $4\frac{1}{2}'' \times 6\frac{1}{2}''$ سائز کے (۶۶) صفحات پر مشتمل ہے۔ محبوب پریس علاقہ ڈپشکاری میں طبع ہوا۔

مہاراجہ نے ابتداء میں تقریباً آٹھ صفحات کا دیباچہ لکھا ہے جس میں انہوں نے وضاحت کی ہے کہ تحصیل علم اور لکھنے پڑھنے کا شوق انھیں قسام ازل کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے۔ اس لئے وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت شاعری مضمون نویسی اور انشا پردازی میں صرف کرنے میں کبھی کبھی وہ لوگوں کی فرمائش پر بھی خامہ فرسائی کرتے ہیں۔

دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

"کمسنی سے یہ فقیر لکھنے پڑھنے اور دماغی کام کرنے کا عادی رہا ہے۔ ایک زمانہ تلک ملک اور رعایا کی خدمت کرتا رہا جس کے خاص و عام شاہد ہیں کہ شب و روز میں بلا مبالغہ چودہ گھنٹے کام میں صرف کرتا تھا اور چھ گھنٹے اپنے نفس کے حق کے لئے۔ بیس گھنٹے وضع ہونے کے بعد چار گھنٹے جو باقی رہتے تھے تالیف و تصنیف و پینٹنگ اور کتب کے مطالعہ میں صرف ہوتے تھے ..... فقیر شاد اپنے احباب کی فرمائش پورا کرنے میں اپنا کبیر منافع سمجھتا ہے۔"

رسالہ کا موضوع رامچندر جی کی سیرت و شخصیت ہے اس موضوع پر مہاراجہ کا یہ دوسرا مقالہ ہے۔ دسہرا میں بھی انہوں نے رامچندر جی ہی کی شخصیت اور سیرت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مندرجہ ذیل گیارہ دلچسپ عنوانات کے تحت رامچندر جی کے خاندانی حالات، ان کی برتری و بزرگی، بہادری اور اطاعت گزاری کے قصے قلم بند کئے ہیں

۱۔ مہاراجہ رامچندر جی کی جے ۔ ۲۔ بھائیو ۔ ۳۔ چنانچہ ۔ ۴۔ کیا یہ وہی رام ہیں ۔ ۵۔ سورج ۔ ۶۔ راجہ بھرت ۔ ۷۔ مہارانی کیکئی۔ ۸۔ ایں گل دیگر شگفت ۹۔ بھائیو ۔ ۱۰۔ اے بھائیو ۔ ۱۱۔ پر ارتھنا

رامچندر جی کے بارے میں کچھ لکھنے سے پیشتر مہاراجہ نے بتایا کہ انسانی حقیقت کا راز کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"انسان اگرچہ فانی نظر آتا ہے لیکن اس کی ابدی حقیقت اس دورِ کائنات سے بے نیاز ہے۔ اور آیندہ بھی جب تک دنیا قائم ہے اس کی شخصیت کو اگرچہ تغیر امکانی ہو مگر اس کی حقیقت کی حالت ایک ہی شان سے باقی رہے گی۔"

اسی باب میں انہوں نے انسانی دماغ کے کارناموں اور نت نئی ایجادوں کے بارے میں لکھا ہے کہ زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ ذہن انسانی نے اس قدر زبردست ترقی کر لی ہے کہ وہ زندگی کے کٹھن سے کٹھن مرحلوں کو طے کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ سائنسی ترقیوں کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ لیکن انسانی ذہن کی رسائی بس یہیں تک محدود ہے اس کے آگے وہ سوچ نہیں سکتا۔

تمہید ختم کرنے کے بعد وہ اپنے موضوع کی طرف رجوع ہوتے ہیں عوام کو رامچندر جی سے ان

ان الفاظ میں روشناس کرایا ہے ۔

"کون ایسا فرد بشر کسی قوم اور ملت کا ہے جو مہاراجہ راجچندر شہنشاہ عالم مادی وروحانی کے نام نامی سے واقف نہیں ۔سپہر حقیقت کا یہ وہ آفتاب عالم تاب ہے کہ ازل کے افق سے طلوع ہو کر سیاحت امکان میں پرتو فگن ہوا ہے اور اس کا فروغ فیض ابد تک رہے گا ۔"

"سورج" کے زیر عنوان انہوں نے رامچندرجی کی غیر معمولی صفات اور گوناگوں خوبیوں کا ذکر کیا ہے ۔ رامچندرجی میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو ایک انسان کو کامل بنانے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہیں سچائی، راست بازی، دیانت داری، رحم دلی اور اطاعت گزاری ایسی صفات ہیں جن کی بدولت بقول شاد وہ قوم کے نزدیک آتما سے پرماتما سمجھے گئے اور ابدی شانتی کے مراتب حاصل کر کے جنم مرن کے بندھن سے انہوں نے نجات ابدی حاصل کی ۔

فرماں برداری اور اعلیٰ حوصلگی کی اس سے بہتر اور کیا مثال مل سکتی ہے کہ رامچندرجی نے اپنی سوتیلی ماں کے حکم پر راج پاٹ چھوڑ دیا ۔ اور چودہ برس تک جنگل میں فقیرانہ زندگی بسر کرتے رہے ۔ رام چندرجی کی سوتیلی ماں رانی کیکئی اپنے حقیقی لڑکے راجہ بھرت کو گدی پر بٹھانا چاہتی تھی ۔ رامچندرجی کی تخت نشینی کے وقت رانی کیکئی نے راجہ دسرت کو وہ وعدہ یاد دلایا جو کسی موقع پر راجہ دسرت نے رانی کیکئی سے کیا تھا ۔ ایسے موقع پر رامچندرجی بخوشی بن باس جانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں

اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد مہاراجہ شاد قوم کے افراد کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ بھی رامچندرجی کے اوصاف حمیدہ اپنے میں پیدا کریں اور انھیں کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کریں ۔ مذہبی رواداری کے مہاراجہ دل سے قائل تھے ان کا کہنا ہے کہ اپنے مذہب کے ساتھ دوسروں کے مذہب کا بھی احترام لازم ہے ۔

اختتام پر مہاراجہ نے سورج بنسیوں کے لئے دعا کی ہے کہ خدا انھیں اتنی توفیق دے کہ وہ رام چندرجی کی تعلیمات کو مشعل راہ بنائیں اور ان کے بتائے ہوئے اصولوں پر عمل کریں ۔

رن بیر رن بیر سترہ صفحات کا مختصر مقالہ ہے سائز $6\frac{1}{2}'' \times 4\frac{1}{2}''$ سنہ تصنیف ۱۳۴۰ھ م ۱۹۲۱ء مطبع رہبر دکن میں طبع ہوا ۔ مہاراجہ شاد نے یہ مقالہ اپنے ایک دوست سکھ رام داس کی فرمایش پر لکھا ہے ۔ ابتداء ہی میں وجہ تصنیف

اور موضوع کی صراحت کردی ہے اور سکھ رام داس صاحب کے علمی و ادبی ذوق کو سراہا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"فقیر کے مخلص دوست جناب سکھ رام داس صاحب ایڈیٹر راجپوت گزٹ لاہور نے فقیر سے مخلصانہ خواہش ظاہر کی کہ شجاعان راجپوت کا کچھ تاریخی حال لکھے اور راجپوت گزٹ کے "پرتاب نمبر" کے لئے روانہ کرے۔ یہ فرمائش خود پتہ دے رہی ہے کہ شاد سے مخلص دوست کا پایہ علمی اور معلومات تاریخی کا بڑھا ہوا ہے۔ اور بلند خیالی یہ ترغیب دلا رہی ہے کہ فقیر شاد بھی صفحۂ تاریخ پر خامہ فرسائی کرے۔"

چونکہ تاریخی حالات لکھنے کی فرمائش کی گئی ہے اس لئے شاد نے نفس موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے تاریخ کی اہمیت اور اصلیت پر روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں مختلف لوگوں کے اقوال نقل کئے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"علامہ ابن خلدون نے تاریخ کی نسبت لکھا ہے کہ تاریخ کی سب سے مخفی غلطی قوموں کے ان حالات کے نظر انداز کرنے سے پیدا ہوتی ہے جو زمانے کے تغیر و تبدل سے بدلتے رہتے ہیں۔ یہ ایک نہایت مخفی مرض ہے جو ایک طویل زمانے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے صرف مخصوص لوگ اس کا پتہ پا سکتے ہیں جو اطوار زمانہ کے نبض شناس ہیں۔"

تمہید ختم کرنے کے بعد شاد نے لکھا ہے کہ ہندوستان کی قدیم حکومتوں کی تاریخ سے جس طرح لوگ بے بہرہ ہیں اسی طرح راجپوتوں کے تاریخی واقعات بھی پردۂ خفا میں۔ ان کی بہادری اور ہمت و استقلال کے قصے گردش ایام سے ختم ہوگئے ہیں۔ بہت کم مورخوں نے ایسے نادر تاریخی واقعات کو محفوظ کیا ہے۔ مہارانا پرتاب سنگھ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"آخری صدی میں دنیائے شجاعت کا ایک فرماں روایات کا دھنی، دھن کا پکا، جس کا دل فراغت نامہ کا سرمایۂ ناز، استقلال کا حکم، سورج بنسی خاندان کا ایک چمکتا ہوا روشن تارا، سورما، بہادر، مہارانا پرتاب سنگھ ہے جس کے ایک اشارے پر بہادروں نے لڑ لڑ کر اپنی پیاری جانیں میدان کارزار میں اجل کی نذر کردیں۔"

چونکہ راجپوتوں کی بہادری اور ان کے تاریخی حالات لکھنے کی فرمائش کی گئی ہے اسلئے مہاراجہ شاد نے مہارانا پرتاب سنگھ کی بہادری اولالعزمی اور جان نثاری کے بارے میں لکھنے کے بعد دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ دنیا میں کئی ہزار اقوام ہیں جو اپنی کسی نہ کسی خصوصیت

کا بنا پر مشہور ہیں۔ لیکن شجاعت ہمت اور استقلال یہ خصوصیات ایسی ہیں جو صرف راجپوتوں ہی کے لئے مخصوص ہیں۔ دوسری کوئی قوم شجاعت میں ان کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتی راجپوتوں کے بارے میں شاد لکھتے ہیں۔

"راجپوت اپنی بے مثل بہادری کی وجہ سے قوم ہنود میں قدیم سے نہایت سربر آوردہ مانے جاتے ہیں۔ اور قدیم سے یہ پشت و پناہ ملک و اقوام و ملت ٹھیرائے گئے ہیں ... ... راجپوت بہادر، صابر، قسمت پر قانع، ذہین، ذکی الطبع قوم ہے۔ کسر ہے تو بس اس قدر ہے کہ میدان عمل میں مغربی اولعزمیوں سے بہت پیچھے ہیں"

شہنشاہ اکبر کا مذہب صلح کل تھا اور اس کی جوہر شناس فطرت نے راجپوت قوم کی عظمت اور شجاعت کو تسلیم کر لیا تھا۔ اکبر کے دل میں اس قوم کے لئے جو عزت تھی اس کا پتہ اس بات سے بھی چلتا ہے کہ اس نے تعصب اور مذہبی پابندیوں سے ہٹ کر راجپوت خاندانوں میں شادی کی۔ راجہ ٹوڈرمل جو راجپوت خاندان سے تعلق رکھتے تھے اکبر کے وزیر تھے۔ یہی وہ ٹوڈرمل ہیں جن سے مہاراجہ شاد اپنا نسبی سلسلہ بتاتے ہیں۔ ان کی تعریف میں شاد یوں رطب اللسان ہیں۔

"اکبری راجہ ٹوڈرمل کے کارناموں اور مخلصانہ خیر اندیشی اور جان نثاری کے تاریخی حالات پر نظر ڈالو تو یہ ثابت ہوگا کہ اجزائے سلطنت کی قوت میں راجہ ٹوڈرمل کی بہت وقعت تھی اور بہت سے راجہ اس کے جاں نثار اور دولت خواہ اس درجہ تھے کہ میدان پیکار میں ان کے جواہر اخلاص نمایاں ہوتے تھے۔ اور وہ دنیا میں پناہ جام و حشم سمجھے جاتے تھے"

مقالہ کے اختتام پر شاد نے قوم اور نسل کے درخشاں مستقبل کے لئے دعا کی ہے۔

گیان درپن

گیان درپن ۱۵ صفحات کا مقالہ ہے۔ سائز ۸½ × ۵½ ہے محبوب پریس علاقۂ پیشکاری میں طبع ہوا۔ سنہ تصنیف و طباعت کہیں درج نہیں فہرست مضامین درج ذیل ہے۔

۱۔ دیباچہ ۲۔ صوفی کس کو کہتے ہیں تصوف کیا چیز ہے ۳۔ تصوف ۴۔ منازل حصول معرفت الہیٰ۔

دیباچہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رسالہ مسٹر گیان سنگھ خالصہ ایڈوکیٹ کی

فرمایش پر لکھا گیا ہے۔ مہاراجہ شاد نے اس طرح اور کئی رسالے اور مضامین اپنے دوستوں کی فرمایش پر خاص طور سے لکھے ہیں۔ اس رسالے کا موضوع تصوف ہے۔ دیباچہ میں اس موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہوئے بتایا ہے کہ مخلص دوستوں کے دلی جذبات کی اثراندازی اور مذاق تصوف نے خامہ فرسائی کا حوصلہ دیا ہے۔ "صوفی کس کو کہتے ہیں اور تصوف کیا چیز ہے" اس عنوان کے تحت بتایا ہے کہ بعض لوگ علم تصوف کو ہندوؤں کا تراشیدہ بت کہتے ہیں اور مذہب اسلام میں اس کی وقعت اور اہمیت کو ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں مہاراجہ شاد انتہائی فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ سری کرشن جی پہلے صوفی تھے جنھوں نے علم تصوف سے دنیا کو روشناس کیا۔ اس لئے قوم ہنود کا یہ دعویٰ حق بجانب ہے کہ دنیا میں جہاں کہیں فلسفۂ تصوف کو فروغ ہوا ہندستان کے فلسفۂ ویدانیت ہی کے اثر سے ہوا۔ وہ لکھتے ہیں۔

> "اس میں شک نہیں کہ تصوف کا فلسفہ نہایت قدیم ہے۔ اس آسمانی تصوف کا آفتاب عالم تاب ہے اول مہاراجہ سری کرشن چندر بنسی ہند کے پیغمبر کا وجود ہے اور جن کے اقوال اور ارشادات کا مجموعی نام گیتا ہے۔ یہ وہ خزانہ ہے جس کے انمول جواہر نہ صرف ہندستان ہی میں شائقین کے گلے کا ہار رہے ہیں بلکہ تمام دنیا کے اہل نظر نے ان کے سودے میں نقد دل و جان دیئے ہیں اور انمول جواہر نے قدردانوں کے تاج کا شرف اور معتقدین کے گلوئے اخلاص کو زیب و زینت دی ہے اس لئے قوم ہنود کا دعویٰ ہے کہ یہ جواہر جو آج کے روز دنیا کے ہر جواہر خانے میں نظر آتے ہیں ہمارے ہی سمندر کے موتی ہیں"۔

اس وضاحت کے بعد مہاراجہ بعض علماء کے اس خیال کو کہ تصوف ہندوؤں کا تراشیدہ بت ہے، بجا بھی تسلیم کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ چونکہ ان میں تعصب ہے اس لئے ان کا بیان مستند نہیں۔ مہاراجہ کا یہ استدلال اور یہ تضاد بیان کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ بیک وقت ہر قوم کے تصوف کو ہندو ویدانیت سے مستفیض بھی سمجھتے ہیں اور جو علماء اسلامی تصوف کو ہندو فلسفہ کا اثر سمجھتے ہیں ان سے اختلاف بھی کرتے ہیں گتھی کو سلجھائے بغیر "دو آمدم بر سر مطلب" کے جملہ معترضہ سے نفس موضوع پر آجاتے ہیں۔ ابتداء میں انہوں نے علم کو دو شعبوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک فلسفہ دوسرے تصوف۔ وہ اس علم کو جو کسی شئے کی اصلیت کی دریافت سے متعلق ہو فلسفہ کہتے ہیں

اور جس علم کا مقصد اپنے نفس کی معرفت حاصل کرنا ہو اسے تصوف کہتے ہیں۔ اس بحث کے بعد مہاراجہ موضوع کو تصوف کے مقاصد اور ان کے ماخذ تک محدود کر دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ طریقۂ صوفیاء کی بنیاد دو باتوں پر ہے۔ ایک بے جا خواہشوں کو ترک کرنا، دوسرے قہر خداوندی کا خوف۔ اس خیال کی تائید میں انہوں نے بعض صوفیاء کے اقوال بھی نقل کیے ہیں۔

تصوف کے باب میں مہاراجہ نے لفظ تصوف کے معنی کی تحقیق کی ہے اور اس کے ماخذ کے تعلق سے انھیں خیالات کو قلم بند کیا ہے جو عموماً کتب تصوف میں ملتے ہیں۔ رسالہ کا اختتام سنکر اچاریہ اور کبیر داس جیسے صوفیوں کے ذکر پر کیا ہے۔

دین حسینؑ یہ مقالہ ۶½ × ۵ سائز کے ۳۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ سنہ تصنیف درج نہیں ہے۔ احمد حسین جعفر علی کے اہتمام سے احمدیہ پریس چار مینار حیدرآباد دکن میں طبع ہوا۔ مہاراجہ نے اس مقالہ میں حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت اور کربلا کے واقعات قلمبند کیے ہیں۔ مقالہ کی ابتداء ذیل کے شعر سے ہوئی ہے ؎

خود شاہ ہے حسین خلافت کا ذکر کیا
اسلام سچ جو پوچھو تو دین حسین ہے

وجہ تصنیف کی صراحت کرتے ہوئے مہاراجہ نے لکھا ہے کہ حضرت خواجہ حسن نظامی نے محرم نامہ کی ایک جلد انھیں دے کر خواہش کی کہ اس پر اپنی رائے کا اظہار کریں۔ چنانچہ مہاراجہ نے یہ رسالہ خواجہ صاحب کی فرمائش پر قلم بند کیا ہے

حضرت امام حسین علیہ السلام کی عظمت اور بلند حوصلگی کی تعریف کرتے ہوئے آخری صفحات میں لکھتے ہیں۔

"حسینؑ پر فدا ہو۔ حسینؑ کے نام پر جان نثار کرو۔ دشت کربلا کی خاک کو خاکِ شفا مانو۔ آنکھوں کا سرمہ بناؤ۔ سعادت کے چہرے کو روشن کرو۔ ناروا کوششوں سے باز آؤ۔ آپس کی کدورتوں میں آگ لگا کر اسے خاک میں ملاؤ۔ حسین کا نام جپو حسین کا کلمہ پڑھو۔ . . . . . .
حسین نے راہِ خدا میں خون بہا کر اور خون بہلانے کر شہنشاہی حاصل کی اور خدائی کے مختار بن بیٹھے اور تم خلافت کو لئے بیٹھے ہو۔"

نورِ چشم یہ مقالہ ½۸ × ½۵ سائز کے ۲۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ سنہ ۱۳۳۸ ہجری م ۱۹۲۰ء میں محبوب پریس علاقہ پیشکاری میں طبع ہوا۔ اس مقالہ کا موضوع اولاد کی تعلیم و تربیت ہے۔ مہاراجہ نے اس تصنیف میں بتایا ہے کہ اولاد کو کن کن خصوصیات کا حامل ہونا چاہئے۔ اور ساتھ ہی ماں باپ کا رویہ اور برتاؤ ان کے ساتھ کس قسم کا ہونا چاہیئے۔ مہاراجہ نے اپنے نانا راجہ نریندر بہادر کے طرزِ عمل اور طریقۂ تربیت سے مثالیں دی ہیں نیز سالار جنگ اول اور اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں بہادر کے حکیمانہ ارشادات بھی نقل کئے ہیں اختتام پر ثاقب بدایونی کا لکھا ہوا قطعہ تاریخ ہے جو ۱۲ اشعار پر مشتمل ہے۔ آخری شعر جس میں تاریخ کہی گئی ہے۔ درج ذیل ہے۔

مصرع سال عرض کر ثاقب — مرحبا چشم نورِ چشم کمال

۱۳۳۸ھ

ابتداء میں لفظ نورِ چشم کے معنوں کی وضاحت کی ہے کہ اس کا اطلاق بیٹے اور بیٹی دونوں پر ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ لڑکی کے لئے علامت تانیث "ی" کا اضافہ کر کے "نورِ چشمی" کہنا قواعد کی رو سے غلط ہے۔ اس لئے کہ فارسی میں مونث کے لئے "ی" نہیں استعمال کی جاتی۔

مہاراجہ کا خیال ہے کہ لڑکے کا مرتبہ بہت بلند ہوتا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں جائز وارث قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے وجود سے بہت سی امیدیں وابستہ رہتی ہیں۔ یہ سب اس صورت میں ہے جبکہ وہ تعلیم یافتہ لائق اور فرماں بردار ہو۔

بچوں کی تعلیم و تربیت اور پرورش کے تعلق سے شاد لکھتے ہیں کہ اس کی ذمہ داری ماں باپ پر ہوتی ہے۔ تعلیم ہی ایک واحد ذریعہ ہے جس سے بچوں کو مہذب اور لائق بنایا جاسکتا ہے۔ اعلیٰ معیار پر زندگی بسر کرنے اور نیک نامی کے حصول کے لئے علم کی بلندیوں کو چھو لینا لازمی ہے۔ ماں باپ کی مسلسل کاوش اور کڑی نگرانی ہی سے بچے تعلیم یافتہ کہلائے جاسکتے اس سلسلہ میں اپنے جد مہاراجہ نریندر بہادر اور سالار جنگ اول کی زندگی کے واقعات کو نمونہ بنا کر پیش کیا ہے کہ ان لوگوں کا برتاؤ کمسن بچوں اور نوجوانوں سے کس قسم کا تھا۔ بچوں کو راہِ راست پر لانے اور زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہ کرنے کے لئے ایسے گر اختیار کئے جاتے تھے کہ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ مہاراجہ نریندر بہادر اور سالار جنگ اول کے طریق تربیت سے متعلق بہت سے واقعات قلمبند کئے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ بچوں کو کس قدر بلند اخلاقی درس دیا کرتے تھے۔ وہ تمام

نفسیاتی طریقے اختیار کئے جاتے جن سے بچوں کے ذہن پر وعظ و نصیحت کی تلخی کا ناگوار اثر پڑنے نہ پاتا تھا۔ ان نصیحتوں کو وہ اپنی نیک نامی اور ترقی کا واحد ذریعہ سمجھتے ہوئے ان پر عمل کرنے لگتے تھے سالار جنگ اول مہاراجہ کو بے حد عزیز رکھتے تھے اور جب کبھی ان کے ساتھ باہر جانے کا موقع ہوتا تو ان کی سہولت اور آرام کا ہر طرح خیال رکھتے تھے۔ سالار جنگ کی تعریف مہاراجہ نے ان الفاظ میں کی ہے۔

"سالار جنگ بے شک فرد نایاب تھے۔ زمانہ ایسوں کو کہاں پیدا کرتا ہے۔ صدیاں گزر جاتی ہیں اور اگر پیدا کرتا ہے تو گوہر شہوار کی طرح یکتائے زمانہ ہوتے ہیں اور پھر ان کا وجود عنقا ہو جاتا ہے اور نظر نہیں آتا۔ افسوس ہے کہ اورنگ آباد کی واپسی کے بعد ایک ہی ہفتہ میں سالار جنگ مرحوم ہو گئے اور وزارت دکن کی کرسی کو خالی کر گئے۔"

اس کے بعد بتایا ہے کہ بچوں سے بے جا لاڈ پیار کا برتاؤ کرنے سے وہ زندگی کے مدوجزر کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں دنیا کا معمولی سے معمولی کام بھی نہیں کر سکتے۔ بچوں کے لئے اچھے معلم کا انتخاب بھی ضروری ہے ورنہ ان کی غلط تربیت سے بچے اپنے ماں باپ ہی کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ یہ تمام غلط تعلیم کے نتائج ہیں۔ مہاراجہ لکھتے ہیں۔

"ہندوستان کی جس تاریخ کو اٹھا کر دیکھئے تو صفحوں کے صفحے باپ بیٹوں یا ماں بیٹوں کی ناچاقیوں سے بھرے پڑے ہیں باپ کا سخت برتاؤ فرزندوں کے ساتھ یا ماں کا دختروں کے ساتھ محبت پدری و مادری میں خلل انداز پایا جاتا ہے جس کا یہ نتیجہ ثابت ہوا ہے کہ باپ نے اولاد کو تعلیم دلانے سے عمداً چشم پوشی کی ہے۔"

اطاعت اور فرماں برداری کے لئے راجہ رامچندر جی کی مثال پیش کی گئی ہے کہ سوتیلی ماں کے حکم کی تعمیل کے لئے انہوں نے تخت و تاج کو چھوڑ کر جنگل کی راہ لی تھی۔ والدین کو اپنے بچوں سے جو بے پناہ محبت ہوتی ہے اس کی صداقت کے لئے حضرت یعقوب علیہ السلام کا واقعہ بیان کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی جدائی کی تاب نہ لا کر رو رو کر انہوں نے اپنی بینائی کھو دی تھی

اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں نے اپنی اولاد کی تعلیم کے لئے جو اعلیٰ انتظامات کئے تھے۔ ان کی ستائش کرنے کے بعد دعا پر رسالہ کو ختم کیا ہے۔ اصل موضوع کی تفہیم و تشریح کے سلسلے میں مہاراجہ نے اپنے بزرگوں اور دوسرے امراء کے جو واقعات لکھے ہیں ان سے حیدرآباد کی گذشتہ تہذیب پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ جس کے ایک بہترین نمایندے خود مہاراجہ تھے۔ اس لئے

کی عبارت اور اسلوب بیان دونوں بہت سادہ اور بے تکلف ہیں۔

موتیوں کی لڑی "موتیوں کی لڑی" حضرت فاروق اعظم رض کے اقوال ونصائح کا مجموعہ ہے جو $8\frac{1}{2}$" × $5\frac{1}{2}$" سائز کے ۲۴ صفحات پر مشتمل ہے ۔
محبوب پریس علاقہ پیشکاری میں طبع ہوا سنہ طباعت درج نہیں ہے۔
اقوال و نصائح کو نقل کرنے سے پہلے صحابہ کرام اور خصوصاً حضرت عمر فاروق رض کے بارے میں بطور تمہید لکھتے ہیں۔

"صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بڑھ کر کوئی سچا مسلمان، مومن اور متقی نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ان سے بڑھ کر کوئی عالم واعظ اور صوفی ہو سکتا ہے بلکہ عقلمندی اور دانائی اور رموز مملکت و سلطنت کا جاننے والا بھی کم ہی نظر آتا ہے۔ چونکہ ان کے کلام، ان کی ہدایات اور نصائح سے جو قیمتی سبق مل سکتا ہے وہ کسی اور جگہ سے نہیں مل سکتا اس لئے حضرت امیرالمومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جو صحابہ کرام میں ایک خاص ممتاز رتبہ رکھتے ہیں ان کے مبارک کلمات وارشادات کو پیش کرکے استدعا کی جاتی ہے کہ مسلمان ان پر غور کرکے مستفید ہونے کے علاوہ صحابہ کی پاک باطنی اولوالعزمی اور صداقت وراست بازی کے جذبات سے بہرہ اندوز ہوں۔"

اقوال ونصائح کی جملہ تعداد (۳۷) ہے۔ ان میں سے دو بطور مثال نقل کئے جاتے ہیں۔

"(۱) دنیا کی تمام چیزوں میں تین چیزیں سب سے اچھی ہیں۔ نیکی کا حکم دینا، برائی سے روکنا، پرانے کپڑے پہننا۔
(۲) جو شخص خود کہے میں عالم ہوں وہ جاہل ہے جو خود کہے میں بہشتی ہوں وہ دوزخی ہے"

ارض الرمل یہ مقالہ جو فن رمل سے متعلق ہے دستیاب نہیں ہوا۔ اس کے بارے میں مہاراجہ شاد اپنی خودنوشت سوانح عمری میں لکھتے ہیں۔

"سنہ ۱۳۰۷ھ میں جد امجد کی وفات کے ایک سال کے بعد میں نے بربنائے ترغیب درویش علی شاہ صاحب قادری رمل سیکھنا شروع کیا۔ شاگردی کا قرعہ ڈالا گیا۔ ساعت نیک مشیت موافق تھی۔ ان کی

بدولت اس علم کے حاصل کرنے کی نیک صورت نکلی۔ چنانچہ میں نے اس علم کے کئی رسالے مطالعہ کئے۔ اور بڑی محنت سے ایک رسالہ بہ نام "ارض الرمل" جو تاریخی نام ہے۔ تصنیف کیا۔ اس میں اکثر نکات ذہن رسائی بدولت میں نے جمع کئے ہیں ابھی ناتمام ہے۔ کاروبار سے اس قدر فرصت کہاں کہ ایسے کاموں کا تکملہ ہو جائے۔ خدا نے چاہا تو اس کا تکملہ کرکے ناظرین کی خدمت میں ہدیتہً پیش کروں گا۔ یہ کتاب ابھی نصف بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ درویش علی صاحب کا انتقال ہو گیا۔[۱]"

اس رسالے کے بارے میں دیوی پرشاد سحر کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"آپ نے ارض الرمل میری مصنفہ کتاب طلب کی تھی ابھی وہ چھپی نہیں اور نہ وہ نام باقی رہا۔ کیونکہ ارض الرمل سنہ ۱۳۰۲ھ کے لئے موزوں تھا۔ جب تو وہ مکمل بھی نہیں ہوئی تھی۔ اب تو سنہ ۱۳۱۲ ہجری ہے کوئی دوسرا تاریخی نام سوچ رہا ہوں۔ مل جائے تو فہو المراد۔ ورنہ سیدھا سادھا کوئی نام رکھ دوں گا۔[۲]"

مقالات کے علاوہ شاد نے مندرجہ ذیل مضامین بھی لکھے ہیں۔

۱۔ ارمغان وزارت (مضامین کا مجموعہ)۔ ۲۔ پریم بھگتی۔ ۳۔ قومی لیڈر ۴۔ قربانی۔ ۵۔ نذر عقیدت۔ ۶۔ تعلیم و تربیت اطفال۔ ۷۔ معرفت نفس۔ ۸۔ دولت کیا چیز ہے۔ ۹۔ ماضی و حال۔ ۱۰۔ تقسیم رگ وید۔ ۱۱۔ سالگرہ مبارک ۱۲۔ ہولی۔ ۱۳۔ صاحب قرآن۔ ۱۴۔ انتقال پر ملال مہاراجہ نریندر بہادر پیشکار۔ ۱۵۔ کامیابی۔ ۱۶۔ نہ ہر زن زن است نہ ہر مرد مرد۔ ۱۷۔ نذر عقیدت۔ ۱۸۔ سری رامچندر جی کی فطرت کا مطالعہ ایک شجاع کی نظر سے۔ ۱۹۔ عرب کا گھوڑا۔ ۲۰۔ گرو گوبند سنگھ اور ہم۔

ارمغان وزارت "ارمغان وزارت" مہاراجہ کے وقتاً فوقتاً لکھے ہوئے مضامین کا مجموعہ ہے جو ۸"×۵" سائز کے (۲۹۸) صفحات پر مشتمل ہے۔ مطبع اختر دکن میں طبع ہوا۔ اس مجموعہ کے تمام مضامین سنہ ۱۳۱۵ ہجری م ۱۸۹۷ء

۱؎ خود نوشت سوانح عمری مہاراجہ بہادر قلمی مخزونہ حیدری گشتی کتب خانہ حیدرآباد دکن

۲؎ رقعات شاد ص ۲۳۰

سے سنہ ۱۳۲۳ ہجری م ۱۹۰۵ء تک کے عرصہ میں لکھے گئے ہیں۔ مضامین کی جملہ تعداد (۳۳) ہے۔ یہ تمام مضامین ایسے ہیں جو رسالہ دبدبۂ آصفی کے مختلف شماروں میں شایع ہوچکے ہیں دوبارہ مجموعہ کی صورت میں شایع کرتے وقت ان پر نظر ثانی کر لی گئی ہے۔

ابتدا میں تقریباً سات صفحات کا دیباچہ ہے۔ اس میں مہاراجہ نے اردو نثر نگاری کے آغاز اور ارتقاء پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ اکثر لوگ اردو نثر نگاری کی ابتداء کا سہرا غالب کے سر باندھتے ہیں۔ لیکن درحقیقت رجب علی بیگ سرور اپنی تصنیف "فسانۂ عجائب" کے باعث اس کے مستحق ہیں۔ سرور اور غالب کی نثر اور ان کے طرز تحریر کی خوبیوں کو اجاگر کرنے کے بعد سرشار کا ذکر کرتے ہوئے ان کی کتاب "فسانۂ آزاد" کو اردو کی بہترین نثری کتابوں کے زمرے میں رکھتے ہیں۔

مہاراجہ شاد کے ناولوں پر سرشار کے طرز تحریر کا جو گہرا اثر پایا جاتا ہے مہاراجہ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ انہوں نے سرشار کے ناول "فسانۂ آزاد" کا بغور مطالعہ کیا تھا چنانچہ ارمغانِ وزارت کے دیباچے میں لکھتے ہیں

"چونکہ پہلے پہل انھیں کے لکھے ہوئے ناول کا میں نے اکثر مطالعہ کیا اور وہی شب و روز ہمدم رہا کرتے تھے۔ لہذا اکثر میری گذشتہ نثر میں ان کی زبان اور خیالات کا رنگ نظر آتا ہے۔"

غالباً اسی زمانے میں لوگ یہ شبہ کرنے لگے تھے کہ مہاراجہ کی نثری تخلیقات خصوصاً ان کے بعض ناول سرشار نے مہاراجہ کو لکھ کر دیئے ہیں۔ اس خیال کی تردید کے لئے انہوں نے اس مجموعۂ مضامین کے دیباچے میں سرشار کے طرز سے اپنی گہری اثر پذیری کا ذکر کیا ہے۔

"ارمغان وزارت" میں جو مضامین ہیں ان کی سلسلہ وار فہرست درج ذیل ہے:

۱۔ سرفرازی۔ ۲۔ اسپیچ سالگرہ مبارک۔ ۳۔ شادی۔ ۴۔ بحر مواج۔ ۵۔ تعصب۔ ۶۔ نمک حرامی۔ ۷۔ سفرنامہ۔ ۸۔ کرۂ قمر۔ ۹۔ ستارہ دنبالہ دار۔ ۱۰۔ شبیر۔ ۱۱۔ محرم الحرام۔ ۱۲۔ قوس قزح۔ ۱۳۔ اسپیچ سالگرہ۔ ۱۴۔ رسم سالگرہ کی تاریخ۔ ۱۵۔ علم طبیعات کا ایک مسئلہ۔ ۱۶۔ حفظ صحت۔ ۱۷۔ اہرام مصریہ۔ ۱۸۔ اسپیچ درجلسہ تقسیم انعام۔ ۲۰۔ زبان کا تعلق شعراء سے۔ ۲۱۔ شباب۔ ۲۲۔ اسپیچ افتتاح لائبریری ۲۳۔ خواب۔ ۲۴۔ سالگرہ مبارک۔ ۲۵۔ بھاکا کی شاعری۔ ۲۶۔ اسپیچ در اجلاس اول کمیٹی جشن چہل سالہ مبارک۔ ۲۷۔ اسپیچ متعلق جشن چہل سالہ۔ ۲۸۔ اسپیچ بروز افتتاح محبوب گنج ضلع اندور۔ ۲۹۔ اسپیچ درجلسہ تقسیم انعام بہ طلبائے

میڈیکل اسکول۔ ۳۰۔ اسپیچ بہ تقریب افتتاح ٹینس کورٹ۔ ۳۱۔ آزادی۔ ۳۲۔ اسپیچ بنیاد مدرسہ آصفیہ۔ ۳۳۔ اسپیچ افتتاح۔

مندرجہ بالا مضامین میں سے "آزادی" اور "اسپیچ افتتاح محبوب گنج" علٰحدہ کتابی صورت میں چھپ کر منظر عام پر آچکے ہیں۔ اور بقیہ مضامین کے بارے میں خود مہاراجہ نے لکھا ہے کہ یہ سارے مضامین رسالہ دبدبۂ آصفی میں وقتاً فوقتاً شایع ہو چکے ہیں۔ اس مجموعۂ مضامین میں اسپیچ کو چھوڑ کر بقیہ تمام مضامین کے عنوانات میں تنوع پایا جاتا ہے۔ بظاہر شاد نے معمولی موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ لیکن مضمون پڑھنے سے ان کے تجربے اور وسعت معلومات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ہر مضمون اپنی جداگانہ نوعیت اور اہمیت رکھتا ہے۔ سماجی، معاشی اور تاریخی مضامین کے علاوہ ادبی اور نفسیاتی موضوعات پر بھی مضامین لکھے ہیں۔ مطالب کو سمجھانے کے لئے زندگی میں روز روز رونما ہونے والے واقعات اور حقایق سے مثالیں پیش کی ہیں۔ ارمغانِ وزارت کے تقریباً سب مضامین شاد کی نثر کے بہترین نمونے ہیں۔ ان مضامین سے نہ صرف ان کی وسیع معلومات کا پتہ چلتا ہے بلکہ ان کے ذخیرۂ الفاظ کی وسعت اور روزمرہ اور محاورہ کو سلیقہ سے برتنے کی صلاحیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

"شادی" اور "خواب" جیسے مضامین میں ان کا قلم خوب جولانیاں دکھاتا ہے ایسے ہی مضامین سے ان کی قدرت بیان کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی عبارت کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں۔

۱۔ "بی بی کہتی ہے کہ آج سورج گہن ہے ہم تو گنگا نہانے جائیں گے۔ بائیس برس کے بعد آج یہ دن آیا ہے۔ آج گنگا جی میں اشنان کرنا کروڑوں ثواب کمانا ہے۔ ہمیں گنگا جانے دو۔ پرمیشور کے لئے نہانے دو میاں چاند گہن اور سورج گہن کے قائل نہیں وہ نظام شمسی اور علم ہیئت کے اصول اور تحقیقات جدیدہ کے مطابق بی بی کو قائل کرنا چاہتے ہیں۔ اور بی بی ان کو کرستان سمجھتی ہے۔ وہ ایک نہیں سنتی اور کہتی ہے کہ ہم ایک نہیں مانیں گے۔ تم تو لامذہب ہو گئے ہو۔"[۱]

۲۔ "سرو کی سرکشی ایسی نظر بند ہے کہ کبھی نظر اس پر پڑتی ہی نہیں، سینہ زوری کے بگولے اس صحرائے لق و دق میں اٹھتے ہی نہیں۔ زلف سنبل کا رنگ

---

[۱] ارمغان وزارت ص ۲۴

سیاہ ہے مگر سیہ کار نہیں ۔ خم بدستور مگر پیچدار نہیں ۔ سرِ شمشاد پر طرہ
ہے مگر طرار نہیں ۔ نرگس کو شوخ چشمی سے سروکار نہیں ۔ دھوپ
اپنا رنگ پھیکا پڑتے دیکھ کر شرم سے ٹل جاتی ہے ۔ نسیم آتی ہے مگر دبے
پاؤں نکل جاتی ہے ۔ صبح کا وہاں گزر کہاں اور یہ مجال اور یہ تاب کہاں
کہ دم مار سکے یا بادِ صبا اپنے نازک پاؤں کی آہٹ سے غنچوں کو ابھار سکے ۔
پھول ہنستے ہیں مگر عقدۂ راز وا نہیں ہوتا ۔ غنچہ چٹختا ہے مگر شور بپا
نہیں ہوتا ۔ مرغ خوش الحان موجود مگر بے نغمہ و صوت گاتے ہیں "

پریم بچن | مہاراجہ نے یہ مضمون آریہ اور خالصہ کی باہمی مخالفت کو دور کرنے کے لئے لکھ کر پنجاب میں تقسیم کرایا تھا ۔ ٩ × ½ ٥ سائز کے ٢٤ صفحات پر مشتمل ہے ۔ محبوب پریس علاقہ بینشکاری میں طبع ہوا ۔

مہاراجہ شاد ایک مرتبہ امرتسر اور لاہور گئے تھے تو انہوں نے آریا سناتن اور خالصہ ہندو اور مسلمانوں سے التجا کی تھی کہ وہ باہمی نفاق کو دور کرکے متحد ہو جائیں ۔ مہاراجہ کے اس معروضہ کو سبھوں نے پسند کیا تھا ۔ اس کے علاوہ علامہ اقبال نے اپنے خط کے ذریعہ بھی مہاراجہ کو اطلاع دی تھی کہ عوام باہمی میل جول پر زور دے رہے ہیں یہ خبر مہاراجہ کے لئے دل خوش کن تھی لیکن چند دنوں بعد پھر پنجاب میں سکھوں اور آریاؤں میں اختلافات شروع ہوئے ان ہی اختلافات کو دور کرنے کے لئے مہاراجہ نے ہر ممکنہ کوشش کی ۔ قوم سے وہ اس طرح مخاطب ہیں ۔

"اے ہندو مسلمان آریہ ' سناتن اور خالصہ بھائیو! میں پرماتما کو سرب
شکتی مان کر اور وحدہ لاشریک کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے قوم کی
نااتفاقی کے تذکرے اور آپس کی خانہ جنگیوں کی خبریں سن کر اس قدر
رنج ہوتا ہے کہ خارج از بیان ہے "

اس رسالے میں مہاراجہ نے متعدد جگہوں پر اپنی بے تعصبی اور وسیع المشربی پر بھی قلم اٹھایا ہے ۔ اور لکھا ہے کہ ان کی طبیعت ابتداء ہی سے فطرتاً بت پرستی کی طرف مائل نہ تھی ۔ ہر مذہب کے پیروؤں سے انہوں نے ملاقات کی اور ہر مذہب کی اچھائیوں کو اپنایا ۔ آخر میں حضرت خواجہ حسن نظامی نے پریم بچن پر ریویو لکھا ہے ۔ جس میں وہ پریم بچن

ارمغانِ وزارت ص ١٦٦

کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"یہ مضمون انشا پردازی اور مہاراجہ کی سلاست زبان کا نمونہ نہیں ہے بلکہ جذبات قلب کا بولتا ہوا مجسمہ ہے۔ وہ اس میں اہل ملک سے جو درخواست کرتے ہیں اس کی معقولیت سے کسی معقول آدمی کو انکار نہیں ہوسکتا۔"

قومی لیڈر قومی لیڈر اٹھارہ صفحات کا مضمون ہے جو ایک رسالہ کی صورت میں شایع ہوا ہے سائز $7\frac{1}{2} \times 5$۔ دارالطبع سرکار عالی میں ٹائپ میں طبع ہوا۔ سنہ طباعت کا پتہ نہیں۔ اس مضمون میں لیڈر یا رہبر کی اہمیت اور ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ لیڈر کے وجود کو ضروری قرار دیتے ہوئے شاد لکھتے ہیں

"اس میں شک نہیں کہ ہر قوم کے لئے ہر زمانہ میں ایک رہبر یا لیڈر کا پیدا ہونا بمصداق لکل قوم ہاد ممکنات سے ہے اور اکثر ایسے ہی ذرایع سے قدرت اپنے عمل کو پورا کرتی ہے۔ اور ان کی رہبری سے گمراہوں کو ہدایت پر لاتی ہے۔ اور وہی سچی رہبری ذریعہ ہو جاتی ہے ہر نیکی کا اور اسی سے ہر قوم اور ہر مذہب کے پاکیزہ خیال رہرو مسلک اتفاق، طریق راستی پر چلنے کے لئے بہ دل و جان آمادہ ہو جاتے ہیں احرام آزادی انھیں کے حکم سے باندھا جاتا ہے۔ ان کا قول قانون اور ان کا ارادہ اپنے مریدوں کے لئے زنجیر تقدیر بن جاتا ہے۔"

اس کے بعد مختلف فرقوں اور قوموں کے ہادیوں جیسے سری کرشن گوتم بدھ، گرونانک کبیر، پیغمبر اسلامؐ اور ان کے صحابہ کی مثالیں دیتے ہوئے ان بزرگ ہستیوں کی قربانی، ایثار بے لوث خدمت خلق اور تعلیم اخوت کا ذکر کیا ہے۔ قوم کی کامیابی کا راز جن باتوں میں مضمر ہے انھیں وضاحت سے اس طرح پیش کیا ہے۔

"جس قوم کے لوگ نیک کردار، ذی شعور عاقبت اندیش ہوں ان کی قوت تدبیر کے نزدیک کسی مشکل کو آسان کر دکھانا دشوار نہیں ہے بشرطیکہ تحمل صبر استقلال جرأت ہمت سے کام لیں اور اصول دانشمندی کے پابند رہیں۔ اگر بہ خلاف اس کے عجلت، تلون مزاجی، خوف ہراس، بدنیتی، خود غرضی شامل احوال ہوگی تو ہرگز کامیابی کی امید نہیں ہوسکتی۔"

آخر میں ہر قوم کے افراد کے لئے دعا کی ہے کہ وہ نیک دید کی تمیز کر سکیں اور یگانگت کو اپنا شیوہ بنائیں۔

قربانی

قربانی دس صفحات کا مختصر مضمون ہے جو دار الطبع سرکار عالی میں طبع ہوا۔ نہ سنہ تصنیف کا پتہ ہے نہ سنہ طباعت کا۔ گائے کی قربانی سے متعلق اس زمانے میں اخبارات اور رسائل میں مسلسل مضامین شایع ہو رہے تھے۔ اس مسئلہ پر مہاراجہ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ اس رسالہ میں انہوں نے اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں اور نواب ناصر الدولہ کے واقعات کا حوالہ دے کر واضح کیا ہے کہ یہ ان کی رعایا پروری کا تقاضا تھا کہ وہ بذات خود گائے کی قربانی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ صرف سنت ابراہیمی کی تکمیل کی نیت سے گائے کی قربانی دیتے تھے۔ اس مسئلہ پر اعلیٰ حضرت کا جریدہ بھی طبع ہوا تھا۔ ان کے فرمان کے بارے میں مہاراجہ لکھتے ہیں۔

> "مجھے اس موقع پر اس امر کے اظہار کی ضرورت ہے کہ ہمارے اعلیٰ حضرت خلد اللہ ملکہ نے جس حکیمانہ اور دانش مندانہ طریقے سے قربانی گاؤ و شتر کے متعلق فرمان جاری فرمایا ہے اس کے متعلق مجھے اپنی معلومات اور تجربے کے لحاظ سے اتنا کہنا ضروری ہے کہ یہ حکم حضرت اقدس و اعلیٰ کا صرف بربنائے صدائے احتجاج ہنود یا کسی فرماں روا کی پیش قدمی کے بعد تقلیداً جاری نہیں ہوا۔ بلکہ اعلیٰ حضرت مدظلہ العالی نے کم سنی کے زمانے سے فطرتاً گاؤ کے گوشت کو بطیب خاطر پسند نہیں فرمایا۔ صرف عید کے موقع پر سنت ابراہیمی کی تکمیل بلحاظ ملت و مذہب کے واجب سمجھتے رہے۔ اس لئے جہاں دنبوں کی قربانی زیادہ تعداد میں ہوتی تھی اس کے نظر کرتے گائے اور اونٹ کی تعداد قربانی میں عشر عشیر بھی نہیں ہوتی تھی۔"

مہاراجہ لکھتے ہیں کہ نواب ناصر الدولہ اپنی رعایا میں ہندو اور مسلمان دونوں کے ساتھ رواداری کا سلوک کرتے تھے۔ دونوں کے جذبات اور عقائد کا خیال رکھتے تھے ان کی بے تعصبی اور رعایا پروری کے بارے میں مہاراجہ نے اپنے نانا مہاراجہ نریندر بہادر سے جو واقعات سنے تھے انھیں بھی قلم بند کیا ہے۔

> "حضرت مرحوم و مغفور کو بھی گائے کے گوشت سے بالکل رغبت نہیں تھی اور جب کبھی عیدین* کے موقع پر قربانی کی اجازت دیتے تو ان الفاظ

* عید

ہیں کہ سنت ابراہیمی اور حکم شرع محمدی ترک نہ ہونے پائے اور یہ فرماتے کہ اس کے سوا اور کوئی غرض ہمارے پیش نظر نہیں ہے ۔ اگر ہے تو یہی ہے کہ ہماری ہندو رعایا جو دوچند ہے مسلم رعایا سے ان کی دلجوئی زیادہ تر ہم پر واجب ہے ۔"

نواب ناصر الدولہ ہولی وغیرہ کے موقع پر ہندوؤں کی خوشیوں میں شریک ہوا کرتے تھے اور بخوشی اپنے کپڑوں پر رنگ ڈالنے کی اجازت دے دیتے تھے ۔ ان کے سامنے تمام ہندو رنگ کھیلتے تھے اور انعام سے سرفراز ہوکر گھر لوٹتے تھے ۔ غرض کہ یہ تاجدار بے تعصب اور وسیع المشرب تھے ۔ رعایا نے اس بارے میں ایک بار غفران مکان نواب میر محبوب علی خاں کا امتحان بھی لیا ۔ اعلیٰ حضرت اس چال کو سمجھ گئے اور اس واقعہ کے بعد سے انہوں نے گائے کا گوشت کھانا بالکل ترک کردیا تھا ۔

مہاراجہ نے نواب میر عثمان علی خاں کی بے تعصبی اور رعایا پروری کے واقعات کے ذکر پر رسالہ کو ختم کیا ہے ۔ قربانی کے مسئلہ پر مذہبی اخلاقی سماجی یا معاشی نقطہ نظر سے کوئی روشنی نہیں ڈالی ۔ رسالہ کے مطالعہ سے صرف اس قدر واضح ہوتا ہے کہ وہ رواداری کے جذبہ سے اپیل کررہے ہیں ۔ اس سلسلہ میں انہوں نے حسب عادت دکن کے فرماں رواؤں کی بے تعصبی اور رواداری کے واقعات بطور نظیر پیش کئے ہیں ۔

نذر عقیدت یہ مضمون غالباً ایک مستقل رسالہ کی صورت میں شایع ہوا ہے مقالہ نگار کو یہ مضمون دستیاب نہیں ہوا ۔ "آئینہ عقیدت" کے مقدمہ میں ابو الاشرف مجید آغائی ابو العلائی نے اس مضمون کا ذکر کیا ہے اور اس کے چند فقرے بھی نقل کئے ہیں ۔ ذیل میں ابو العلائی صاحب کی عبارت ہو بہو نقل کی جاتی ہے

"آپ نے سالگرہ ہمایونی کے مبارک موقع پر نذر عقیدت کے عنوان سے ایک گراں قدر مضمون حوالہ قلم فرمایا ہے ۔ جس سے دنیا روشناس ہوچکی ہے اس کے ہر پہلو پر نظر ڈالئے تو صداقت اور عقیدت سے لبریز نظر آتا ہے ۔ عبارت کی شان خود بتلاتی ہے کہ ایک سچے دل کی صدائے حقیقت ہوں اور ہزاروں صداقت وفاداری کے انداز اپنے ساتھ لئے ہوئے ہوں ۔ یہاں چند سطور بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں ۔"

ہمارے شہریار نظام الملک آصف جاہ سابع کی سالگرہ ان بادشاہوں کی سی سالگرہ نہیں جو اس طرح اپنے سطوت و جبروت کی یادگار قائم

کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ ایک ایسے فرمان روا کی سالگرہ ہے جس کی نصفت پروری وعدل گستری رعایا نوازی و بیدار مغزی علم دوستی و نکتہ سنجی اس وقت ضرب المثل کی صورت اختیار کر چکی ہے یا ایک ایسی ذاتِ گرامی کی سالگرہ ہے جو لباس شاہی میں رحمت خداوندی اور سر بہ سر حکمت پر برکت ربانی ہے جو اپنی سادہ زندگی کے لحاظ سے اسوۂ نبوی و سیرت خلفائے راشدین کی یاد تازہ کرنے والا اور اخلاق کے اعتبار سے قرونِ اولیٰ کے عہد کو زندہ کرنے والا ہے۔ پھر میں جو کچھ کہہ رہا ہوں شاعرانہ مبالغہ نہیں ہے بلکہ اظہار ہے حقیقت کا اور وہ بھی نا تمام بیان ہے واقعات کا اور وہ ناقص و نامکمل۔ کیونکہ اگر اس ذات گرامی کے تمام صفات بیان کرنا چاہیں تو سراسر وہم و خیال[۱] ہے۔"

تعلیم و تربیت اطفال

یہ مضمون رسالہ حسن جلد سوم نمبر (۱۱) میں ماہ نومبر ۱۸۹۰ء میں شائع ہوا۔ ½۸" × ½۵" سائز کے ۱۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مضمون میں مہاراجہ نے بتایا ہے کہ انسان کا ذہنی ارتقاء بچپن ہی سے ہوتا ہے اور تمام اعلیٰ صلاحیتیں ودیعت خداوندی ہیں جو بچہ کی اچھی تربیت کے ساتھ منجھتی اور نکھرتی جاتی ہیں۔ اس لئے مہاراجہ نے بچوں کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے مسئلہ کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیا ہے۔ بچوں کی ابتدائی تعلیم کے بارے میں شادؔ لکھتے ہیں۔

"زمانۂ طفولیت ہی ایک ایسا وقت ہے جس میں ہر قسم کی تعلیم و تربیت کی صلاحیت ہو سکتی ہے۔ خیالات میں لچک اور عادات میں خامی کچھ ایسی پائی جاتی ہے کہ جدھر قوت کے ساتھ موڑ دیئے جائیں اسی طرف ترقی ہوگی اور اگر اپنے ہی حال پر چھوڑ دیئے جائیں تو ایک روز پختگی حاصل کرنے پر نا قابل اصلاح ہو جائیں گے۔

تعلیم اور تربیت کو لازم و ملزوم قرار دیتے ہوئے شادؔ لکھتے ہیں کہ جس طرح دولت اور علم ایک دوسرے کے لئے لازمی ہیں اسی طرح تعلیم اور تربیت کا ساتھ ساتھ ترقی کرنا ضروری ہے۔ بچوں کی دماغی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے شادؔ نے اس بات کو لازمی قرار دیا ہے کہ بچے کو ایسا مناسب ماحول فراہم کیا جائے جس میں پرورش پا کر وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو ابھار سکے

---

[۱] مقدمہ آئینۂ عقیدت ص ۹، ۱۰

اس کے لئے مہاراجہ نے اس بات کو ضروری قرار دیا ہے کہ بچے کے ہر سوال کا ٹھیک اور تشفی بخش جواب دیا جائے۔ بے جا روک ٹوک اور ڈانٹ سے بچے کا ذہنی ارتقاء رک جاتا ہے۔

معرفت نفس شاد کا یہ مضمون دکن ریویو ص ۱، نمبر ۱۱ جلد اول ستمبر ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا ہے ۸½ × ۵ سائز کے ۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مضمون میں شاد نے بتایا ہے کہ عشق الہی کے لئے کسی مذہب کی قید نہیں ہے آدمی خواہ کسی مذہب کا ہو اپنے حقیقی معبود کی تلاش میں ساری عمر صرف کر سکتا ہے۔ شاد لکھتے ہیں۔

"عشق حقیقی کے پاک صاف راستے پر جو لوگ گام فرسا ہیں وہ اچھی طرح سے جان سکتے ہیں کہ اس سیدھی راہ میں کفر و دین کے جھگڑے سنگِ راہ سے کم نہیں ہیں۔ بے شک یہ امتیاز اور فرق پیدا کرنے والے خیالات بڑے بڑے پتھر بن کر سد راہ ہو جاتے ہیں جس سے اندھیرے میں چلنے والے ٹھوکریں کھا کھا کر منہ کے بل گر پڑتے ہیں۔ اور اس اعلیٰ ترین مقصد عبودیت تک رسائی حاصل کرنے میں کوتاہ دست رہ جاتے ہیں۔ بہ خلاف اس کے عشق حقیقی کی مشعل ہاتھ میں لئے ہوئے انسان بلا خوف و خطر سب گھاٹیاں طے کر کے منزل مقصود پر پہنچ سکتا ہے۔"

دولت کیا چیز ہے یہ مضمون دکن ریویو ص ۱ نمبر ۶ جلد دوم ماہ جون میں شایع ہوا ہے۔ ۹ × ۶ سائز کے تقریباً ۸ صفحات پر مشتمل ہے مضمون کی ابتدا میں مہاراجہ شاد نے لفظ "دولت" کے لغوی اور مجازی معنی بتائے ہیں اور اس بات پر اظہار افسوس کیا ہے کہ اکثر لوگ دولت کا صحیح مفہوم نہیں سمجھتے۔ حالانکہ دولت کا مفہوم صرف پیسہ ٹکا ہی نہیں۔ دولت مند افراد عموماً اپنی دولت جس طرح پامال کرتے ہیں اس کو شاد نے اپنے مخصوص انداز میں اس طرح لکھا ہے۔

"ہم میں سے جس کو خداوند تعالیٰ ذی حیثیت و مالدار کرتا ہے اس کے لئے دو باتوں میں سے ایک بات لازم ہو جاتی ہے۔ یا تو وہ روپیہ کو قارون کی صورت زمین میں دفن کر کے خزانے کا سانپ بن جاتا ہے۔ اور آخر کو مٹی اپنے اندوختہ کی طرح پیوند خاک ہو جاتا ہے یا اس سرمایہ سے یہ کام لیا گیا کہ جلسے کئے، ناچ دیکھے، کھانے کھلانے خریدے، پیرمغاں بن بیٹھے۔ سینہ زن کی طرف جھک پڑے تو تن کے تن صاف کر دیئے۔ مدک، گانجہ، چانڈو کا چسکا پڑا تو وہ چھینٹے

اڑائے کہ اس کے دھوئیں کا زیر آسمان ایک اور آسمان قائم ہوگیا۔ جھنگ یعنی شروع کی تو ابلیسی پی کہ مہادیو جی کے بھی کان کاٹے کسی نے کچھ پوچھا تو کہا "مہادیو جی کا چرن امرت ہے" اس سے زیادہ نیامی پر کمر باندھی تو یہ ہوا کہ تاڑ کے درختوں کو جن سے تاڑی اترتی ہے سنہرے کپڑے پہنائے گئے۔ پھر کیا تھا کلالوں کی چاندی ہوگئی۔ اور ان کی بادہ خواری نے بخت کی سازگاری کو ملیا میٹ کردیا۔ ادھر مے فروشوں کی بختیاری نے مسند سرداری پر ان کے قدم جما دیئے۔ وہ مالدار و سرمایہ دار ہوگئے اور یہ مفلس و نادار۔"

ماضی و حال

یہ مضمون میونسپل گزٹ لاہور کے عثمان نمبر میں ص ۹۱ تا ۹۷ شایع ہوا ہے سنہ طباعت ۱۹۲۸ء ہے ۱۰" × ۷" سائز کے تقریباً سات صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتداء میں ایڈیٹر نے مہاراجہ کے خاندانی وصاف اور ان کی علمی و ادبی سرگرمیوں کو سراہا ہے۔ اور لکھا ہے کہ مہاراجہ شاد نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود عثمان نمبر کے لئے مضمون پیش کیا ہے۔

اس مضمون میں شاد نے زمانۂ ماضی کی مشہور ہستیوں کے حالات اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے زمانہ حال کے لوگوں سے ان کا مقابلہ کیا ہے اور دعا کی ہے کہ اسلاف کی خوبیاں ہم میں بھی آجائیں۔

تقسیم رگ وید

مہاراجہ کا یہ مضمون دبدبہ آصفی میں پندرہ قسطوں میں شایع ہوا ہے ان میں سے تیرہ قسطیں دستیاب ہوئی ہیں۔ ۶/صفر ۱۳۱۹ھ اور ۶/ربیع الاول ۱۳۱۹ھ کی قسطیں نہیں ملیں۔ چونکہ درمیانی دو قسطیں نہیں دستیاب ہوئیں اس لئے مضمون کے صفحات کی تعداد نہیں بتائی جاسکتی۔

اس طویل مضمون میں مہاراجہ نے وید کے مختلف منتروں اور بھجنوں وغیرہ کی تعداد بتائی ہے اور لکھا ہے کہ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ضخیم تالیف کی ترتیب باقاعدگی سے کی گئی ہے۔ مہاراجہ نے لکھا ہے کہ وہ اپنے اس مضمون میں اس مسئلہ کو اٹھانا نہیں چاہتے کہ روح دراصل کیا شئے ہے بلکہ وہ صرف ہندو فلسفہ سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔ پورے مضمون میں مہاراجہ نے وید کے مختلف ابواب کی تفصیلی فہرست دی ہے اور ہر باب میں جن دیوتاؤں اور دیویوں وغیرہ کا ذکر آیا ہے ان سب پر روشنی ڈالی ہے۔

سالگرہ مبارک

شاد کا یہ مضمون دبدبۂ آصفی نمبر ۱ جلد ۸، ۹ ربیع الثانی ۱۳۲۲ھ م ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا ہے۔ ½۹ × ½۶ سائز کے تین صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ مضمون مہاراجہ نے اعلیٰ حضرت غفران مکان کی انتالیسویں سالگرہ کے موقع پر لکھا ہے۔ سالگرہ کی رسم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ رسم مشرقی اور مغربی ممالک میں تہذیب اور اخلاق کی ترقی کے ساتھ بڑھتی گئی ہے۔ آخر میں شاد نے بادشاہ وقت کی درازیٔ عمر کے لئے صدقِ دل سے دعا مانگی ہے۔

ہولی

یہ مضمون دکن ریویو نمبر ۷، جلد سوم مئی سنہ ۱۹۰۹ء میں شائع ہوا ہے۔ ۸ × ۵ سائز کے سات صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتداء میں مہاراجہ نے بتایا ہے کہ ہندوؤں میں جو چار ذاتیں ہیں یعنی برہمن، کھتری، ویش اور شودر ان کے کام اور فرائض منصبی کیا ہیں مہاراجہ نے یہ بھی بتایا ہے کہ ان فرقوں کے لئے عیدیں بھی مختص ہیں۔ سہراونی، دسہرہ، دیوالی اور ہولی۔ ہولی کا تہوار شودروں کے لئے مخصوص تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ تابعداروں کی دلجوئی کے لئے سلاطین بھی اس میں حصہ لینے لگے۔ ہولی کے تہوار کو بلند مرتبہ بخشنے والے سری کرشن جی ہیں۔ ان ہی کے زمانے سے یہ تہوار مقبول عام ہوا۔ آخر میں مہاراجہ نے لکھا ہے کہ گذشتہ زمانے میں اس تہوار کے موقع پر جو بدتہذیبی ہوا کرتی تھی وہ ختم ہوگئی ہے اور چونکہ یہ دور تعلیم یافتہ لوگوں کا دور ہے۔ اس لئے ہر چیز اعتدال پر آگئی ہے۔ اس بارے میں مہاراجہ لکھتے ہیں۔

> "اب نہ کوئی غلیظ رنگ یا ناپاک پانی بھر کر پچکاریوں سے مینہ برساتا ہے اور نہ کوئی خاک دھول عبیر کی جگہ اڑاتا ہے اور نہ گوبر، کیچڑ کی بوچھاڑ ہوتی ہے...... البتہ اس کی بوباس ہے بھی تو نخفیف رذالوں میں یا بوڑھے فل اعوذیوں میں جن کے دامن میں اس بیچاگ نے پھل پھول کر اپنا جوبن ابھارا ہے۔"

صاحب قرآن

یہ مضمون رسالہ دبدبۂ آصفی نمبر ۷، جلد ۲، ۴ شوال سنہ ۱۳۱۶ھ م ۱۸۹۸ء میں شائع ہوا ہے۔ ۹ × ½۵ سائز کے دو صفحات پر مشتمل ہے۔ صاحب قرآن کے بارے میں مہاراجہ لکھتے ہیں۔

> "یہ وہ صاحب قرآن ہے کہ جو ملقب بہ گیتی ستان ہے اس بہادر کی تیغ کا لوہا جن لوگوں نے مان لیا ہے ان کے دلوں سے پوچھا چاہیے کہ اس شجیع دلیر، شیر نیستان رزم کے پنجے سے کیسے کیسے دل نعیب خوف زدہ اکھڑے ہونگے۔"

آگے اسی کی بہادری اور فرماں روائی کے بارے میں مہاراجہ لکھتے ہیں۔

"بیالیس برس کی عمر تک اسی کا اوج زوال پذیر نہ ہوا۔ ایران، ترکان
دتوران کے کل فرماں رواؤں نے اس بہادر کی قوت بازو اور چمکتی ہوئی
تیغ کے سایہ میں اس کے تخت کی حکمرانی حاصل کرنے سے جو عزت پائی اس
کا ہر ایک معترف ہے۔"

نہ ہر زن زن است نہ ہر مرد مرد

یہ مضمون رسالہ تزک عثمانیہ جلد ۳ نمبر ۵ ماہ ذی قعدہ سنہ ۱۳۳۴ھ م ۱۹۱۵ء میں شایع ہوا ہے۔ ۸" × ۵½" سائز کے ۲۷ صفحات پر مشتمل ہے ابتداء میں مہاراجہ نے رام چندرجی کی سیرت اور ان کے کردار پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے بارے میں مہاراجہ نے لکھا ہے کہ وہ نہ صرف بہادر تھے بلکہ معرفت اور حقیقت کی محفل میں بھی بالا نشینی کا درجہ رکھتے تھے۔ اس مضمون میں مہاراجہ نے رام چندرجی کی راون سے لڑائی کے واقعات کو بھی اپنے مخصوص انداز میں قلم بند کیا ہے۔ رام چندرجی پر مہاراجہ شاد کا یہ تیسرا مضمون ہے اس سے قبل مہاراجہ نے "دسہرا" اور "سوریہ پرکاش" میں رامچندرجی کی سیرت شخصیت اور ان کے دیگر کارناموں کو قلم بند کیا ہے۔

انتقال پُرملال مہاراجہ نریندر بہادر

مہاراجہ کا یہ مضمون رسالہ حسن جلد دوم نمبر ۹ ستمبر ۱۸۸۹ء میں شایع ہوا ہے ۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ مہاراجہ نے اس مضمون میں اپنے نانا راجہ نریندر بہادر کے اوصاف داخلاق، ان کے مذہبی عقائد اور ان کے کردار پر روشنی ڈالی ہے۔ آخر میں ان کی علالت اور انتقال کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ ابتدائی فقروں میں موت کے فلسفہ پر لکھتے ہیں۔

"اللہ اللہ موت وہ شئے ہے جو ہر ذی روح کے لئے امر لازمی ہے۔
ایک دن سب کے لئے فنا ہے۔ گوشۂ قبر میں آرام کرنا ہے۔ دنیا و مافیہا
سے ہاتھ دھونا ہے۔ اس سے کسی کو نجات نہیں کسی کو ہمیشہ کے لئے حیات نہیں
عجب حیرت ہے اور کیسی غفلت ہے کہ ہوشیاری نہیں عجب نیند ہے کہ جس کو
بیداری نہیں۔ ۔ ۔ ۔ یہ ایسی سخت بلا ہے کہ جس کی دعا نہیں۔"

کامیابی

یہ مضمون سالنامہ رہبر دکن بابتہ ۱۳۳۹ھ م ۱۹۲۹ء میں شایع ہوا ہے۔ ۶" × ۹½" سائز کے تقریباً ڈیڑھ صفحہ پر مشتمل ہے۔ کامیابی کے مفہوم کی وضاحت کرنے کے بعد مہاراجہ

نے ایسی باتیں بتائی ہیں جن میں کامیابی کا راز پوشیدہ ہے۔ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں۔

"کامیابی کا راز ہمت کی سچائی، استقلال کی پامردی اور کوشش کی جفاکشی میں پوشیدہ ہے۔ انسان اس وقت تک اپنے ارادوں میں کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک ان اوصاف کو اپنا حقیقی مسلک اور مقصد اعلیٰ نہ سمجھے۔"

کامیابی کے حصول کے سلسلے میں مہاراجہ نے دنیا کے سربرآوردہ لوگوں کی زندگی کی مثالیں پیش کی ہیں۔ جنھوں نے کافی جد وجہد کے بعد ترقی کی منزلوں کو طے کیا اور نام پیدا کر گئے۔ آخر میں مہاراجہ لکھتے ہیں کہ اگر موجودہ زمانے کے لوگ بھی اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلیں تو کامیابی یقینی ہے۔

نذرِ عقیدت

یہ مضمون روزنامہ صبح دکن سالگرہ نمبر سنہ ۱۳۵۱ ہجری مطابق ۱۹۳۲ء میں شایع ہوا ہے۔ ۹ × ۱۲ ½ سائز کے ایک صفحہ پر مشتمل ہے۔ اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خاں کی سالگرہ کے موقع پر یہ مضمون لکھا گیا ہے ان کی اس سالگرہ کے بارے میں مہاراجہ شاد لکھتے ہیں۔

"یہ ایک ایسے فرماں روا کی سالگرہ ہے جس کی نصفت پروری و عدل گستری، رعایا نوازی و بیدار مغزی، علم دوستی و نکتہ سنجی اس وقت ضرب المثل کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ ایک ایسی ذات گرامی کی سالگرہ ہے جو لباس شاہی میں رحمت خداوندی اور سریر حکومت پر برکت ربانی ہے جو اپنی سادہ زندگی کے لحاظ سے اسوۂ نبوی و سیرۃ خلفاء راشدین کی یادگار تازہ کرنے والا اور اخلاق کے اعتبار سے قرون اولیٰ کے عہد کو زندہ کرنے والا ہے۔"

اس کے بعد مہاراجہ نے اعلیٰ حضرت کی ان خدمات کو سراہا ہے جو انھوں نے اپنے ملک کے رفاہ عام کے لئے انجام دیں۔ مضمون کے اختتام پر اعلیٰ حضرت کی درازی عمر کی دعا کی ہے۔

سری رامچندر جی کی فطرت کا مطالعہ ایک شجاع کی نظر سے

مہاراجہ کا یہ مضمون سالنامہ رہبر دکن سنہ ۱۹۳۳ء میں شایع ہوا ہے ۹ × ۱۲ ½ سائز کے تقریباً ڈھائی صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مضمون میں مہاراجہ نے رام چندر جی کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر

روشنی ڈالی ہے اور ان کی شخصی خوبیوں کو اجاگر کیا ہے۔ سیتاجی سے شادی کے واقعہ کو تفصیل سے لکھا ہے اس کے بعد راون سے لڑائی کا ذکر ہے۔ رامچندرجی اپنی سوتیلی ماں کے کہنے پر لچھمن اور سیتا کے ہمراہ بن باس کے لئے چلے جاتے ہیں۔ وہاں راون موقع دیکھ کر سیتا کو لے کر چلا جاتا ہے۔

سیتا کو حاصل کرنے کے لئے رامچندرجی راون سے لڑائی کے لئے جاتے ہیں اور راون کو شکست دے کر سیتاجی کو حاصل کر لیتے ہیں۔ ان تمام واقعات کو مہاراجہ نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مضمون کے ختم پر انہوں نے رامچندرجی کی شجاعت کی داد دی ہے۔ رامچندرجی پر مہاراجہ شاد کا یہ چوتھا مضمون ہے۔

عرب کا گھوڑا — مہاراجہ کا یہ مضمون رسالۂ ذخیرہ جلد نمبر ۴ - نمبر ۲ فروری سنہ ۱۹۱۷ء میں شائع ہوا ہے۔ $9\frac{1}{2} \times 6\frac{1}{2}$ سائز کے تین صفحات پر مشتمل ہے۔ مضمون کی ابتداء میں مہاراجہ نے عرب کے گھوڑے کی صفات بیان کی ہیں۔ اس کی جسامت ڈیل ڈول کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کی ہیں اور اس کی وفاداری کو تاریخی حقائق کی روشنی میں پیش کیا ہے۔

گرو گوبند سنگھ اور ہم — یہ مضمون سفرنامہ "جام جہاں نما" میں شائع ہوا ہے۔ $6\frac{1}{2} \times 10$ سائز کے تقریباً سات صفحات پر مشتمل ہے۔

گروجی سے متعلق سید محمد لطیف نامی ایک مورخ کے حسب ذیل جملے نقل کئے ہیں۔

"تمام مورخ گرو گوبند صاحب کی خوبیوں پر متفق ہیں۔ ان میں ایک مذہبی پیشوا اور جنگ آزمودہ سپاہی کے اوصاف مجتمع تھے۔ گدی پر دھرم اپدیش کرتے تھے۔ میدان جنگ میں سورما، مسند پر بادشاہ، خالصہ جی کی سنگت میں فقیر"

گرو صاحب کی تعلیم کے بارے میں مہاراجہ لکھتے ہیں کہ ان کے اصولوں میں فرائض مذہبی اور فرائض تمدنی کو بہت اہمیت تھی۔ نیز وہ وسیع المشرب اور بے تعصب تھے۔

متفرق

لطائف بے نظیر — اس مقالے کے دیباچے میں مہاراجہ نے بتایا ہے کہ انہوں نے چند لطائف اور سوال جواب کو فارسی زبان سے اردو میں ترجمہ کیا ہے یہ نہیں بتایا کہ کس فارسی کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔ اس ترجمہ کا انہوں نے بہ لحاظ موضوع "لطائف بے نظیر" تاریخی نام رکھا ہے جس سے سنہ ۱۳۰۲ ہجری نکلتا ہے ممکن ہے کہ یہ رسالہ پہلی مرتبہ اسی سنہ میں شائع ہوا ہو۔ لیکن مقالہ نگار کو طبع اول کا

نسخہ ملا، ۱۳۰۷ھ ہجری مطابق سنہ ۱۸۹۰ء میں دوبارہ یہ رسالہ مطبع افسرالاخبار دکن میں طبع ہوا۔ "۹ × "½۶ سائز کے (۳۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ رسالہ کو حسبِ ذیل چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ نکات۔ ۲۔ نصائح۔ ۳۔ سوال وجواب۔ ۴۔ لطائف وظرائف پہلے باب میں ۲۹۔ نکات ہیں جن میں سے چند یہاں بطور نمونہ نقل کئے جاتے ہیں۔

۱۔ جس کو عشق نہیں دیدارِ الٰہی سے محروم ہے۔

۲۔ بزرگوں کا قول ہے کہ دنیا میں جس کو باپ نہیں سایہ نہیں، بھائی نہیں تو قوتِ بازو نہیں۔ عورت نہیں تو آرام نہیں ۔۔۔ اولاد نہیں تو گھر کا چراغ نہیں۔ اور اگر کوئی بھی نہیں تو کچھ غم نہیں۔ خس کم جہاں پاک۔

۳۔ فقیر وہ ہے کہ اول طمع نہ کرے جب کوئی دے تو انکار نہ کرے۔ جب دے تو جمع نہ کرے

۴۔ "دشمنوں میں ایسی بات کر کہ اگر وہ دوست ہو جائیں تو تو شرمندہ نہ ہو اور اپنے تمام حالات دوست سے ظاہر نہ کر شاید کہ کبھی دشمنی ہو جائے اور دشمن سے کبھی بدی نہ کر شاید کبھی دوست ہو جائے۔"

دوسرا باب نصائح کا ہے جس میں جملہ ۹ بند ہیں یہاں مثال کے لئے صرف تین نقل کئے جاتے ہیں۔

۱۔ "اپنے عیوب سے آگاہ ہو۔ غیروں کے عیوب سے انجان رہو۔"

۲۔ "جھوٹ ہرگز نہ بول۔ راہ ناراستی سے درگزر کہ کاذب ہمیشہ خوار اور بے اعتبار رہتا ہے۔ اور لعنتی ہوتا ہے۔ بمصداق لعنۃ اللّٰہ علی الکاذبین"

۳۔ "جو کوئی کام کرے پہلے اس کے سرانجام کے لئے بارگاہ الٰہی میں التجا کرے۔ کیونکہ فاضل حقیقی وہی ہے۔ بغیر امداد اور ارادے اس کے کوئی کام تمام نہیں ہوتا"

تیسرا باب سوال وجواب کا ہے۔ سوال جواب کی تعداد (۵۰) ہے یہ سوالات زندگی کے اکثر اہم پہلوؤں سے متعلق ہیں۔ اور نہایت عالمانہ اور فلسفیانہ انداز میں جوابات دیئے گئے ہیں اکثر سوالات کا تعلق اخلاقیات سے ہے۔

چند سوال وجواب درج ذیل ہیں۔

۱۔ سوال۔ عزت کس چیز سے ہوتی ہے؟

جواب۔ کم کہنے سے۔

۲۔ سوال۔ کس کی نیکی اللہ کے نزدیک مقبول ہے؟

جواب۔ جو نیکی ماں باپ اور خویش و اقارب سے کرتے ہیں۔

۳۔ سوال۔ فقر کیا چیز ہے۔؟

جواب ف سے فاقہ۔ ق سے قناعت ر سے ریاضت

۴۔ سوال۔ دوست کون ہے؟

جواب۔ جو عیب چھپا دے اور ہنر ظاہر کرے۔

چوتھا باب لطیفوں کا ہے جو بارہ لطیفوں پر مشتمل ہے۔ کوئی لطیفہ ایسا نہیں ہے جس میں تہذیب و شائستگی کی حدوں سے تجاوز ہوا ہو۔ دو لطیفے بطور نمونہ پیش ہیں۔

۱۔ "ایک بدصورت کسی نیک صورت مرد کے نکاح میں آئی۔ وہ مرد اس عورت کی صورت سے آزردہ ہوا۔ ایک روز اس عورت نے اپنے خاوند سے دریافت کیا کہ تیرے خویش و اقارب بہت سے ہیں۔ کس سے پردہ کروں اور کس سے نہیں۔ مرد نے جواب دیا کہ اے بیوی! میرے سوا اور کسی سے بھی پردہ نہ کر۔"

۲۔ "کسی تونگر نے اپنے لئے ایک مقبرہ تیار کرایا۔ جب تیار ہو چکا بغرض نظارہ آیا اور معماروں سے پوچھا کہ اس عمارت کو اور کیا چیز چاہئے۔ استاد معماران نے جو ظریف الطبع تھا کہا کہ آپ کا وجود شریف۔"

ترجمہ کے باعث زبان میں کہیں کہیں تعقید آگئی ہے۔ ورنہ مہاراجہ کی زبان عام طور پر بہت سبک اور رواں ہوتی ہے۔

ضلع جگت

ضلع جگت ۸۳ صفحات کا رسالہ ہے۔ سائز $5\frac{1}{2} \times 8\frac{1}{2}$ سنہ تصنیف ۱۳۲۳ ہجری م ۱۹۰۵ء ہے مطبع اختر دکن میں طبع ہوا

پہلے صفحہ پر "نذر" کے زیر عنوان اس تصنیف کو نواب میر محبوب علی خاں نظام الملک آصف جاہ کی خدمت میں نذر گزراننے کا فخر حاصل کیا ہے۔ نذر کے بعد چار صفحوں کا دیباچہ ہے جس میں ضلع اور جگت دونوں لفظوں کے معنی کی تحقیق کی ہے وہ لکھتے ہیں۔

"ضلع اور جگت دو زبانوں کے دو لفظ جداگانہ ہیں اور لغتہً معنی بھی جدا رکھتے ہیں مگر دونوں میں فی الجملہ مناسبت ہونے سے ضلع جگت کا استعمال ایک ساتھ ہو گیا ہے۔ ضلع عربی میں پہلو کو کہتے ہیں۔ اردو زبان میں تلازم و رعایت لفظی کے معنی میں مستعمل ہے۔ بولنا اس کا طلہ

آتا ہے جیسے ضلع بولتے ہیں یا ضلع باز ہیں یعنی رعایت لفظی کے ساتھ بولنے میں مشتاق ہیں ۔ جگت ہندی کا لفظ ہے اصل معنی حکمت و دانائی کے ہیں ۔ لیکن اربابِ اردو ظرافت و بزلہ سنجی کی جگہ اس کا استعمال کرتے ہیں ۔ لطیفہ گو کو جگت باز اور لطیفہ گوئی کو جگت بازی کہتے ہیں ۔ جگت لڑنا بھی روزمرہ ہے جیسے نواب مرزا شوق نے مثنوی میں کہا ہے ؎

چوٹی لپٹی تھی باسی ہاروں سے
لڑ رہی تھی جگت کہاروں سے

اور جگت باز کو جگت رنگ بھی کہتے ہیں ۔ یہ محاورہ خاص اہلِ لکھنو کا ہے ۔"

ضلع جگت پر اس سے پہلے کوئی مکمل اور مستند رسالہ نہیں لکھا گیا تھا ۔ مہاراجہ کی نظر سے ضلع جگت کا ایک نامکمل قلمی رسالہ گزرا جس میں کسی نے اردو، فارسی اور عربی کے چند مخلوط الفاظ جمع کر دیئے تھے ۔ اس نامکمل اور ناقص رسالہ کو دیکھ کر مہاراجہ شاد کو شوق ہوا کہ کیوں نہ ایک مکمل رسالہ اس موضوع پر پیش کیا جائے ۔ اس رسالہ کی تیاری میں مہاراجہ نے اختر مینائی اور جلیل مانک پوری سے مدد لی جس کا اعتراف انہوں نے شکریہ کے ساتھ کیا ہے ۔

اس کتاب میں جملہ ۶۶ ۔ چیزوں کا ضلع ہے مثلاً برسات کا ضلع، دریا کا ضلع اور ندی کا ضلع، اسپ کا ضلع وغیرہ ہر ضلع میں کئی لفظوں کی مثالیں دے کر ان کا استعمال بتایا ہے ۔ برسات کے ضلع سے چند مثالیں یہاں دی جاتی ہیں ۔

"۱۔ مطلع صاف ہوگیا ۔ ۲۔ خوب طوفان اٹھایا ۔
۳۔ دشمنوں کا زور گھٹا ۔ ۴۔ آج ہم نے شرط بدلی ہے
۵۔ راہ پانی مشکل ہے ۔ ۶۔ وہ مجھ پر برس پڑے ۔"

اسی طرح ہر چیز کے ضلعوں کو بڑی کاوش سے قلم بند کیا ہے ۔ اس سے مہاراجہ کی زبان دانی اور ان کے ذوقِ علمی کا اندازہ ہوتا ہے ۔ اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انھیں اس خاص صنعت پر کس قدر عبور حاصل ہے ۔ اس موضوع پر نہ مہاراجہ سے پہلے کسی نے اس وضاحت اور لیاقت کے ساتھ قلم اٹھایا اور نہ ہی بعد میں پھر کسی نے کچھ لکھا ۔

"ضلع جگت" کے بارے میں عبدالماجد دریابادی نے ہماری زبان (۸؍اگست ۱۹۵۹ء)

میں لکھا تھا کہ یہ شاد کی تصنیف نہیں ہے۔ ان کے الفاظ درج ذیل ہیں۔

"مہاراجہ شاد اس فن کے مانے ہوئے استاد تھے۔ لیکن حیدرآباد کے ایک راوی نے جو بظاہر ثقہ تھے مجھ سے سنہ ۱۹۱۸ء میں کہا تھا کہ یہ رسالہ دراصل جلیل کی تصنیف ہے۔"

عبدالماجد دریابادی کے خیال کی تردید حکم چند نیّر نے ان الفاظ میں کی ہے

"مہاراجہ شاد آنجہانی نے خود لکھا ہے کہ اختر مینائی اور جلیل نے اس کتاب کی تصنیف میں مجھے بہت مدد دی۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔ تملمذ مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب یا ان کے ثقہ راوی نے "جلیل کی مدد" سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ یہ تصنیف اصلاً جلیل کی[1] ہے۔"

حافظ صدیق احمد صاحب (خلف اکبر نواب فصاحت جنگ جلیل) سے میں نے دریافت کیا کہ ضلع جگت مہاراجہ کی تصنیف ہے یا جلیل کی تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ مہاراجہ کی تصنیف ہے، جلیل صاحب صرف مشورہ دیا کرتے تھے اور ان ہی کی نگرانی میں یہ کتاب شایع ہوئی۔

مخزن القوافی

قوافی سے متعلق یہ رسالہ ۹ × ۶½ سائز کے (۱۴۲) صفحات پر مشتمل ہے۔ سنہ ۱۳۳۶ ہجری م ۱۹۱۷ء میں تصنیف ہوا۔ اور محبوب پریس علاقہ بیتکاری سے شایع ہوا۔ ابتدائی چار صفحات میں "بیان قافیہ" کے عنوان سے قافیہ کے معنی و مفہوم کی وضاحت کی ہے۔

حروف قافیہ اور حرکات قافیہ کی تعداد، نیز ان کی تشریح مثالوں کے ساتھ کی گئی ہے۔ "الف" سے لے کر "ی" تک ہم قافیہ الفاظ کو ترتیب وار جمع کیا گیا ہے ہر حرف کے قوافی کی تعداد بھی بتادی گئی ہے۔ آخر میں جملہ قوافی کی تعداد ۱۹۳۵۴ بتائی گئی ہے۔ رسالہ کے اختتام پر دو تاریخی قطعات ہیں۔ پہلا قطعہ مرزا منیرالدین صاحب ضیاء دہلوی کا ہے اور دوسرا قطعہ عابد مرزا بیگم لکھنوی کا۔

○

---

[1] ہماری زبان اکتوبر ۱۹۵۹ء

ناول

اردو میں ناول نگاری کا آغاز مولوی نذیر احمد سے ہوتا ہے۔ وہ ایک خاص اخلاقی مقصد کو سامنے رکھ کر ناول لکھتے ہیں اور یہ مقصدیت مولوی صاحب پر اس قدر چھائی ہوئی ہوتی ہے کہ وہ واقعات بیان کرتے ہوئے پند و نصیحت کے دفتر کھول دیتے ہیں۔ فنی اعتبار سے ان کے ناول سپاٹ ہوتے ہیں۔ نہ ان کے قصے میں ارتقا ہوتا ہے اور نہ کرداروں میں۔ البتہ کہیں کہیں اچھے مکالمے لکھ گئے ہیں۔ تاہم انھوں نے اردو میں پہلی مرتبہ ناول لکھنے کی کوشش کی اور پہلی مرتبہ سلاطین امراء، دیو، پری اور جادوگروں کو چھوڑ کر متوسط طبقے کی زندگی سے قصہ کا مواد حاصل کیا۔ سرشار اردو کے دوسرے ممتاز ناول نگار ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ "فسانۂ آزاد" ہے۔ اس میں شک نہیں کہ "فسانۂ آزاد" میں فن کے اعتبار سے بہت سی خامیاں ہیں۔ سرے سے اس کا کوئی پلاٹ ہی نہیں معلوم ہوتا۔ اس کے باوجود سرشار نے بہترین مرقع نگاری کی ہے۔ اور لکھنؤ کے مٹتے ہوئے نظام جاگیرداری کی تصویر کشی اس قدر چابکدستی اور ہنرمندی سے کی ہے کہ فسانۂ آزاد میں نذیر احمد کے ناولوں سے زیادہ ناول کی جھلک آ گئی ہے۔ لکھنؤ کی زبان کے چٹخارے نے بھی فسانۂ آزاد میں جان پیدا کر دی ہے۔ شرر تیسرے بڑے ناول نگار ہیں۔ شرر سے اردو میں باقاعدہ ناول نگاری کا آغاز ہوتا ہے۔ اور شرر ہی سے اردو میں تاریخی ناول لکھنے کا میلان شروع ہوتا ہے۔ شرر کا پلاٹ مرتب ہوتا ہے لیکن ان کے کرداروں میں کوئی ارتقا نظر نہیں آتا۔ شرر نے چند معاشرتی ناول بھی لکھے ہیں۔ لیکن معاشرت کی عکاسی میں ان کا تخیل اس قدر رنگ آمیزی کرتا ہے کہ حقیقت ان کے تخیل میں چھپ جاتی ہے۔ محمد علی طبیب شرر کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ لیکن انھیں تاریخی اور معاشرتی ناول نگاری میں، اتنی بھی کامیابی نہیں ہوئی جتنی شرر کو ہوئی۔ منشی سجاد حسین کے ناولوں پر سرشار کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ وہی بذلہ سنجی، وہی ضلع جگت، وہی بولی ٹھولی جس سے سرشار پڑھنے والے کے لئے دلکشی کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ مرزا رسوا ناول نگاری کے اس پہلے دور کے آخری ناول نگار ہیں انھوں نے تخیلیت، مثالیت، اور نری مقصدیت کو چھوڑ کر حقیقت نگاری پر توجہ دی۔ انھوں نے

قصہ کا مواد اپنے ہی ملک سے لیا اور اپنے اطراف و اکناف کی زندگی کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ ان کے یہاں ظرافت کی ہلکی سی چاشنی بھی ملتی ہے۔ اگرچہ ترتیب اور تکمیل کے اہتمام اور نری حقیقت نگاری نے ان کے ناولوں میں کسی قدر خشکی پیدا کردی ہے۔ پھر بھی جس زندگی کو انھوں نے پیش کیا ہے وہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ بالخصوص اردو ناول میں نفسیات انسانی کی پیچیدگی کو رسوا ہی نے پہلی مرتبہ پیش کیا ہے۔ اس طرح اردو میں نفسیاتی ناول نگاری کا آغاز رسوا ہی سے ہوتا ہے۔

اردو ناول نگاری کے اس دور میں جتنے بھی ناول لکھے گئے ہیں وہ تین قسم کے ہیں۔ نذیر احمد کے ناولوں پر پند و نصیحت کا غلبہ رہا۔ شرر کے ناول کچھ تو تاریخی ہیں اور کچھ معاشرتی۔ رسوا سے ناول میں انسانی نفسیات کو پیش کرنے کا رجحان شروع ہوتا ہے۔

مہاراجہ کشن پرشاد کے ناولوں کا تعلق اردو ناول نگاری کے اسی دور سے ہے۔ مہاراجہ نے منظر نگاری اور ناولوں میں تاریخی مواد کا استعمال شرر سے سیکھا۔ ان کے ناولوں میں اخلاقی نقطۂ نظر کی اہمیت بھی شرر اور نذیر احمد کا اثر ہے۔ مہاراجہ نے تہذیب کی عکاسی روزمرہ اور محاورہ کا لطف اور بولی ٹھولی کا چٹخارہ سرشار سے سیکھا۔ ان کے یہاں بھی ان کے پیشرو ناول نگاروں کی طرح حسن و عشق کا روائتی تصور ملتا ہے۔ ان کے کرداروں میں بھی شرر کے کرداروں کی طرح کوئی ارتقا و پذیری نہیں ملتی۔ "مطلع خورشید" مہاراجہ کا پہلا ناول ہے۔ اس کی زبان پر دکنی کا خاصہ اثر ہے۔ جس کا اعتراف خود مہاراجہ نے اپنے ایک خط میں کیا ہے۔ اس کا اقتباس ناول پر بحث کے سلسلہ میں دیا جائے گا۔ اس ناول میں مہاراجہ نے حیدرآباد کی تہذیب اور حیدرآباد کے مناظر کو پیش کر کے حقیقت نگاری کا ثبوت دیا ہے۔ اسی سے ان کے ناول میں زندگی محسوس ہوتی ہے۔ ویسے فن کے اعتبار سے شرر نے ناول کو جس قدر ترقی دی تھی مہاراجہ نے اتنا بھی اہتمام فن نہیں کیا۔

"چنچل نار" کے متعلق یہ جو مشہور ہے کہ سرشار نے یہ ناول مہاراجہ کے لئے

لکھ دیا تھا۔ اس مسئلہ پر آگے بحث کی جائے گی۔ یہاں اس قدر واضح کر دینا کافی ہے کہ اس ناول میں سرشار کی زبان کے لطف اور اسلوب کے البیلے پن سے بڑی دلکشی آگئی ہے۔

مہاراجہ کے تین ناول دستیاب ہوئے ہیں۔ ۱۔ مطلع خورشید ۲۔ چنچل نار ۳۔ بزم خیال۔ ان ناولوں کے علاوہ مہاراجہ نے "سرمایۂ سعادت" کے نام سے ایک قصہ بھی لکھا ہے۔

مطلع خورشید یہ ناول ۹"×۶" سائز کے ۳۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ سنہ تصنیف ۱۳۱۵ھ م ۱۸۹۷ء ہے۔ محبوب پریس علاقہ پیشکاری میں طبع ہوا۔ آخر میں تاریخی قطعات ہیں جن کی تعداد ۳۲ ہے۔

داغ کا کہا ہوا تاریخی قطعہ درج ذیل ہے:

اے مہاراجہ بہادر شاد
شاد آباد تجھ کو رکھے خدا
خوب ناول نیا کہا دلچسپ
ایسے کہنے کا واہ کیا کہنا
نام اس کا ہے "مطلع خورشید"
اس کی تاریخ تھی یہی زیبا
داغ نے یہ کہا ہے مصرع سال
آفتاب سخن بھی اب نکلا

۱۳ھ۱۵

ناول کو مندرجہ ذیل بارہ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے:۔

۱۔ ابتدائے عشق ۲۔ جوش جنونِ عشق ۳۔ دل کی کچھ قدر کرتے رہنا تم ۴۔ غصہ کی بڑ ۵۔ تصویر جاناں در بغل ۶۔ پرستان ۷۔ آج تو خوب گلچھرے اڑ رہے ہیں ۸۔ ہائے اس عشق میں رونا بھی نہ آسان نکلا ۹۔ الفت کا یہ مزا ہے کہ ہوں دو بھی بے قرار ۱۰۔ رنگیلے شاہ ۱۱۔ فتح گڑ ۱۲۔ جھٹ تری منگنی پٹ ترا بیاہ

مطلع خورشید کی ہیروئین خورشید آرا اور ہیرو مرزا مخمور ہے۔ خورشید آرا ایک شریف، مہذب اور پردہ نشین خاتون ہے۔ غیر مردوں سے بات کرنا اس کے گھرانہ میں معیوب سمجھا جاتا ہے۔ انجانے طور پر خورشید آرا کی نظر مرزا مخمور پر پڑتی ہے۔ اس کے بعد سے ملاقات کا اشتیاق بڑھتا جاتا ہے۔ خورشید آرا کی دو بہنیں زینت اور بہاری دونوں شوخ اور طرار ہیں۔ خورشید آرا کی رازداری کا شرف بھی انھیں کو حاصل ہے۔ بہار جو خورشید آرا کے گھر کی ملازمہ ہے یہ بھی خورشید آرا اور مرزا مخمور کی خط و کتابت اور ملاقاتوں کا ذریعہ بنتی ہے۔ خورشید آرا کی کوئی بات اس سے پوشیدہ نہیں۔

نواب صاحب کے ایک خاص مصاحب ہیں اور دوسرے میاں کبڑے۔ یہ دونوں اصحاب ہمیشہ نواب کے ساتھ رہتے ہیں اور تمام اہم معاملات اور مسائل کے حل کرنے میں ان کا مشورہ لازمی ہے۔ میاں کبڑے کے بارے میں مہاراجہ لکھتے ہیں:

> "یہ اس نام سے اس لئے مشہور تھے کہ ماں کے پیٹ ہی سے کمر خمیدہ دنیا کی سیر کرنے تشریف لے آئے۔ اب تو ماشاءاللہ پچاس سال کے قریب عمر بھی ہے۔ پشت دوتائے فلک کی مدد سے اور بھی عاجزی اختیار کی۔ مگر قوم کے خالص زی پٹھان۔ نکیلی پگڑی۔ بہ سر انگرکھا اور نیم آستین در بر اور ایک پرانی تلوار بغل میں۔ چڑھاؤ جوتا پاؤں میں۔ مزاج کے تیکھے اور خوش مزاج ایسے کہ روتے ہوئے کو ہنسانا ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔ مدک، افیون، شراب سیندھی گھٹی میں پڑی ہوئی۔ ہمارے نواب کے مقرب ایسے کہ کبھی کبھی غلط سلط کچھ بڑھ کر بھی کہہ جائیں تو مروت اور حاکمانہ حکمت سے پیش آکر چشم پوشی کر جاتے ہیں۔"

مطلع خورشید کے کرداروں اور مکالموں میں بڑی مناسبت پائی جاتی ہے۔ بعض کردار ایسے ہیں جو اپنی شخصیت اور مرتبہ کی بناء پر ہمیشہ طویل اور فصیح تقریر کرتے ہیں۔ اور بعض ٹوٹی پھوٹی اردو بولتے ہیں۔ عورتوں کی مخصوص زبان اور ان کا مخصوص لب و لہجہ ہر جگہ ملتا ہے۔ مہاراجہ نے بعض مکالموں کے ذریعہ بادشاہ وقت کی مدح بھی کی ہے۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اے بہن! کیا شہر شملہ ہے۔ یہ بھی کوئی دل لگی ہے۔ میر محبوب علی خاں بہادر کا راج ہے۔ نشیر کی عملداری، جنگل میں اندھیری رات کو سونا اچھالتے جاؤ تو ڈر نہیں۔"

مہاراجہ کے اس ناول میں منظر نگاری بھی کی گئی ہے۔ تقریباً تمام مناظر حیدرآباد ہی کے پیش کیے گئے ہیں۔ ایک جگہ میر عالم کے تالاب کا منظر اس طرح بیان کیا ہے:

"مغرب کا وقت یوں تو ہمیشہ فرحت خیز اور مسرت انگیز ہوا کرتا ہے مگر اس وقت میر عالم کے تالاب کے خوش نما میدان میں آفتاب کی ڈھلتی ہوئی روشنی پتے پتے پر غضب کی حیرت بھری اور پر امید نظر ڈال رہی ہے جس کے باعث بوٹے بوٹے پر قیامت کا نکھار ہے۔"

مطلع خورشید کے بارے میں سید عبدالعلی صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مطلعِ خورشید آپ کے پاس بھیجتا ہوں۔ چپ چاپ نظرے خوش گزرے۔ بائے بسم اللہ سے تائے تمت تک دیکھ جاو۔ مگر کہیں اعتراض نہ جڑ دینا۔ مجھے خود ہنسی آتی ہے کہ میں ٹوٹے پھوٹے قصہ کو ناول کہہ کر ناول نویسوں کے زمرہ میں گویا اہوِل کے شہیدوں میں داخل ہوتا ہوں۔ یا یوں کہوں کہ اس فن ناول نویسی کو دھبہ لگاتا ہوں۔ الغرض جو کچھ ہو مگر بک تو دیا ہے۔ ہاں یہ بھی یاد رہے کہ زبان پر نکتہ چینی نہ ہو۔ میں حیدرآبادی ہوں اور آپ بھی حیدرآبادی ہیں مگر آپ گرگ باراں دیدہ اور میں طفل نو مکتب رسیدہ۔ الغرض کہیں غلطی نظر آئے تو آنکھ بند کر کے اس غلطی کو بذریعہ بیڈ پارسل روانہ نمایند۔ بیرنگ نہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ کسی جگہ شعر بھی موزوں ہوئے ہیں۔ اگرچہ بقول غالبؔ ؎ کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے مگر آصف کا غلام اور شاگرد ہوں۔ اپنی خوش قسمتی پر مجھے کیوں نہ ناز ہو۔ جس قدر ناز کروں می زیبد اور جلیا کچھ فخر بجھوں می شاید ؎ گو شاعری سے مجھکو سروکار کچھ نہیں؛ پر فخر کیا یہ کم ہے کہ شاگرد شاہ ہوں[1]۔"

---

[1] رقعات شاد ص ۲۵۲

اس ناول کے بارے میں مہاراجہ شاد نے جو رائے ظاہر کی ہے اس میں کچھ زیادہ انکساری سے کام نہیں لیا ہے۔ واقعی یہ ناول لکھنے کی پہلی کوشش معلوم ہوتی ہے۔

چنچل نار "چنچل نار" ۸½ × ۵ سائز کے ۳۱۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ محمد ابراہیم خاں کے اہتمام سے ۱۳۲۱ھ م ۱۹۰۳ء میں مطبع شمسی میں طبع ہوا۔ یہ ناول ابتدا میں دبدبہ آصفی میں اقساط سے شائع ہوا کرتا تھا۔ اس کے بعد اس کی اشاعت کو روک کر مہاراجہ نے نظر ثانی کر کے اسے چھپوانے کا انتظام کیا۔ چنانچہ ناول کے پہلے صفحہ پر "اطلاع" کے عنوان سے لکھتے ہیں:

> "یہ ناول چنچل نار جو اس وقت زیور طبع سے آراستہ ہو کر ہدیۂ ناظرین ہوتا ہے کوئی نیا ناول نہیں ہے بلکہ سابق میں نصف حصہ تک ماہانہ رسالہ دبدبۂ آصفی کے ساتھ نکل چکا ہے۔ ...چونکہ اکثر احباب اور شائقین کا تقاضا ہوا کہ یہ ناول کامل طور پر طبع ہو جائے۔ لہذا اب بقیہ حصہ معہ اولی کے جس پر نظر ثانی کی گئی ہے کتاب کی صورت میں شیرازہ بند کر کے ارباب نظر کے سامنے لایا جاتا ہے۔"

مہاراجہ شاد کے ناولوں کے بارے میں خود ان کی زندگی میں اور ان کے بعد بھی بعض حضرات کی رائے رہی ہے کہ جتنے بھی ناول ان سے منسوب ہیں وہ پنڈت رتن ناتھ سرشار سے لکھوائے گئے ہیں۔ چنچل نار کے بارے میں عام رائے یہی ہے کہ یہ ناول سرشار کا لکھا ہوا ہے۔ مہاراجہ اس رائے سے واقف تھے۔ چنانچہ اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں:

> "آپ کے رفیق شفیق نے جو کچھ آپ سے فرمایا اور آپ نے زیب خط کیا بغور پڑھا۔ ان کا یہ حسن ظن ہے جو میرے نام پر تبرا کرتے ہیں۔ خدا جانے کیوں ناحق وہ مجھ کو اپنا رقیب سمجھتے ہیں۔ ارے صاحب اگر ان کا خیال ہے کہ کشن پرشاد جاہل ہے۔ پڑھا لکھا نہیں تو خیر، جاہل ہی سہی۔ یہ کیا معنی کہ ہر وقت ہر مجلس میں ہماری شکایت، اور

یہ کہنا کہ جو کچھ شعر یا نثر کہتا ہے کسی سے لکھوا کر۔ اکثر سرشار لکھنوی کا نام لیا جاتا ہے کہ وہ لکھ دیا کرتے ہیں[۱]۔"

اسی سلسلہ میں آگے لکھتے ہیں:

"بے شک میں شاعر نہیں نثار نہیں مگر ایسا بھی نہیں کہ بغیر کسی سہارے کے نثر نہ چل سکے۔ آزمائش منظور ہے تو قلم و دوات لیں۔ کوئی مضمون، یا خط یا کوئی سبق وہ بھی لکھیں بندہ بھی گھسیٹا ہے۔ اس وقت قلعی کھل جائے گی۔ یہ میں نے مانا کہ میں منشی نہیں ہوں۔ انشا پردازی مجھے نہیں آتی۔ اور نہ مجھے ابو الفضل یا نعمت خاں عالی ہونے کا دعویٰ ہے۔ مگر ہاں مرزا علی بابا شیرازی الاصل کا شاگرد ہوں۔ سیدھی سادھی نثر لکھتا ہوں۔ مگر انشا کے خلیفہ اور انشائے مادھو رام سے کم نہیں۔ عبارت سلیس، محاورہ خاص ایرانی، بندش چست نہ ہو تو ہار جاؤں[۲]۔"

مہاراجہ کے بعد بھی چنچل نار کے بارے میں ارباب نقد کو شبہ رہا ہے۔ ہماری زبان ۸ راگست سنہ ۱۹۵۹ء میں مہاراجہ کی تصنیف "ضلع جگت" کے بارے میں عبدالماجد دریابادی نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ یہ مہاراجہ کی تصنیف نہیں ہے۔ اس بحث کے سلسلے میں ڈاکٹر قمر رئیس نے ناول "چنچل نار" کو بھی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہ ناول بڑی حد تک سرشار کے رنگ میں رنگا ہوا ہے وہی لکھنو کے ایک خاص دور کی محاوراتی اور بیگماتی زبان، انداز بیان کی وہی شوخی اور شگفتگی، وہی اودھ کا ماحول اور معاشرت وہی بات بات پر اشعار، واقعات میں ظرافت اور مکالموں میں کہیں اصلاح معاشرت کے شوشے، ٹکنک بھی تقریباً وہی ہے

۱۔ خود نوشت سوانح عمری مہاراجہ بہادر قلمی ص ۲۹
۲۔ " " " " " " ۳۱

جو سرشار کے دوسرے ناول "کامنی" میں نظر آتی ہے۔ الغرض
اس ناول کا رنگ و روپ پکار پکار کر کہتا ہے کہ میں سرشار
کی مخلوق ہوں[1]۔"

حکم چند نیر نے ہماری زبان ۱۵ر دسمبر سنہ ۱۹۶۰ء میں ڈاکٹر قمر رئیس کے اس خیال کی تردید کرنے کی کوشش کی ہے وہ لکھتے ہیں:

"جہاں تک داخلی شواہد کا تعلق ہے قمر صاحب نے ناول چنچل نار کی ٹکنک، اسلوب بیان، کہانی کہنے کا طریقہ، کردار کی تعمیر کا سلیقہ، لکھنؤ کی محاورتی دبیگماتی زبان انداز بیان کی شوخی واقعات میں ظرافت کے پہلو اور جا بجا اشعار کے استعمال وغیرہ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ ناول سرشار کی مخلوقات فکر میں سے ہے۔ ان امور پر بحث کرتے ہوئے شاید قمر صاحب نے اس حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیا کہ مہاراجہ شاد پنڈت سرشار کے شاگرد تھے اور آنجہانی سرشار شاد کے استاد، اردو ادب میں استادی شاگردی کی روایت ایک قدیم اور بہت استوار روایت ہے۔ اگرچہ اردو کے ادیب آج تک ان قدروں کو سینہ سے لگائے ہوئے ہیں۔ لیکن سرشار شاد کا زمانہ تو ایک ایسا زمانہ تھا جب کہ ان قدروں کی پرستش کی جاتی تھی۔ شاگردوں کی کوشش ہمیشہ یہ رہتی تھی کہ ان کے کلام و دیگری نثری تخلیقات میں ان کے استاد کا رنگ پایا جانا چاہیئے۔"[2]

ناول چنچل نار میں مہاراجہ نے سرشار کی زبان اور اسلوب کا جو اتباع کیا تھا اسی وجہ سے عام طور پر لوگ غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں کہ یہ ناول مہاراجہ کا نہیں

---

[1] ہماری زبان ص ۹، ۱۰ (۸ر اگسٹ ۱۹۵۹ء)
[2] ہماری زبان ص ۲ (۱۵ر دسمبر ۱۹۶۰ء)

بلکہ مہاراجہ نے سرشار سے لکھوالیا ہے۔ اس سوئے ظن کا پس منظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجہ امیر تھے اور امرا و اہل دول گراں قدر معاوضے دے کر اہل قلم سے کتابیں لکھواتے رہے ہیں۔ مہاراجہ نے سرشار کو اپنے اسٹیٹ میں ملازم رکھ لیا تھا اور اپنی تصانیف کی اشاعت کا کام انھیں کے سپرد کر دیا تھا۔ نیز رسالہ دبدبۂ آصفی بھی ابتدا میں سرشار ہی کے اہتمام سے طبع و شائع ہوتا تھا۔ مہاراجہ کا ناول "چنچل نار" اسی زمانہ میں جزواً جزواً شائع ہونے لگا تھا۔ جس میں مہاراجہ نے زبان اور اسلوب میں سرشار کا اتباع کرنے کی کوشش کی تھی۔ سرشار کی مہاراجہ کے یہاں ملازمت اور چنچل نار کی زبان اور اسلوب میں سرشار سے مشابہت کی بناء پر معترضین کے لئے اس غلط فہمی کی گنجائش پیدا ہوئی کہ مہاراجہ نے "چنچل نار" سرشار سے لکھوالیا تھا۔ لیکن مہاراجہ جیسے قادر الکلام شاعر اور مشاق نثر نگار کے بارے میں ایسا سوئے ظن زبردستی کی بات معلوم ہوتی ہے۔ مہاراجہ کی یہ عادت تھی کہ وہ جس صاحب طرز شاعر یا ادیب کو پسند کرتے تھے، جس شاعر یا ادیب کا اسلوب انھیں پسند آجاتا تھا وہ اس کی کامیاب تقلید کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنا سیدھا سادھا اسلوب چھوڑ کر داغ کے البیلے انداز کو بھی اپنانے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح انھوں نے "چنچل نار" میں سرشار کا رنگ اڑانے کی سعی کی ہے۔ لیکن چونکہ سرشار ان کے اسٹیٹ کے ملازم تھے اور ان کی تصانیف کی تصحیح اور طباعت اور اشاعت کا کام بھی انجام دیتے تھے۔ اس لئے شاید لوگوں کو اس غلط فہمی کی وجہ پیدا ہوئی۔ مہاراجہ نے چونکہ اس ناول میں سرشار کا اتباع کرنے کی کوشش کی تھی اس لئے یہ ممکن ہے کہ سرشار نے زیادہ توجہ سے اس ناول کی اصلاح پر توجہ کی ہو۔ سرشار کے حیدرآباد آنے سے پہلے ہی مہاراجہ سرشار کے انداز و اسلوب سے متاثر تھے اور شعوری یا غیر شعوری طور پر سرشار کا تھوڑا بہت اتباع بھی کرنے لگے تھے۔ چنانچہ ان کا پہلا ناول "مطلع خورشید" جو سرشار کے حیدرآباد آنے سے پہلے لکھا گیا تھا اس میں بھی سرشار کا سا زبان کا چٹخارہ اور مکالموں میں ہلکی سی ظرافت اور لہک نظر آتی ہے۔ "مطلع خورشید" کے مطالعہ کے بعد چنچل نار کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مہاراجہ نے سرشار کے اتباع کی جو کوشش مطلع خورشید میں شروع کی تھی وہ چنچل نار میں زیادہ کامیاب ہوئی ہے۔ معترضین مطلع خورشید کا مطالعہ کرتے تو

شاید اس غلط فہمی کا شکار نہ ہوتے۔

"چنچل نار" پاروتی اور چندرسین کے عشق کی ایک طویل داستان ہے جس کی ابتدا دسہرے کے دن گنگا کے کنارے ہوتی ہے۔ عام ناولوں کے ہیرو اور ہیروین کی طرح یہ بھی دنیا بھر کی تکلیفیں اٹھاتے ہیں۔ مایوسیاں اور ناکامیاں ان کی ساتھی ہوتی ہیں لیکن انھیں غم سے نجات دلانے کے لئے متھرا اور ایک کہاری فرشتے بن کر مدد کو آجاتے ہیں۔ متھرا چندرسین کا دوست ہے اور کہاری پاروتی کی خادمہ ہے جو اس کی راز دار بھی ہے۔ متھرا اور کہاری کے علاوہ چند اور افراد بھی حسب مقدور ان کی مدد کرتے ہیں۔

ناول کے آخری حصے میں گوسائیں جی سے ملاقات کا ذکر ہے ان سے مذہب کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ اور ان سے گفتگو کے بعد یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ کسی کے مذہب وملت کے جھگڑے میں اپنا وقت ضائع کرنے کے بجائے وقت کو غنیمت جان کر جو چیز حاصل کرنی ہے اس کی جستجو کرنی چاہیئے۔ نیز یہ بھی بتا دیا ہے کہ درویشوں کا طریق صلح کل ہوتا ہے اور وہ صوفی اور موحد کہلائے جاتے ہیں۔ اس طرح مہاراجہ نے ناول جیسی صنف میں بھی اپنی مذہبی بحث کو نہیں چھوڑا۔ سوال وجواب کے پیرائے میں توحید، رسالت، وحدت الوجود۔ صلح کل غرض تصوف کے سارے مسائل حل کر دیئے ہیں۔

زبان اور اسلوب میں سرشار کا رنگ پیدا کرنے کے لئے مہاراجہ نے سرشار کی طرح لکھنو کی زبان استعمال کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں تھوڑے بہت کامیاب بھی ہوئے ہیں اور ممکن ہے کہ اتنی کامیابی بھی سرشار کی اصلاح کی رہین منت ہو۔ ورنہ لکھنو کی زبان کے مخصوص لفظوں، روزمرہ، محاوروں اور کہاوتوں کا جو دریا سرشار نے فسانہ آزاد میں بہایا ہے چنچل نار کا اس سے کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ بلکہ اس ناول میں مہاراجہ کی کوشش کے باوجود جگہ جگہ ان کا اپنا سیدھا اور بے تکلف اسلوب آگیا ہے۔ جو اس کے مہاراجہ کی تصنیف ہونے کا قوی ثبوت فراہم کرتا ہے۔

ناول کے ختم پر ۱۹ نامور ہستیوں کے کہے ہوئے تاریخی قطعات ہیں۔ ان میں اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں قابل ذکر ہیں۔ ان کا کہا ہوا تاریخی قطعہ درج ذیل ہے

بحر عمان موج زن ہے خوب طبع شاد کا — حال ناول میں دکھایا عالم ایجاد کا
مصرعۂ تاریخ عثمان سے یہ ہاتف نے کہا — گوہر یک دانہ ہے ناول گلشن پرشاد کا
۲۱ بجھ ۱۳

بزمِ خیال یہ ناول تین جلدوں میں چھپا ہے۔ سائز $\frac{1}{2}$۷" × ۵" ہے۔ پہلی جلد ۳۰۴ صفحات پر۔ دوسری جلد ۳۶۷ صفحات پر اور تیسری جلد ۲۸۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ سنہ ۱۳۲۷ھ م ۱۹۰۹ء میں محبوب پریس علاقہ پیشکاری میں طبع ہوا۔

اس ناول کا ہیرو ایک نواب ہے جس کا نام نصیر ہے اور ہیروئن سپہر آرا ہے۔ رفیق' نواب کا خاص دوست اور مصاحب ہے۔ اور مغلانی ہے جو سپہر آرا کی خادمہ اور راز دار ہے۔ سپہر آرا ایک منصب دار کی لڑکی ہے جس سے نصیر شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس کے والدین اس کی مخالفت کرتے ہیں لیکن مغلانی ان دونوں کی شادی کروانے میں بڑا اہم پارٹ انجام دیتی ہے۔

نواب یورپ کے طرزِ معاشرت سے بخوبی واقف ہے۔ وہاں کے رہن سہن اور طرزِ گفتگو وغیرہ کا وہ اپنے دوستوں اور مصاحبوں کے سامنے لکچر دیا کرتا ہے اور ہندوستانی تہذیب سے وقتاً فوقتاً مقابلہ کر کے یورپی تہذیب کی خوبیاں اجاگر کرتا ہے اور ان پر یہ واضح کرتا ہے کہ مشرقی تہذیب تمام باتوں میں مغربی تہذیب سے کسی قدر پیچھے ہے۔

نواب میں زندہ دلی اور شوخی ہے۔ وہ سیر و تفریح کا دلدادہ ہے۔ گھر میں روزانہ مختلف محفلیں ہوا کرتی ہیں۔ کبھی شاعری پر بحث ہو رہی ہے۔ کبھی علم نجوم پر۔ اس کے ہاں ہر قسم کے لوگ جمع ہوتے ہیں۔ شاعر بھی ہیں نجومی بھی۔ سادھو بھی ہیں اور فقرا بھی۔ نواب ہر موضوع پر ان لوگوں سے گفتگو کرتا ہے۔ اور اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔

سپہر آرا شریف گھرانے کی لڑکی ہے۔ جو انتہائی خوبصورت واقع ہوئی ہے وہ نواب سے ملنا چاہتی ہے لیکن غیرت مانع ہوتی ہے۔ مغلانی اس کی مدد کرتی ہے۔ مغلانی شوخ طرار ہے۔ سپہر آرا کی منہ چڑھی ملازمہ ہے۔ وہ بلا روک ٹوک اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہے۔ نواب کا ذکر کر کے سپہر آرا کو چھیڑتی بھی جاتی ہے۔ تقریباً روزانہ نواب کے گھر جاتی اور سپہر آرا کا پیام نواب تک پہنچاتی ہے۔

اس ناول میں مستورات کے مکالموں کے موقع پر مہاراجہ نے ان کی مخصوص زبان استعمال کی ہے۔ مثلاً ایک کھتری کی بیوی اپنی ملازمہ سے یوں مخاطب ہے:

"اری او ناگو۔ بہری رانڈ۔ کیا گھوڑے بیچ کر سوئی ہے۔ تیرا منہ جھلس دوں

کم بخت حیدرآباد کی ماما ئیں بھی اس گت ہوتی ہیں۔"

مہاراجہ نے اس ناول میں جگہ جگہ مختلف کرداروں کی زبان سے لمبی لمبی تقریریں لکھ ڈالی ہیں۔ یہ سب تقریریں نواب کے گھر مختلف جلسوں میں ہوا کرتی ہیں۔ اکثر تقاریب مذہبی موضوعات پر ہیں جن میں انھوں نے کئی بزرگان دین، مولویوں اور مرشدوں کے بارے میں مواد فراہم کیا ہے۔ ان اصحاب کی سوانح عمری اور ان کے کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ بعض تقاریر میں قومی یکجہتی پر زور دیا گیا ہے۔ بر موقع غفران مکان نواب میر محبوب علی خاں کی مدح بھی کی گئی ہے۔ ان کے دور حکومت کی اصلاحات کے ذکر سے کئی صفحے رنگ دیئے ہیں۔ اس کے علاوہ پردے کی اہمیت، عورتوں کی تعلیم، سماج میں عورت کا مقام جیسے مسائل پر بھی خوب خامہ فرسائی کی ہے۔ اس ناول میں مہاراجہ نے کسی موضوع کو تشنہ نہیں رکھا ہے۔ گانے کی محفلوں کا بھی ذکر ہے جو نواب کے گھر ہوتی ہیں۔ ان میں طوائفوں کے گانے ہوتے ہیں۔ مختلف شعرا کی غزلیں پڑھی جاتی ہیں۔ ہولی کا ذکر آگیا تو اس تہوار کی ساری تفصیل لکھ دی ہے۔ ہولی کے ساتھ ہندوؤں کے دوسرے تہواروں کے بارے میں بھی معلومات فراہم کئے گئے ہیں۔ ان ساری ضروری اور غیر ضروری تفصیلات سے ناول کی ضخامت بڑھ گئی ہے۔

سپہر آرا کی شادی نواب سے ہو جاتی ہے۔ شادی کی تمام رسومات کو مہاراجہ نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس موقع پر جو جشن منائے جاتے ہیں ان کی بھی تفصیل دی ہے۔ شادی کی محفل میں عورتوں کے لباس، طور طریق اور ٹوٹی پھوٹی پر کئی صفحات لکھ ڈالے ہیں۔ درمیان میں انھوں نے حسب موقع اپنے اور دوسرے شعرا کے اشعار نقل کئے ہیں۔ بعض جگہوں پر پوری غزلیں نقل کردی ہیں۔

اس ناول کا پلاٹ بھی قریب قریب وہی ہے جو مطلع خورشید اور چنچل نار کا ہے۔ کہانی کا ماحول بھی ان دونوں ناولوں کی طرح حیدرآباد ہی ہے۔ مہاراجہ کے تمام کردار جاگیردارانہ تہذیب سے ابھرتے ہیں۔ اس لئے ان کرداروں میں بڑی مشابہت اور یکسانیت پائی جاتی ہے۔ مہاراجہ خود امیر کبیر تھے۔ اس لئے محلاتی تہذیب کے مرقعوں میں جس قدر واقفیت ان کے یہاں ہے دوسرے ناول نگاروں کے ہاں نہیں مل سکتی۔ مہاراجہ مطلع خورشید اور چنچل نار میں بھی مذہبی، اخلاقی اور

سماجی مسائل چھیڑتے ہیں۔ لیکن اس ناول میں ان مسائل پر اس قدر طویل بحثیں کی ہیں کہ ان سے ناول خواہ مخواہ ضخیم بھی ہو گیا ہے اور بے لطف بھی۔ جہاں تک طویل اخلاقی اور مذہبی مباحث کا تعلق ہے مہاراجہ بزم خیال میں نذیر احمد سے بہت مشابہ ہو گئے ہیں۔

مہاراجہ کو منظر نگاری کا بڑا شوق ہے۔ ناولوں اور سفر ناموں میں جہاں انھیں موقع ملتا ہے طلوع آفتاب، غروب آفتاب، دھوپ، چاندنی بارش، باغ، صحرا، شادی و غمی کی مجالس کے مناظر بیان کرنے لگتے ہیں۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ جب کبھی وہ منظر کشی پر آتے ہیں تو ان کی زبان فارسی کی پے در پے تراکیب سے بوجھل ہو جاتی ہے۔ اور پے در پے تشبیہات و استعارات استعمال کرنے لگتے ہیں۔ طرز بیان کے اس تصنع اور تکلف کی وجہ سے ان کے مناظر اس دنیا سے زیادہ عالم خیال کے مناظر محسوس ہونے لگتے ہیں۔ درحقیقت منظر کشی کا یہ انداز مہاراجہ نے شرر سے سیکھا ہے۔ اس لئے تخیل کی جو رنگ آمیزی اور بیان کا پرشکوہ تکلف شرر کے ہاں ملتا ہے۔ مہاراجہ کے مناظر میں بھی دکھائی دیتا ہے۔

جہاں تک زبان کا تعلق ہے روزمرہ اور محاورہ کا جو چٹخارہ چنچل نار میں ہے۔ بزم خیال میں نہیں ملتا۔ ظاہر ہے کہ چنچل نار کی زبان کی نوک پلک سرشار نے درست کی تھی تاہم محاورات، ضرب الامثال، کہاوتیں، فقرہ بازی اور برجستہ گوئی کا لطف بزم خیال میں بھی ملتا ہے۔

فن کے اعتبار سے اردو ناول شرر اور بالخصوص مرزا ہادی رسوا کے ہاتھوں بہت ترقی کر چکا تھا۔ مہاراجہ کا کوئی ناول فن کے اعتبار سے "فردوس بریں" اور "امراؤ جان ادا" کے مقابلہ میں نہیں آسکتا۔ تاہم اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے ذوق خامہ فرسا نے اس صنف ادب کی بھی اس قدر خدمت انجام دی ہے کہ اس کو نظر انداز نہیں جا سکتا۔

سرمایۂ سعادت | یہ قصہ ۸" × ۵½ سائز کے ۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ دار الطبع فنون میں چھپ کر شائع ہوا۔ سنہ تصنیف

اور سنہ طباعت کا پتہ نہیں چلتا ۔ مہاراجہ نے اس کے بارے میں لکھا ہے :

"یہ پہلی ہی کتاب ہے جو میں اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں چھپوا کر ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں ۔ یہ ایک چھوٹا سا قصہ ہے جس میں نہ عبارت آرائی ہے نہ زیادہ اشعار مندرج ہیں ۔"

ابتدا میں مہاراجہ نے ماں باپ کی محبت کا ذکر کیا ہے ۔ اتفاق ونفاق کے فواید اور نقصانات بیان کئے ہیں ۔ سرمایۂ سعادت میں مہاراجہ نے حیدر آباد کے ایک شریف خاندان کا حال قصے کے پیرائے میں لکھا ہے ۔ دو لڑکے شریف اور فریس ہیں جن کے باپ کا انتقال ان کے بچپن ہی میں ہو جاتا ہے ۔ شریف آزاد منش بنایا گیا ہے اور فریس اپنا سارا وقت حصول تعلیم میں صرف کرتا ہے ۔ آگے چل کر ان دونوں بھائیوں میں اختلاف مزاج کی وجہ سے کشیدگی پیدا ہو جاتی ہے ۔ اس کشیدگی کے نقصانات کو بیان کرنے کے لئے مہاراجہ نے ایک اور قصہ اسی قصہ میں شامل کر دیا ہے ۔ اس طرح قصہ در قصہ آجانے سے داستان کا رنگ پیدا ہو گیا ہے ۔ نصیحت حاصل کرنے کے لئے فریس کو جو قصہ سنایا جاتا ہے ۔ اس سے اس کے دل پر بہت اثر ہوتا ہے اور وہ اپنے بھائی کو برے افعال سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے ۔ اس کی شادی کی بھی فکر کرنے لگتا ہے ۔ غوث خاں نامی ایک شریف آدمی کی دو لڑکیاں خیرالنساء اور شرف النساء ہیں ۔ خیرالنساء سے شریف کی شادی کر دی جاتی ہے ۔ اس کے بعد خیرالنساء کے کہنے سے فریس کی شادی شرف النساء سے ہو جاتی ہے ۔ قصہ کے ختم پر قطعات تاریخ ہیں جو مندرجہ ذیل اصحاب کے لکھے ہوئے ہیں :

۱ ۔ میر حشمت علی صاحب حشمت ۲ ۔ سید محمد حسن علی رضوی ۳ ۔ محمد رفیع الدین حسین صاحب نفیس ۴ ۔ لچھمن پرشاد بہار ۵ ۔ رام پرشاد عشرت ۶ ۔ منشی امیر حمزہ ۔ ان سب قطعات سے ۱۳۰۵ھ تاریخ نکلتی ہے

فسانۂ شیدا مہاراجہ نے اپنے اس ناول کے بارے میں لکھا ہے ۔ "ایک خاص تصنیف جو ناول کے پیرائے میں میں نے لکھی ہے اور "فسانۂ شیدا" اس کا نام تھا ناتمام ہونے کی وجہ سے اشاعت سے رہ گئی ۔ میرا خیال تھا کہ پنڈت جی کو دکھا لوں اس کے بعد چھپنے کو دوں مگر افسوس کہ سرشار کی بے وقت موت نے اس خیال کو پورا نہ ہونے دیا ۔" (دیباچہ ارمغان وزارت ص ۵)

سفرنامے

ہر زبان میں سفر نامہ لکھنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین سفرنامے لکھنے کے رجحان کو تاریخی رجحان کی ایک کڑی سمجھتے ہیں[۱]۔ اردو میں یہ رجحان بھی عہد جدید میں پیدا ہوا۔ ادبی انقلاب کے رہنما سر سید نے پہلی مرتبہ سفر لندن کی روداد مرتب کر کے "تہذیب الاخلاق" میں شائع کی۔ شبلی نے قسطنطنیہ ایشیائے کوچک اور شام و مصر کا طویل سفر اختیار کیا۔ اس طویل سفر کے واقعات و تجربات اور ان ممالک کے حالات قلمبند کر کے ایک سفر نامہ کی صورت دی۔

خواجہ غلام الثقلین نے بھی سیاحت نامہ لکھا۔ اسی طرح مہاراجہ کشن پرشاد نے چھوٹے بڑے ۱۴ سفر نامے تحریر کئے ہیں۔ مہاراجہ جس مقام پر جاتے تھے۔ اگر اس کی کوئی تاریخی اہمیت ہوتی تھی تو پہلے اختصار کے ساتھ اس مقام کی تاریخ بیان کرتے ہیں۔ وہاں کے ذی اثر اشخاص سے ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے ان کی سیرت اور شخصیت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ ہر مقام کے حسب ضرورت جغرافی حالات کا بھی جائزہ لیتے ہیں۔ جو سفر سرکاری کاموں کے سلسلہ میں اختیار کرتے تھے اس سفر کی روداد میں نظم و نسق کی حالت، دفاتر کی کارگزاری عہدیداروں کے کام کا جائزہ لیتے ہیں۔ مہاراجہ کے سفر ناموں کی دلچسپ خصوصیت یہ ہے کہ دوران سفر ان کے ذوق شعر و ادب کو بڑی تحریک ملتی ہے۔ چنانچہ کم و بیش ان کے ہر سفر نامہ میں غزلیں، رباعیاں، قطعات جو اس سفر کے دوران میں سر انجام ہوتے ہیں شامل ہیں۔ مہاراجہ کے سفر ناموں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ان میں بڑی داخلیت پائی جاتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہر چیز کو اپنے شخصی نقطۂ نظر سے دیکھتے اور محسوس کرتے جا رہے ہیں۔ اور اپنے ارتسامات قلم بند کرتے جا رہے ہیں۔

۱۔ نئے ادبی رجحانات ص ۲۳۹

سفرنامہ خارجی زندگی کی روداد ہوتا ہے۔ اس روداد میں اتنی داخلیت مہاراجہ کے سفرناموں کی امتیازی خصوصیت ہے۔ سفر میں کسی شخص سے ملاقات یا کسی کے خط سے کسی خاص مسئلہ کے تعلق سے تحریک مل جاتی ہے تو سفر کی روداد ایک طرف رہ جاتی ہے اور مہاراجہ اس مسئلہ پر خیال آرائی شروع کر دیتے ہیں اور صفحے کے صفحے سیاہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے سفرناموں سے ایسی عبارتیں علحدہ کرلی جائیں تو مستقل مضامین بن جاتے ہیں۔

سادگی اور روانی مہاراجہ کے طرز تحریر کی خصوصیات ہیں۔ لیکن سفرناموں میں خصوصیت کے ساتھ ان کا اسلوب بہت بے تکلف ہوتا ہے۔ جذبات اور خیالات کی آمیزش سے معمولی معمولی واقعات کے ذکر میں بھی بڑی دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔

مہاراجہ کے مندرجہ ذیل سفرنامے طبع اور شائع ہو چکے ہیں:

۱۔ جذبات شاد
۲۔ جام جہاں نما
۳۔ سیر ناگپور
۴۔ سیر و سفر
۵۔ روزنامچہ گلبرگہ
۶۔ سفر شاد نگر
۷۔ تفریح شاد
۸۔ روضہ شریف
۹۔ سفر دو ہفتہ
۱۰۔ شکار شیر شاہی
۱۱۔ سیر پنجاب
۱۲۔ شکار شیر
۱۳۔ قدوم سلطانی
۱۴۔ ایک سفرنامہ

جذبات شاد

یہ سفرنامہ ۸" × ۵½" سائز کے ۱۵۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ سنہ ۱۳۲۸ھ م ۱۹۱۰ء میں محبوب پریس علاقہ پیشکاری میں طبع ہوا۔ مہاراجہ شاد کی یہ تصنیف بنیادی طور پر ایک سفرنامہ جو آخر میں ۲۰ صفحات پر مشتمل ہے

۱۰۱ صفحات کی تمہید میں مہاراجہ نے بعض حضرات کی اس غلط فہمی کی تردید کی ہے کہ انھیں بزرگان دین د اسلام. اور اکابر محمدی سے جو عقیدت ہے۔ کسی پولٹیکل چال اور "خاص مصلحت" پر مبنی ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے مذہب کی حقیقت پر روشنی ڈالی ہے "مذہب کیا ہے" اس عنوان کے تحت وہ لکھتے ہیں:

"مذہب اس شاہراہ کا نام ہے جو مخصوص ہو۔ راہروان، عابدانِ ایزدی کی روش کے ساتھ۔ نیز اس مضبوط اور مستحکم خیال کا نام ہے۔ جو ارکان عبادت الٰہی سے خصوصیت رکھتا ہو۔ اور عالم طفولیت میں قوم کے والدین اپنی اولاد کو دینی احکام اور طریقوں کو گوش گزار کر کے ذہن نشین کرتے جاتے ہوں۔ اور اپنی قوم کے مروجہ کتب دینی پڑھا کر اور طریقہ عبادت سکھا کر اس ہونہار لڑکے کو پابند مذہب کرتے ہوں۔"

اس کے بعد اسلام، پیغمبر اسلام اور اولیا واللہ سے اپنی عقیدت کے پس منظر کو نمایاں کرتے ہوئے اپنی ابتدائی تعلیم اور مسلمان اساتذہ اور خانوادۂ آصفی سے اپنے آبائی تعلقات کا تذکرہ کیا ہے۔ ارشاد لکھتے ہیں:

"میری عقیدت کسی ولی یا نبی کے ساتھ غرضانہ نہیں ہے اور نہ میرے مذہب کو تقیہ کی ضرورت ہے۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ میں قوم کا سپاہی النسل یعنی کھتری ہوں لیکن میرا مذہب بالکل اور قطعی صوفیانہ ہے البتہ عالم طفولیت سے جب سے کہ میں نے ہوش سنبھالا اور تسمیہ خوانی کی رسم ادا ہوئی میں اہل اسلام کے استادوں اور اتالیقوں کے تفویض کیا گیا۔"

مہاراجہ نے اپنے اساتذہ میر لطف علی صاحب اور ان کے بھائی میر پرورش علی صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان اساتذہ کے والد بزرگوار سید علی، راجہ دھیراج اور راجہ نریندر بہادر کے استاد تھے اسی طرح سید علی صاحب کے والد یعنی مہاراجہ کے اساتذہ کے دادا سید غالب، مہاراجہ چندولال کے استاد تھے۔ ان بزرگوں کے وصال کے بعد وہ مرزا علی بابا شیرازی کے شاگرد ہوئے۔ عربی میں انھیں سید خلیل ہراتی سے تلمذ حاصل تھا۔

مہاراجہ شاد نے اپنے فکر اور ذہنی تربیت کے ماحول کو پیش کرنے کے بعد ان فقرا اور بزرگان دین کا ایک مختصر تذکرہ قلمبند کیا ہے جن سے انھیں عقیدت تھی۔ اس تذکرہ میں انھوں نے مندرجہ ذیل مسلمان فقرا کا ذکر کیا ہے :

۱۔ بہار علی شاہ صاحب قادری
۲۔ حضرت سید بادشاہ بخاری شاہ صاحب
۳۔ حضرت چندا شاہ صاحب
۴۔ حضرت جمال اللہ شاہ صاحب
۵۔ حضرت غریب شاہ صاحب
۶۔ حضرت بسم اللہ شاہ صاحب
۷۔ حضرت محی الدین علی خاں معروف بہ نواب مجذوب
۸۔ حضرت داؤد علی شاہ صاحب قبلہ
۹۔ حضرت سلیمان شاہ صاحب قادری
۱۰۔ حضرت یوسف علی شاہ صاحب قادری
۱۱۔ زہرہ بی صاحبہ مجذوبہ
۱۲۔ ناندگاؤں کی مستانی ماں
۱۳۔ حضرت دلاور علی شاہ صاحب
۱۴۔ حضرت حبیب محمد حسن صاحب
۱۵۔ حضرت شیخ جابر مرحوم
۱۶۔ حضرت حبیب عیدروس
۱۷۔ حضرت خواجہ شمس الدین صاحب اورنگ آبادی
۱۸۔ حضرت بادشاہ میاں (غلیچہ والے مجذوب)
۱۹۔ حضرت مولانا محمد حسن صاحب شمس آبادی
۲۰۔ حضرت فضل اللہ شاہ صاحب
۲۱۔ حضرت مولانا سلطان صاحب مجذوب
۲۲۔ حضرت فرزند علی شاہ صاحب

۲۳۔ حضرت افتخار علی شاہ صاحب

۲۴۔ حضرت مسکین شاہ صاحب

۲۵۔ حضرت آغا داؤد صاحب

۲۶۔ حضرت محمد شاہ صاحب

۲۷۔ حضرت غنی شاہ صاحب

۲۸۔ حضرت مولانا اللہ بخش صاحب

۲۹۔ حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب

۳۰۔ حضرت بنے میاں شاہ صاحب

۳۱۔ حضرت مولوی حسن الزماں صاحب

۳۲۔ حضرت مولانا عبدالغفور صاحب ادھمی

۳۳۔ حضرت میراں شاہ صاحب

۳۴۔ حضرت مولانا مولوی خیرالمبین صاحب

۳۵۔ حضرت شاہ محمود احمد صاحب

۳۶۔ حضرت مولوی سید نورالضیاء الدین صاحب

۳۷۔ حضرت اسمٰعیل شاہ صاحب مجذوب معروف بہ کمبل والے شاہ صاحب

۳۸۔ حضرت دیوان سید غیاث الدین صاحب چشتی اجمیری

مسلمان فقرا کے ذکر کے بعد حسب ذیل ۲۱ فقرائے ہنود کا بھی تذکرہ قلمبند کیا ہے:

۱۔ اچلتانند سوامی

۲۔ گوبند داس بابا

۳۔ سنگت داس بابا اداسی

۴۔ ڈنڈی سوامی

۵۔ بابا پرچنڈانند

۶۔ چپلی والے پرمہنس

۷۔ بابا بھگت داس اداسی

۸۔ ملپا سوامی

۹۔ بابا تیرتھ دیوداسی

۱۰۔ برہمانند سوامی

۱۱۔ بابا سندر داس اُداسی

۱۲۔ مہنت بابا ہر گیان دیوداسی

۱۳۔ بابا شیام داس

۱۴۔ شنکراچاری

۱۵۔ بابا ہری سرن داس اداسی

۱۶۔ ناگ بھوشن شاستری

۱۷۔ راجی مہاراج ٹاکلی والے

۱۸۔ بھاسکر آنند سوامی

۱۹۔ سکھی بابا

۲۰۔ دیوی داس

۲۱۔ بھٹ جی بابو

اس طرح مہاراجہ کی یہ تصنیف خود نوشت سوانح حیات تذکرۂ اولیاء اور سفر نامہ کا دلچسپ مجموعہ بن گئی ہے۔ آخری ۳۰ صفحات میں اپنے سفر گلبرگہ کی روداد درج کی ہے۔ اس کی تفصیل لکھنے کے بعد اس موقع پر اسپورٹس کے پروگرام کا نقشہ بھی دے دیا ہے۔ گلبرگہ کی گوشت کی مارکٹ، سبزی منڈی، اور دوا خانے وغیرہ کے معائنہ کے بعد ان مقامات کے تفصیلی حالات قلمبند کئے ہیں۔ اس رسالہ میں مہاراجہ نے اپنے مذہبی رجحانات کو بیان کرتے ہوئے ضمنی طور پر بہت سے ایسے فقراء کے حالات زندگی تفصیل سے درج کئے ہیں جو کہیں اور مندرج نہیں تھے۔ نیز شہر گلبرگہ کے جغرافیہ، اس کی سماجی اور معاشی حالت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

جام جہاں نما "جام جہاں نما" میں مہاراجہ شاد نے اپنے سفر بمبئی کے حالات روزنامچہ کی صورت میں قلمبند کئے ہیں۔ یہ سفر نامہ ۱۰"×۶½" سائز کے ۱۴۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۳۳۰ف م ۱۹۳۰ء میں محبوب پریس علاقہ پیشکاری میں طبع ہوا اس سفر نامے میں ۲۷ نومبر ۱۹۱۶ء سے ۲۶ مارچ ۱۹۱۷ء تک کے واقعات درج

ہیں - مہاراجہ کے بمبئی میں قیام کے دوران اعلیٰ حضرت میر عثمان علیخاں بھی بمبئی گئے تھے
مہاراجہ نے کئی موقعوں پر ان سے ملنے کا شرف حاصل کرنے کا ذکر کیا ہے - نیز اس عرصہ
میں جن جن عہدہ داروں سے ملاقات ہوئی ان سب کی تفصیل دی ہے - ۱۲؍ دسمبر کے
روزنامچہ میں لکھتے ہیں کہ لائل گزٹ کے ایڈیٹر نے گروگوبند سنگھ پر ایک مضمون لکھنے کی
فرمائش کی تھی - چنانچہ مہاراجہ نے "گروگوبند سنگھ اور ہم" کے عنوان سے سات صفحات
کا ایک مضمون لکھا ہے -

دوران سفر میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا دیوان مہاراجہ کے زیر مطالعہ رہا جس میں سے
تیرہ قطعات کا اردو اور فارسی میں ترجمہ کیا ہے - موزونی طبع کے باعث مہاراجہ شاد نے
اس سفر میں کئی رباعیاں، قطعات، نظمیں، اور غزلیں لکھیں - ان میں بعض اردو میں
اور بعض فارسی - اس سفر کے دوران مہاراجہ کا ارادہ تھا کہ بغرض زیارت اجمیر شریف بھی
جائیں - لیکن ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی - اس موقع پر اپنے دلی جذبات کو نظم
کی صورت میں پیش کیا ہے - ایک شعر میں لکھتے ہیں :

میں تڑپتا ہوں شب و روز زیارت کے لئے
پوچھتے کیوں نہیں آخر سبب اس کا کیا ہے

اس نظم کے بعد بارہ رباعیاں ہیں جن میں تین فارسی اور بقیہ اردو میں - ان
رباعیوں میں بھی اجمیر شریف جانے کا اشتیاق ظاہر کیا ہے - نیز مرض طاعون سے
بچے رہنے کی دعا کی ہے -

مہاراجہ کے سفرناموں سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ جس جگہ جاتے وہاں کے
بزرگان دین کے مزاروں پر زیارت اور فاتحہ خوانی کے لئے ضرور جایا کرتے - چنانچہ ایک جگہ
لکھتے ہیں :

"حضرت شاہ محمد افضل بیابانیؒ کے مزار پر فاتحہ کے لئے جا کر قریب آٹھ بجے
کے واپس آیا -"

اسی طرح ایک اور جگہ لکھتے ہیں :

"ضروری کاغذات دیکھ رہا تھا کہ مولوی محمد علی صاحب صوبہ دار ورنگل آ گئے"

ان سے ملاقات کر کے درگاہ حضرت شاہ عبدالغنیؒ کے مزار پر بغرض فاتحہ خوانی گیا۔"

قاضی پیٹ، گلبرگہ، شولاپور ہوتے ہوئے مہاراجہ دوبارہ بمبئی پہنچے۔ بمبئی میں اس مرتبہ اعلیٰ حضرت کے ساتھ ایوان شاہی میں ڈنر میں شرکت کا موقع ملا۔ اعلیٰ حضرت کی جانب سے مہاراجہ کو حیدرآباد لوٹنے کا حکم ہوا۔ مہاراجہ نے حیدرآباد جاتے ہوئے اورنگ آباد میں قیام کیا۔ اورنگ آباد سے پربھنی پہنچے۔ اول تعلقدار صاحب اور معصوم علی صاحب نے کچھ میوہ اور شیرینی تحفتاً بھیجی تھی۔ ان دونوں اصحاب کا شکریہ نظم میں ادا کیا ہے۔ نظم کے ابتدائی اشعار میں اس بات پر اظہار افسوس کیا ہے کہ وہ پربھنی میں زیادہ نہیں ٹھہر سکے۔ اشعار درج ذیل ہیں:

گرچہ آیا میں پربھنی لیکن
وقت رہنے کا کم ہی مجھ کو ملا
باد زندہ تو باقی ہے صحبت
پھر ملیں گے بعون رب علا

مہاراجہ شادؔ پربھنی سے بلدہ حیدرآباد روانہ ہوئے۔ آخر میں لکھتے ہیں کہ کاماریڈی پیٹ اسٹیشن پر وہ ریل کے سامنے والے ڈبے میں جا کر بیٹھ گئے اور انجن چلانے اور روکنے کے طریقے دیکھتے رہے۔ اسٹیشن مرزاپلی پر انجن سے اتر گئے اور انجن ڈرائیور اور فائرمین کو انعام دیا۔ یہاں سے الوال اسٹیشن پہنچے۔ الوال مہاراجہ کی جاگیر ہے۔ الوال سے حیدرآباد واپس آئے۔

سیر ناپگور مہاراجہ نے یہ سفر تاج الدین شاہ ولی سے ملاقات کی غرض سے اختیار کیا تھا۔ یہ سفرنامہ ۶½" × ۴" سائز کے ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ سنہ تصنیف ۱۳۳۱ھ م سنہ ۱۹۱۲ء ہے۔ محبوب پریس علاقہ بیٹکاری میں طبع ہوا۔ اس کے بعد اس سفرنامہ کے دو اور ایڈیشن نکلے۔ مقالہ نگار کو دوسرا ایڈیشن نہیں ملا۔ تیسرا ایڈیشن ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا۔ مرتب کتاب "مہاراجہ کشن پرشاد" لکھتے ہیں کہ اس کی طباعت سوم "آنکھ والا" آنکھ والے کی تلاش میں" کے عنوان سے خواجہ حسن نظامی کے اہتمام سے ہوئی[1] تیسرے ایڈیشن کی یہ سرخی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب ہی کی تجویز کی ہوئی ہے۔

مہاراجہ شادؔ کو ابتدا ہی سے ہر مذہب و ملت کے صوفیوں اور بزرگوں سے عقیدت تھی جس کا ذکر انھوں نے کئی جگہوں پر کیا ہے۔ یہاں ایک موقع پر لکھتے ہیں:

---

[1] مہاراجہ کشن پرشاد ص ۹۰

کم سنی میں مجھے بزرگوں کے ساتھ بلا قید ملت و مذہب ایک خاص قسم کی عقیدت ہے۔ یہ سمجھنا چاہیئے کہ میری گھٹی میں عقیدت کا پٹ پڑا ہے۔"

تاج الدین شاہ ولی سے ملنے کا ارادہ بعض وجوہات کی بناء پر پورا نہ ہو سکا تھا لیکن اتفاق سے اپنے لڑکے عثمان پرشاد کی طویل بیماری کے سلسلے میں انھیں تبدیل مقام کرنا پڑا حیدرآباد سے وقار آباد منتقل ہوئے۔ یہاں پر بھی بچے کی بیماری بڑھتی ہی چلی گئی اور جب صورت حال ابتر ہوگئی تو مہاراجہ نے دوبارہ بلدہ ہی میں قیام کرنا مناسب سمجھا۔ سب کو بلدہ میں چھوڑ کر انھوں نے پریشانی اور اضطراب کی حالت میں ناگپور کی راہ لی۔

وقار آباد سے واپسی کے وقت مہاراجہ نے چند اصحاب کو زہرہ بی مجذوبہ کے پاس نذر دے کر روانہ کیا تھا۔ جس پر انھوں نے کہلوایا تھا "وہاں جاکر آؤ سب ٹھیک ہوگا"۔ اس وقت تو ان مجذوبہ کی بات کا مطلب کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کہاں جانا ہوگا۔ لیکن جب مہاراجہ بچے کی علالت سے تبدیل مقام کے لئے نکلے تو ریل میں کسی نے مشورہ دیا کہ باہر جانا ہی ٹھیرا تو کیوں نہ تاج الدین شاہ ولی کی خدمت میں ناگپور چلے جائیں اس وقت زہرہ بی مجذوبہ صاحبہ کی بات سمجھ میں آئی کہ ان کا اشارہ بھی تاج الدین شاہ ولی ہی کی طرف تھا۔ مہاراجہ شادؔ کا ارادہ اور بھی مصمم ہوگیا۔ اس کو غیبی امداد جان کر خدا کی وحدت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

> "اللہ تعالیٰ کی یکتائی اور اس کی وحدت کا ثبوت ہم کو ہر وقت اور ہر آن ملتا ہے۔ مگر غفلت کا پردہ عقل پر ایسا پڑا ہوا ہے کہ ہم محسوس نہیں کرتے۔ دنیاوی تعلقات اور اس کی نیرنگیوں کے تماشوں کو ماسوا اللہ کی شان میں دیکھ دیکھ کر اپنی اوقات کو خراب کرتے ہیں۔ ورنہ اگر بغور تمام اور بنظر تعمق دیکھا جائے تو اس کی وحدت ہی کا یہ سارا تماشا ہے کہ ادھر زہرہ بی نے جانے کی خبر دی اور ادھر اس کے اسباب بظاہر ایسے جمع ہوگئے کہ ناگزیر سیر و تفریح کا قصد مصمم ہوا۔ اور یار و احباب کے مشورہ سے تاج الدین شاہ ولی کی ملاقات کا عزم بالجزم ہوگیا۔"

تاج الدین شاہ ولی سے ملاقات کے لئے کئی مرحلے طے کرنے پڑے اور کئی دن لگاتار کوشش کے بعد شاہ صاحب کے پاس باریاب ہوئے اور ان سے مل کر مطمئن واپس آئے۔

مہاراجہ شادؔ کی وسیع المشربی کی وجہ سے اکثر افراد ان سے بدظن ہو گئے تھے۔ ان کا خیال تھا

کہ مذہب اسلام اور بزرگان دین سے مہاراجہ کو جو عقیدت ہے وہ تصنّع ہے اور محض دکھاوے اور شہرت کی خاطر وہ بزرگوں اور فقیروں کے ہاں جاتے ہیں۔ ناگپور سے واپس ہوتے وقت انھیں ایک گمنام خط ملا۔ جس میں ان کے مسلک کو ہدفِ ملامت بنایا گیا تھا۔ اس خط کو پڑھ کر مہاراجہ کے خیالات میں ہیجان پیدا ہوا۔ چنانچہ اس سفرنامے کے آخری تیرہ صفحات میں انھوں نے بڑے پرجوش اسلوب میں معترض کی تنگ نظری اور بداندیشی پر لے دے کی ہے۔ اور پھر اپنے مسلک کو واضح کرتے ہوئے اس مسلک پر اپنے ایقان کا اظہار کیا ہے۔ معترض کے تعصب اور تنگ نظری کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"حیرت اس بات کی ہوتی ہے کہ ہمارے دکن کے پُتلوں میں تعصب اور خود پسندی کا مادّہ بہ نسبت دوسری سرزمینوں کے زیادہ ہے جہاں تعصب کی عملداری ہوگی پھر دل و دماغ اس قابل نہیں رہتے ہیں کہ داد ملے گی راستی کے سمندر سے گوہرِ مقصود ہاتھ آئے گا۔ زبانوں کی تلوار وں سے انبیاء اور اولیاء اور بڑے بڑے قوم کے لیڈر مجروح ہوئے ہیں تو پھر مجھ بیچارے غریب کا کیا ذکر اور کس طرح ان کی تیغِ زبان کے وار سے بچ سکتا ہوں۔"

اسی ضمن میں اپنے مذہب اور عقیدے کے بارے میں شاد لکھتے ہیں:

"میں خورد سالی سے ایک آزاد منش سپاہی آدمی ہوں۔ میرا مشرب بالکل صلح کل رہا اور انشاءاللہ تادمِ زیست رہے گا۔ اور میرا دین توحید ذاتِ باری ہے اور میں موحدوں کا دل سے بندہ، صوفیوں کا خادم، عارفوں کا دست گرفتہ، محققوں کا نذر کردہ ہوں۔ اگر ہر سانس پر خدا مجھے مار کر زندہ کرے تو میری یہی دعا ہے کہ خدا مجھے موحد رکھے۔ صلح کل کے ساتھ ہر شخص کا معاملہ دین و ایمان کا اس کے خدا کے ساتھ ہے جو وحدہٗ لاشریک ہے۔"

آخری صفحات میں ہندو اور مسلمان دونوں کی تفریق اور مذہبی منافرت پر اظہارِ افسوس کیا ہے کہ تعصب اور تنگ نظری کی وجہ سے نفاق اور دشمنی بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ انھوں نے اہلِ مذہب سے یہ درخواست کی ہے کہ وہ ان کے مذہب و مسلک کے پھیر میں نہ پڑیں۔ اس لئے کہ ان کی وسیع المشربی تنگ نظروں کی فہم سے باہر ہے۔

سیر و سفر سیر و سفر ۲۳۴ صفحات کا سفر نامہ ہے۔ سائز ۶×۹½ ہے سید ناظر الحسن ہوش بلگرامی کے اہتمام سے سنہ ۱۳۳۶ھ م ۱۹۱۷ء میں ذخیرہ پریس حیدرآباد دکن میں طبع ہوا۔ جن جن مقامات پر بغرض سفر جانے کا اتفاق ہوا ان کی تفصیل بھی دے دی ہے۔ اس کے بعد سولہ صفحات کی تمہید ہے۔ تمہید میں سفر کی اہمیت بتائی ہے کہ یہ دنیا کے بہترین اصولوں میں سے ایک اصول ہے۔ سفر کے فوائد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"دنیا کے بہترین اصولوں میں سے جو اصول بنی نوع انسان نے تسلیم کر لئے ہیں اور جن کی ہدایت اور ضرورت کو دنیا نے تہہ دل سے مان لیا ہے ان میں سفر بھی ایک پاکیزہ اصول ہے جس کی خوبی سے غور بین نگاہیں پورے طریقہ پر واقف ہیں۔"

مختلف ممالک اور مختلف اقوام کی مثالیں دے کر بتایا ہے کہ ان کی ترقی کا راز اسی میں ہے کہ وہ دوسرے ممالک کے لوگوں سے بذریعہ سفر ربط قائم رکھتے ہیں "سیر و سفر" میں جو واقعات بطور روز نامچہ لکھے گئے ہیں وہ ۷؍جنوری ۱۹۱۶ء سے ۲۸؍فروری ۱۹۱۶ء تک کے ہیں۔

ابتدا میں ناندیڑ جانے اور سکھوں کا گرودوارہ دیکھنے کا ذکر ہے۔ ناندیڑ کے بعد اورنگ آباد کے مختلف تاریخی مقامات کی سیر کی۔ بزرگوں کی درگاہوں پر حاضری دی۔ مہاراجہ نے ان بزرگوں کے خاندانی حالات، سلسلہ نسب اور ان کی بڑائی و بزرگی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ دوران سفر میں کسی انجمن کے اراکین نے جلسہ میلاد میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ اس موقع پر فی البدیہہ تیس اشعار کا ایک قصیدہ لکھا تھا جو سفر نامہ میں درج ہے۔ چند ابتدائی اشعار نقل کئے جاتے ہیں:

تم پر صلوٰۃ و سلام اے شہ ہر دو سرا
احمد طٰہٰ لقب نہبط و حیٔ خدا

ذرے کو بھی آپ نے دم میں کیا آفتاب
کیسی نوازش ہے یہ کیا ہے لطف آپ کا

مجھ کو کہاں سے کہاں کھینچ کے لایا یہاں
ابر کرم فیض بخش بحر سخا و عطا

محفل میلاد میں ہو گئی جب حاضری
بڑھ گئی عزت مری بڑھ گیا رتبہ مرا

آخری دو اشعار میں اپنے مذہب کے بارے میں لکھتے ہیں:

ہوں میں اک ادنیٰ فقیر کہتے ہیں گو سب امیر
ہے وہی مالک مرا بندہ ہوں میں با وفا
مومن اگر وہ نہیں تو نہیں کافر بھی شاد
صوفیوں نے فیصلہ اس کا جبھی کر دیا

قصیدے کے بعد دو نعتیہ غزلیں ہیں۔ دونوں غزلیں نو، نو اشعار کی ہیں۔ مہاراجہ نے بمبئی کے سفر کے دوران ایک نظم لکھی تھی اس نظم کے متعلق خود مہاراجہ نے بھی لکھا ہے کہ یہ نظم ان کے سفرنامہ "سیر پنجاب" میں چھپ چکی ہے۔ یہاں دوبارہ ضیافتِ طبع کے لئے نقل کی جا رہی ہے۔ یہ نظم جو ۱۰۶ اشعار پر مشتمل ہے شہر بمبئی کی تعریف میں کہی گئی ہے۔ اگلے صفحات میں چھ غزلیات اور پانچ رباعیاں درج ہیں جو دوران سفر وقتاً فوقتاً لکھی گئیں۔ اس کے بعد کئی تاریخی مقامات اور بڑے بڑے شہروں کے تفصیلی حالات دیئے ہیں۔ حکمران بادشاہوں کی اولوالعزمی اور ان کے دیگر کارناموں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اختتام پر چار ٹھمریاں ہیں۔

روزنامچہ گلبرگہ

روزنامچہ گلبرگہ ۸½" × ۵½" سائز کے ۱۲۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ سنہ تصنیف ۱۳۴۱ھ م ۱۹۲۲ء ہے۔ نظامی پریس بدایوں میں طبع ہوا۔ گلبرگہ شریف کا یہ سفر مہاراجہ نے عرس میں شرکت کی غرض سے اختیار کیا تھا۔ اس سفرنامہ میں ۱۵ر جولائی سنہ ۱۹۲۱ء سے ۳۱ر اگسٹ ۱۹۲۱ء تک کے واقعات قلمبند کئے گئے ہیں۔ اس عرس میں اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خاں بھی تشریف لائے تھے۔ عرس کے موقع پر گلبرگہ شریف میں مہاراجہ کے ٹھہرنے کے لئے اعلیٰ حضرت نے خاص انتظام کروایا تھا۔ جس کا ذکر مہاراجہ نے ابتدا میں کر دیا ہے۔ نیز اس سفر میں ان کے ساتھ جو محلات، ملازمین اور دیگر افراد تھے ان کی بھی تفصیل دی ہے۔ گلبرگہ پہنچنے کے بعد جن مقامی حکام اور عہدیداروں کو ملنے کا موقع دیا ان کے نام تفصیل سے دیئے ہیں۔

مہاراجہ کی عادت ہے کہ روزنامچہ اور سفرنامہ لکھتے لکھتے کوئی مسئلہ معرض فکر میں آجاتا ہے تو اس پر اظہار خیال کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ ۱۷ر جولائی کے روزنامچہ میں عبادت اور اس کے معنی و مفہوم کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

> "کیا ہم اس پر غور کر سکتے ہیں کہ عبادت کے حقیقی معنی کیا ہیں۔ اور حقیقت میں عبادت کس کو کہتے ہیں۔ کیا منتروں کے گانے کا نام پرستش ہے۔ کیا چند الفاظ کے پڑھنے اور اٹھنے بیٹھنے کو طاعت حق کہتے ہیں۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ زبان اور دیگر اعضا کی یہ حرکتیں

ان جذبات کی علامتیں ہیں جو عشق خدا کی محویت میں ابھرتی ہیں۔ اپنی خواہشات کو حکم خدا اور اس کی مرضی کے تابع کر دینا عشق خدا و طاعت حق کا پہلا زینہ ہے۔ اور صفات الٰہی سے متصف ہو جانا اس کا منتہائی کمال ہے۔ یہی اصلی عبادت اور مقصود زندگی ہے۔ [۹]

اسی دن کے روزنامچہ میں تین نظمیں لکھنے کا بھی ذکر ہے۔ ان میں سے دو ابتدائی نظمیں فارسی ہیں۔ تیسری نظم اردو میں ہے۔ پہلی فارسی نظم حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رحؒ کی مدح میں کہی گئی ہے۔ دوسری شہر گلبرگہ کی توصیف میں ہے۔ تیسری اردو نظم حضرت خواجہ بندہ نواز رحؒ کی مدح میں ہے۔

اس سفر نامہ میں مہاراجہ نے کئی عہدیداروں بزرگوں اور فقیروں کا ذکر کیا ہے۔ ہر ایک سے ملاقات کی تفصیل دی ہے۔ نیز چند اصحاب کی شخصیت اور سیرت پر بھی اپنے مخصوص انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً سید شاہ محمد حسین صاحب سے ملاقات کے بعد ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "سید صاحب نہایت خوبیوں کے بزرگ ہیں۔ اور نہایت پاک باطن صلح کل مشرب۔ بے تعصب ہیں۔ سنا جاتا ہے کہ کا مانڈے راؤ مہاراج کو حضرت نے اپنا مرید کر کے خلافت نامہ بھی مرحمت فرمایا اور مجاز بیعت بھی کیا۔"

اس کے بعد دو فارسی غزلیں اور ایک قطعہ درج ہے۔ آگے ایک دعائیہ مثنوی "بزم توحید" کے عنوان سے لکھی ہے۔ اس مثنوی کے ۱۰۵ اشعار ہیں۔ مثنوی کے بعد گلبرگہ شریف کے عرس میں اعلیٰ حضرت کے شریک ہونے کا ذکر کیا ہے۔ ساتھ ہی ان کے فرمان کی نقل اور اپنا جواب بھی پیش کیا ہے "گلبرگہ کے تاریخی حالات" کے عنوان کے تحت تقریباً ۲۰ صفحات میں شہر گلبرگہ کی آبادی عام حالت اور وہاں کے حکمرانوں کے حالات تاریخ کی روشنی میں قلمبند کئے ہیں۔ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رحؒ کی حیات، سلسلہ نسب اور ان کی بزرگی اور برتری کے بارے میں معلومات درج کی ہیں۔ اس مواد کے لئے مہاراجہ نے تاریخ فرشتہ، مراۃ الاسرار اور ارمغان سلطانی سے مدد لی ہے۔

خواجہ بندہ نواز رحؒ کے علاوہ سلاطین بہمنیہ کے بارے میں بھی مستند معلومات درج کی ہیں۔ حسن گنگو بہمنی کی زندگی اور اس کی حیرت انگیز ترقی کے واقعات کو تاریخی حقائق اور شہادتوں کی روشنی میں بیان کیا ہے۔ اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں نے گلبرگہ شریف کے عرس میں شرکت کے بعد اپنے لڑکے کی سالگرہ کے موقع پر مہاراجہ اور ان کے بچوں کو دعوت دی تھی۔ اس موقع پر اعلیٰ حضرت نے اپنا فارسی کلام سنایا تھا۔ اعلیٰ حضرت کی شعری صلاحیتوں کو مہاراجہ نے یوں سراہا ہے:

"سرکار دیر تک اپنا فارسی کلام سناتے رہے۔ ماشاء اللہ طبیعت کی روانی بتلاتی

ہے کہ آئندہ اور ترقی ہوگی۔ عجیب خداداد طبیعت پائی ہے کہ جس
طرف رجوع ہوئی دریا بہا دیئے۔"

اعلیٰحضرت نے جو دو فارسی غزلیں اپنے ہاتھ سے لکھ کر مہاراجہ کو عنایت کی تھیں۔ انھیں بھی نقل کر دیا ہے۔ گلبرگہ سے واپسی کے وقت لنگم پلی اسٹیشن پر دو فارسی نظمیں لکھیں۔ ۲۸ر جولائی کے روزنامچہ میں باغ عامہ کے دلکش اور دلفریب منظر کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

"حسب عادت صبح بیدار ہوا۔ بعد الفراغ حوائج ضروری باہر آیا۔ باغ کا عالم کچھ اور ہی نظر آیا۔ ابھی دو ماہ پہلے فقیر نے اس کو دیکھا تھا۔ اگرچہ اس وقت بھی ہرا بھرا تھا۔ لیکن یہ اودی اودی گھٹائیں اور خود رو پودوں کی روئیدگیاں نام کو بھی نہ تھیں۔ یہ شبنم کی نازکی، نسیم سحری کے جھونکے کوسوں دور، نرگس، سوسن، یاسمین، چمپا کی محبت میں نسیم سحری کا ہر وقت خوش خرامی کرنا کہاں نصیب۔ یہ روز کی اودی اودی گھٹاؤں کا گھرنا۔ یہ رم جھم تل دھار مینہ کا برسنا، کچھ عجیب لطف دے رہا ہے ـــــ کبھی کبھی ہلکی پھوار کا برسنا۔ اور گھڑی دو گھڑی کو برس کر کھل جانا۔ اور وہ افق مشرق پر سینکڑوں گلدستہ ہائے رنگ برنگ آسمان کا پیش کرنا، اس کو حضور عالم بیان کے دل سے کوئی پوچھے۔ خصوص دو چھوٹے تالاب جو اس باغ کے دامن میں لبریز ہیں اور جن میں نیلوفر کے پھول اور پتے پانی کی سطح کو چھپائے ہوئے تھے۔"

باغ عامہ کی دلکشی سے متاثر ہو کر ایک فارسی نظم باغ عامہ کی تعریف میں لکھی ہے۔ جس کے ۱۳۶ اشعار ہیں۔ آخری صفحات میں صفحہ ۹۷ سے ۱۲۶ تک اردو اور فارسی نظمیں، غزلیں، مثنویاں اور قطعات درج کئے ہیں۔ دو نظموں میں اپنی نواسی کے کم عمری میں فوت ہو جانے پر اظہار افسوس کیا ہے۔ اس کے بعد ایک مثنوی موسوم بہ "عرض حال" ہے جو علحدہ کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکی ہے۔ غزلوں کی تعداد آٹھ ہے۔ جن میں تین اردو اور پانچ فارسی ہیں۔ سات رباعیات اور پانچ قطعات ہیں۔ ایک سپاس نامہ مثنوی کے طرز پر لکھ کر اعلیٰحضرت کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اس کے ۴۴ اشعار ہیں۔ دو تہنیت نامے بھی شامل ہیں۔ اس طرح مہاراجہ نے اپنے اس مختصر سے سفر نامے میں جگہ جگہ اپنی خداداد شعری صلاحیتوں کا اظہار بھی کیا ہے اور موزونیٔ طبع

اور موقع کے لحاظ سے اپنے تاثرات اور خیالات کو اشعار کی صورت میں پیش کیا ہے۔

سفر شادنگر

"سفر شادنگر" مہاراجہ شادؔ کا ایک مختصر سا سفرنامہ ہے جو ۹½" × ۶½" سائز کے ۱۱۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ بہ اہتمام محمد مقتدی خاں شروانی مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ میں سنہ ۱۹۲۲ء میں طبع ہوا۔ اس سفرنامہ میں ۱۰ر ڈسمبر ۱۹۲۱ء سے ۴ر اپریل ۱۹۲۲ء تک کے سفر کے حالات قلمبند کئے گئے ہیں۔

ابتدا میں شادنگر جانے اور وہاں ایک رات ٹھیرنے کا ذکر کیا ہے۔ شادنگر کے دلفریب مناظر کی تعریف کرتے ہوئے ۱۱ر ڈسمبر کے روزنامچہ میں لکھتے ہیں:

"حسب معمول صبح کے چار بجے بیدار ہوا اور حوائج ضروری سے فراغت پا کر اپنے مالک حقیقی کو یاد کرتا رہا۔ آسمانی تھیٹر میں ہم نے صبح کو شبنمی پردہ گرتے دیکھا۔ یہ بھی دیکھا کہ نیچر کے ایکٹر نے کرہ ارض کے اسٹیج پر صبح کا سین دکھلانے کو کس عجیب طریقہ سے رات کا پردہ ہٹایا اور صبح کا سین دکھایا جو ستارے رات تمام رات جگمگاتے رہے وہ کس طرح جھلملا کر چھپ رہے ہیں اور چاند کا قدرتی لیمپ جو ابھی روشن تھا کس صفائی سے ہمارے سامنے بڑھایا اور صبح کا سین کس دلچسپی سے ہم کو دکھایا گیا۔ ابھی صبح کی سہانی سینری ہمارے پیش نظر تھی اور آسمان سے زمین تک ایک نوراتی حالت کا منظر نظر کو اپنی طرف کھینچے ہوئے تھا کہ یکایک صبح کا پردہ اٹھا اور ایک نگار آتشیں عذار تخت زرنگار پر جلوہ افروز نظر آنے لگا۔"

لائل گزٹ کے ایڈیٹر نے مہاراجہ سے درخواست کی تھی کہ لائل گزٹ کے ایک نمبر کے لئے گرو گوبند سنگھ جی مہاراج کے لئے ایک مضمون لکھیں۔ مہاراجہ نے شادنگر جا کر ان کی خواہش پوری کر دی اور ایک مضمون لکھ بھیجا۔ جسے "سفر شادنگر" میں نقل کر دیا ہے۔ یہ مضمون تقریباً ۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں گرو گوبند سنگھ جی کی شخصیت، ان کے مذہب اور ان کے اوصاف کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔[1] گرو گوبند سنگھ کے مضمون کے بعد دو قطعات تاریخی اور ایک نظم ہے۔ پہلا قطعہ مولوی

---

[1] یہ مضمون مہاراجہ کے سفرنامہ "جام جہاں نما" میں بھی شامل ہے۔ اس پر تبصرہ مہاراجہ کے مضامین کے سلسلہ میں کیا گیا ہے۔

احمد حسین صاحب کی لڑکی کی شادی پر لکھا ہے۔ دوسرا سید امیر حسین صاحب کی نواسی کی شادی پر لکھا ہے جو آغا حیدر حسن صاحب دہلوی سے طے پائی تھی۔ تیسری نظم آغا حیدر حسن صاحب کے دعوتی کارڈ کے جواب میں ہے۔ ان کے متعلق مہاراجہ لکھتے ہیں کہ ان کی ریختی بڑے چوچلے کی ہوتی ہے اور وہ خود بھی ایک بامذاق آدمی ہیں۔ نظم کے بعد ایک قطعہ تاریخ ہے جو احمد حسین صاحب کے لڑکے کی شادی کا دعوت نامہ ملنے پر لکھا گیا ہے۔ ۱۲/ دسمبر کے روزنامچہ میں ایک غزل کے موزوں ہونے کا ذکر ہے۔ غزل کے نو اشعار ہیں۔ اس کے علاوہ اس سفرنامے میں کئی اردو اور فارسی قطعات، رباعیات، غزلیں اور نظمیں بھی ہیں جو وقتاً فوقتاً موزوں ہوئے۔

مہاراجہ شاد نگر سے مدنا پور (وپیرتی روڈ) روانہ ہوئے۔ یہاں کے دلفریب مناظر لوگوں کے رہن سہن اور عادات و اطوار سے بے حد متاثر ہوئے۔ چنانچہ روانی میں تقریباً پانچ صفحات اس موضوع پر لکھ گئے ہیں۔ وپیرتی روڈ اسٹیشن پر ایک نظم بھی لکھی ہے۔ یہ نظم تیرہ اشعار پر مشتمل ہے۔ جس میں یہاں کے اسٹیشن ماسٹر اور دیگر ملازمین سرکار کی خدمات کی ستائش کی ہے۔ ۲۲/ دسمبر کو مہاراجہ ایک ڈنر میں شرکت کی غرض سے صرف ایک دن کے لئے حیدرآباد روانہ ہوئے۔ راستے میں مناظر قدرت کا پورا پورا لطف اٹھایا۔ واقعات کی پیش کشی اور منظر نگاری ملاحظہ ہو:

> "معلوم ہوتا تھا کہ سطح صحرا پر طلائی پوڈر سے مینا کاری کی گئی ہے۔ ہرے بھرے کھیتوں کے پودے ہوا کی مستانہ روی سے خوش ہو ہو کر جھومنے لگتے ہیں۔ نیم سبز جھاڑیوں میں رنگ برنگ کے خود رو پھولوں کی بہار سے ایک دلفریبی پیدا ہو گئی ہے۔ زرد زرد تمروڑا اور سرخ سرخ پھول سبز سبز پتوں میں قدرت کی گلکاریاں دکھا رہے تھے۔ جہاں کہیں تالاب یا پانی کی جھیل ہے وہاں آبی جانور کس آزادی و اطمینان کے ساتھ خوش فعلیاں کر رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے خوبصورت اور خوش آواز پرند دن بھر اس کھلے میدان میں چرچگ کر اپنے اپنے آشیانوں کی طرف جا رہے تھے۔ وقت کے خوش نما منظر نے ان کے ننھے دلوں پر بھی اثر ڈالا تھا اور وہ فرط مسرت سے زمزمہ سرائی کر کے اس خدائے یگانہ کی حمد و ثنا کا گیت گا رہے تھے۔ جس

کی صناعیوں کا یہ دشت ایک کرشمہ ہے۔ قدرت کی صناعیاں
نظر کو اپنی طرف کھینچنے میں مقناطیسی قوت سے کام لے رہی تھیں"۔

اس کے بعد "سلت سنجوگ" نامی ایک کتاب پر تبصرہ ہے۔ یہ کتاب لکھنو سے بہ ذریعہ پارسل مہاراجہ کو بھیجی گئی تھی۔ جو انھیں شادنگر میں وصول ہوئی۔ مہاراجہ لکھتے ہیں:

"اس کتاب میں برہما، وشنو اور شیو کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور وشنو بھگوان کی بے چینی اور شیو مہاراج کی ہدایت کے عنوان سے کتاب کو شروع کیا ہے۔"

مہاراجہ شاؔد نے بتایا ہے کہ برہما اس دنیا کے پیدا کرنے والے ہیں۔ وشنو اس کو سنبھالنے کے ذمہ دار ہیں اور شیو اس کا سنگھار کرتے ہیں۔ یہ تینوں مل کر اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔ "سلت سنجوگ" میں ان تینوں کی گفتگو کو سوال و جواب کے پیرائے میں لکھا ہے۔ مہاراجہ شاؔد اس بارے میں لکھتے ہیں کہ بہت لطیف و پُرمعنی سوال و جواب ہیں۔

سفر کے دوران مہاراجہ کی جن جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان سب کے نام اور ان کے عہدوں کی تفصیل دی ہے۔ عبدالرزاق صاحب مفتی متولی درگاہ غلام نبی شاہ صاحب نے اپنی نو رباعیات پیش کی تھیں۔ مہاراجہ شاؔد نے ان کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا اور پہلی چھ رباعیوں کی تضمین بھی کی ہے۔
نئے سال کے آغاز پر مہاراجہ کے ذہن میں جو خیالات اور تاثرات پیدا ہوئے ان کو پیش کرنے کے لئے تقریباً پانچ صفحات رنگ دیئے ہیں۔ سال نو کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں یوں دعا کرتے ہیں:

"الٰہی یہ سال نو انسان، چرند، پرند حیوان بلکہ گھانس کی پتی پتی کے لئے مبارک کر۔ چونکہ آج ہم شادنگر کے جنگل میں اپنے خود میزبان و مہمان ہیں اس لئے جنگل کی گھانس، درخت و جھاڑی کی بھی خیر منانے والے ہیں۔ الٰہی امیر، غریب، بادشاہ و گدا امن و راحت سے زندگی بسر کریں۔ ہر جگہ شانتی اور اطمینان کا پہرہ ہو۔ الٰہی سب کے طفیل میں فقیر شادؔ معہ وابستگان و متعلقان و اولاد و احفاد، نوکر چاکر، اپنے بیگانے تیری حفاظت و حمایت میں شاد و خوش کام رہیں۔"

۱۲ر جنوری کے روزنامچہ میں لکھتے ہیں کہ اس دن اتفاق سے غالب کا اردو دیوان ان کی نظر

سے گزرا۔ غالب کی شخصیت اور قادر الکلامی سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں :

"غالب کی ہستی ان چیدہ اور بزرگ تر ہستیوں سے ہے جن کا وجود ابدی ہے۔ وہ ایک غیر معمولی ذکی الطبع، فلسفی اور ایک بلند پایہ شاعر تھا۔ جس کے قصائد انوری و خاقانی کے قصائد سے ٹکراتے ہیں۔ جس کی غزلیات عرفی و طالب کی غزلیات سے وزنی ہیں۔ جس کی رباعیات فارسی میں عمر خیام کی رباعیات سے گراں قدر ہیں جس کی نثر ابوالفضل و ظہوری کی نثر سے زیادہ شاندار ہے۔"

اسی سلسلہ میں آگے لکھتے ہیں :

"تعمقِ خیال، بے عیب طرز، وسعت نظر، عالمگیر ہمدردی یہ تمام خوبیاں غالب کی نظم و نثر میں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں۔ مرزا غالب کا کلام توحید، تصوف، حکمت، فلسفہ، عبرت، بے ثباتیٔ دنیا، خودداری، جذباتِ حب الوطنی، ارتقاء، تناسخ، وحدت الوجود وغیرہ مسائل اور رازِ فطرت کے بہت سے اسرار کا گنجینہ ہے۔"

غالب کے اکثر اشعار کی توضیح ایسے انداز سے کی ہے جس سے مہاراجہ کی شعر فہمی اور مذاقِ شعری کا اندازہ ہوتا ہے۔ آخر میں تقریباً آٹھ صفحات کا ضمیمہ ہے۔ جس میں خواجہ بازار کے افتتاح کی تفصیل دی ہے۔ غبار صاحب (منتظم پیشی) نے اس موقع پر ایک قطعہ تاریخ لکھ کر پیش کیا تھا اُسے نقل کر دیا ہے۔ ۵ر اپریل کو لکھتے ہیں کہ ان کا ارادہ عمدہ نگر میں قیام کر کے بلدہ واپس جانے کا تھا لیکن طبیعت کی خرابی کے باعث سیدھے بلدہ روانہ ہو گئے اور سرکار میں اپنی واپسی کی اطلاع کروا دی۔

تفریحِ شاد

تفریحِ شاد' اس سفر نامے کا روزنامچہ ہے جسے مہاراجہ نے سن گروا پاسی مہاراج کے درشن کی غرض سے اختیار کیا تھا۔ ۸½" × ۵½" سائز کے ۱۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ بہ اہتمام احمد حسین جعفر علی، سنہ ۱۹۲۴ء میں مطبع احمدیہ چار مینار حیدر آباد میں طبع ہوا۔ ابتدائی چار صفحات میں بطور تمہید سفر کے فوائد قلمبند کیے ہیں۔ تہذیب و شائستگی کے بلند معیار پر پہنچنے کے لئے سفر کو لازمی قرار دیا ہے۔ تبادلۂ خیال سے ہی بلند خیالی پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ سفر کے بغیر ناممکن ہے۔ سفر کی ان گنت خوبیوں کے بارے میں لکھتے ہیں :

"سفر کے اثرات نہایت وسیع ہیں۔ انسان کے تمام افعال ارادی، اخلاق، معاملات، معاشرت، تمدن، طریقۂ تمدن، حرف اوقات، علوم، وقار، اور قدر و منزلت، عجائبات قدرت کا نظارہ ہر ملک کے لوگوں سے تبادلۂ خیالات، معلومات، صحت اور شہرت وغیرہ یہ تمام باتیں ایک سفر ہی سے وابستہ ہیں۔ تمام دنیا کے بانیان مذہب نے عام اس سے کہ وہ کسی مذہب و ملت کے حامل ہوں "از سفر وسیلۃ الظفر" کی صداقت کو ایک حد تک تسلیم کر لیا ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ اس پر معنی جملے میں دینی اور دنیاوی ترقیات کے بے شمار اسرار پوشیدہ ہیں۔"

تمہید کے بعد مہاراج کی بڑائی، عظمت اور ان کی بے تعصبی کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

"مہاپرش ست گرو اپاسنی مہاراج کی بابرکت ہستی سرزمین ہند پر بسنے والی دو بڑی قوموں یعنی ہندو اور مسلمان کے روحانی اتحاد کا ایک بے زنگ آئینہ ہے۔ اپاسنی مہاراج نہ مسلمانوں کو بت پرستی سکھاتے ہیں نہ ہندوؤں کو مسلمان بننے کی ہدایت کرتے ہیں نہ پارسیوں کو اسلامی تعلیم کا حلقہ بگوش بناتے ہیں۔ حقیقت حال یہ ہے کہ فقرا وہ مذہب نہیں رکھتے جو آپس میں بیر رکھنا سکھاتا ہو۔ یا جس کو نادان لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ مذہب وہی ہے جو دنیا میں فرقہ بندی کے تعصبات پیدا کرے۔ بلکہ فقرا کی ذات جلوۂ الٰہی ہوتی ہے۔"

اپاسنی مہاراج کے تذکرے کے بعد روزنامچہ کی ابتدا ہوتی ہے جو ۱۹؍اگست ۱۹۲۴ء سے لے کر ۲۰؍اکتوبر ۱۹۲۴ء تک روزانہ پیش آنے والے واقعات پر مشتمل ہے۔ اس سفرنامہ میں اپاسنی مہاراج کے علاوہ دوسرے بزرگان دین سے بھی ملاقات کا ذکر ہے اور وقتاً فوقتاً ایسے مقامات پر جانے کی تفصیل بتائی گئی ہے جو مذہبی اور تاریخی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ مختلف مسجدوں، مندروں اور مقبروں کو دیکھنے کے بعد اپنے تاثرات کو دلکش پیرائے میں قلم بند کیا ہے۔ عمارات کی خوبصورتی، فن تعمیر اور مختلف مناظر کی پیش کشی میں جو جزئیات نگاری کی ہے وہ ان کی قوت مشاہدہ کو ظاہر کرتی ہے اور یہ بھی

پتہ چلتا ہے کہ مشاہدات و تجربات کے اظہار پر انھیں کتنی قدرت ہے۔

اجمیر شریف میں حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کی درگاہ پر بھی کئی بار حاضری دی۔ ان کی زندگی کے تفصیلی حالات، نیز ان کی کرامات کا بھی ذکر کیا ہے۔ درگاہ شریف پر حاضری دینے کے بعد تین قطعات لکھے ہیں جن سے بزرگان دین کے ساتھ ان کی عقیدت مندی ظاہر ہوتی ہے اور اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے صلح کل مشرب کی بناء پر مختلف مذاہب کے بزرگوں سے ملنے، ان کی عزت کرنے اور اس کو دین و دنیا میں سرخ روئی حاصل ہونے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

آخر میں ناندیڑ میں سکھوں کے ہادیان طریقت گرو گوبند سنگھ کا گرودوارہ دیکھنے کا ذکر ہے۔ ان کی زندگی اور کارناموں کی تاریخی اہمیت پر بھی کافی وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے گرو گوبند سنگھ کی بلند حوصلگی اور اولوالعزمی کے بارے میں جو رائے قائم کی ہے وہ درج ذیل ہے:

> "اس قوم میں صرف گرو گوبند سنگھ ہی کی ذات ایسی ذات ہے جس نے اپنی قوم کو ترقی کا خوشنما چہرہ دکھایا۔ اور جس نے احساس اور حمیت کو کوٹ کوٹ کر قومی قالب میں ایک تازہ روح پھونک دی۔ جس نے کاہلی اور سستی کا منحوس لباس اتار کر چستی اور مستعدی اور پوری پوری جفاکشی کا جامہ پہنایا۔ جس نے ہندوستان کے اکثر حصص میں اپنی تعلیم کو پہنچایا۔"

مہاراجہ کا یہ سفرنامہ تاریخی معلومات، قوت مشاہدہ اور قدرت اظہار کے اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے۔

روضہ شریف

روضہ شریف ایک مختصر سا سفرنامہ ہے جو ۶½" × ۵" سائز کے ۳۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ سنہ طباعت درج نہیں ہے۔ محبوب پریس علاقہ پیش کاری میں طبع ہوا۔ اس سفرنامہ میں روضہ شریف ایلورا اور دولت آباد کے قلعہ کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ ابتدائی پانچ صفحات دیباچہ کے ہیں جس میں بتایا گیا ہے کہ اس سفر کے حالات رسالہ دبدبۂ آصفی میں وقتاً فوقتاً شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن چند اصحاب کی فرمائش پر انھیں مضمون کی صورت میں علحدہ شائع کیا جارہا ہے۔ تاکہ عوام تاریخی مقامات سے واقفیت حاصل کر سکیں۔

روضہ شریف (خلد آباد) کے حدود، اس کی بلندی اور آب وہوا وغیرہ کے بارے میں لکھنے کے بعد روضہ شریف کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی ہے کہ چونکہ یہاں کئی مشہور اور معروف

اولیاء، بزرگان دین، سلاطین اور مشاہیر کے مزار موجود ہیں اس کا نام روضہ شریف رکھا گیا ہے۔ روضہ شریف کے تمام مقبروں کی تفصیل دی ہے۔ اور ساتھ ہی روضہ شریف کی بیچ میں چھپی ہوئی تصویر بھی ہے۔ روضہ شریف کے بعد ایلورا کو تاریخ کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ اس کے متعلق لکھتے ہیں:

"ایلورا وہ مقام ہے جس کا ثانی روئے زمین پر نہیں اگر مشعل آفتاب لے کر بھی دیکھئے تو ایلورا کو اپنی ہی آپ نظیر یعنی بے نظیر پائے گا۔ جس نے ایلورا نہیں دیکھا اس نے دنیا کے پردے پر کچھ نہیں دیکھا۔"

ایلورا کی بھی تصویر دی گئی ہے۔ اس کے بعد ایلورا کے ۳۴ مندروں کا تفصیلی ذکر ہے دولت آباد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ اہل ہنود کا بنایا ہوا ہے اور وہ اسے دیوگڑھ کہتے تھے۔ دولت آباد کے جو حالات قلمبند کئے ہیں وہ بادشاہ نامہ سے ماخوذ ہیں۔ روضہ شریف اور ایلورا کی طرح قلعہ دولت آباد کی بھی تصویر دی ہے۔

سفر دو ہفتہ

"سفر دو ہفتہ" میں ایک مختصر سفر کے واقعات قلم بند کئے گئے ہیں سائز ۷½ × ۵، صفحات ۳۴۔ سنہ طباعت درج نہیں

محبوب پریس علاقہ پیشکاری میں اس سفر نامہ کی طباعت ہوئی۔ اس سفر کی اصل غائت محبوب پرشاد کی اچانک موت کے غم کو بھلانا تھا۔ چنانچہ مہاراجہ نے اعلیٰ حضرت سے اجازت طلب کی اور دو ہفتہ کے لئے اورنگ آباد اور ناندیڑ کو روانہ ہوگئے تمام ضروری کام وہیں انجام دیتے رہے۔

سفر نامہ کی ابتدا میں مہاراجہ نے بتایا ہے کہ اولاد کی موت کا صدمہ انسان کے لئے ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ اور جس کو اس سے سابقہ پڑتا ہے وہی جانتا ہے کہ یہ سانحہ کس قدر تکلیف دہ ہوتا ہے

مہاراجہ نے سفر اورنگ آباد اور ناندیڑ کے واقعات رپورٹ کی صورت میں اعلیٰ حضرت کی خدمت میں روانہ کر دیئے تھے۔ لیکن عوام کی واقفیت کے لئے بعد میں کتاب کی صورت میں اسے شائع کر دیا گیا۔

سکھوں کے رہنما گرو گوبند سنگھ کا ذکر اکثر جگہوں پر کیا ہے اور جب بھی کیا ہے بہت ہی وقعت اور عزت کے ساتھ کیا ہے۔ گرودوارہ سے واپسی

کے وقت گرو گوبند سنگھ کے بارے میں لکھتے ہیں :

"سکھوں کی قوم میں گرو گوبند سنگھ صاحب ایک برگزیدہ اور مقدس بزرگ تھے۔ یہ انھیں کا مزار ہے جو تقریباً دو سو سال سے اپنے تقدس کا پرتو اس سرزمین پر ڈال رہا ہے۔ یوں تو تمام مذاہب ہنود اس مقام کو متبرک سمجھتے ہیں۔ لیکن اول درجہ میں سکھوں اور دوسرے درجہ میں کھتریوں کو خاص عقیدت ہے۔ یہاں کے تمام خدام قوم سکھ سے ہیں۔ تعظیماً اس مزار کے محدود مقام کو گرودوارہ کہتے ہیں۔"

اس کے بعد ناندیڑ اور اورنگ آباد کے انتظامات، آمدنی اور خرچ کے بارے میں لکھنے کے بعد ہر صوبہ کی رپورٹ لکھی ہے۔ مدارس کا معائنہ کرنے کے بعد وہاں کی صنعتی ترقی کو سراہا ہے۔ آخر میں روضہ شریف اور جالنہ جانے کا ذکر ہے۔ جالنہ کے دواخانے کے بارے میں اطمینان بخش رپورٹ لکھی ہے۔

سفر دو ہفتہ کا ترجمہ " The Two weeks Tour " کے نام سے سہراب جی پیسٹوبجی کانگا نے کیا ہے جو ۸ × ۵ سائز کے ۳۰ صفحات پر مشتمل ہے سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔

شکار شیر شاہی

مہاراجہ کا یہ سفرنامہ علٰحدہ کتابی صورت میں دستیاب نہیں ہوا۔ پتہ نہیں کہ یہ علٰحدہ شائع ہوا بھی یا نہیں۔ معصوم علی وارثی (معتمد پیشی واسٹیٹ) نے اپنی تالیف "مکاتیب یمین السلطنت" میں مہاراجہ کے اس سفرنامے کو نقل کیا ہے۔ مہاراجہ کا یہ سفرنامہ ۹½ × ۶½ سائز کے تقریباً سولہ صفحات پر مشتمل ہے۔

موضع ماٹرپلی سے مہاراجہ شاد کو اطلاع ملی تھی کہ اس موضع کے جنگلوں میں چار شیر دکھائی دیتے ہیں جو مویشیوں کو ہلاک کر رہے ہیں۔ اس اطلاع پر مہاراجہ نے فوراً شکار پر جانے کی تیاریاں شروع کر دی اور اعلیٰ حضرت کی خدمت میں عرضی روانہ کی کہ چونکہ حضور کو بھی شکار پسند ہے اس لئے وہ بھی ان کے ساتھ شکار کے لئے چلیں۔

اعلیٰ حضرت نے اس عرضی کا جواب یہ دیا کہ وہ شکار کے لئے دوسری طرف جا رہے ہیں اس لئے مہاراجہ شاد تنہا جا سکتے ہیں۔

اعلیٰ حضرت کی اجازت پاکر مہاراجہ شاد ۲۰؍ ذی قعدہ کو اپنے ساتھیوں کے ہمراہ روانہ ہوگئے۔ شیر کے شکار سے پہلے جتنی تیاریاں اور جس قدر اہتمام ہوا ان سب کی مہاراجہ نے تفصیل دی ہے اور ان شکاریوں کے نام بھی دیئے ہیں جو مہاراجہ کے ساتھ تھے۔ اپنے ساتھیوں کی مدد سے انھوں نے دو شیروں کا شکار کیا۔ لوٹتے ہوئے بابا شرف الدین صاحبؒ کے مزار پر جاکر فاتحہ پڑھی اور وہاں سے ایوان ملک پیٹ پہنچے۔ اس کے بعد اعلیٰ حضرت کی خدمت میں اپنے آنے کی اطلاع کروائی۔ قدم بوسی کے بعد نذر پیش کی اور اپنے مکان واپس آئے۔

اس سفر نامہ کی ابتدا میں مہاراجہ نے لکھا ہے کہ انھیں چار شیروں کے نظر آنے کی اطلاع دی گئی تھی اس لئے دو شیروں کو نشانہ بنانے کے بعد انھوں نے اپنے نائب کو تاکید کر دی تھی کہ بقیہ دو شیر جب بھی نظر آئیں انھیں اطلاع دی جائے۔ چنانچہ ذی الحجہ میں انھیں شیروں کی آمد کی اطلاع ملی۔ اس دفعہ مہاراجہ کو اس بات کی خوش خبری سنائی گئی کہ اعلیٰ حضرت بھی سردار ولا سے ماٹر پلی میں رونق افروز ہوں گے۔ اس اطلاع کے ملنے پر مہاراجہ کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اعلیٰ حضرت نے اپنے رونق افروز ہونے کے بعد مہاراجہ سے کہا کہ چونکہ شام ہو چکی ہے اس لئے وہ دوسرے دن لوٹیں گے۔ اعلیٰ حضرت کا قیام مہاراجہ کے لئے دلی خوشیوں کا باعث تھا۔ اپنے جذبات اور تاثرات کو مہاراجہ شاد نے جن الفاظ میں ظاہر کیا ہے ان سے سلطان دکن سے مہاراجہ کی والہانہ عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ شاد لکھتے ہیں:

> "ناظرین غور فرمائیں کہ بادشاہ جب اپنے خانہ زاد کو سرفراز فرمانا چاہتا ہے تو ہر عنوان سے اس کو عزت سے، خلعت سے ممتاز فرماتا ہے۔ درحقیقت اس موقع پر میرے آقا، میرے خداوند نعمت کو نہ صرف شیر کا شکار مرکوز خاطر ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی مجھ خانہ زاد کی عزت افزائی بھی بہ دل منظور ہے۔"

اس دفعہ جب کہ مہاراجہ کے ساتھ اعلیٰ حضرت بھی تھے، اتفاق سے مہاراجہ نے کوئی شکار نہیں کیا اس ناکامی کی وجہ سے مہاراجہ بے حد شرمندہ ہوئے لیکن اعلیٰ حضرت نے اپنے خط میں یہ لکھ کر انھیں اطمینان دلایا:

> "آج ہانکا خالی جانے اور شیر نہ ملنے کا آپ کچھ خیال نہ کریں۔ مجھے زیادہ تر شیر کے ملنے سے بھی یہ اچھا معلوم ہوا کہ میں یہاں دو

تین روز بہت اچھا اور خوش رہا۔"

۱۷؍ذی الحجہ کے روزنامچہ میں لکھتے ہیں کہ ایک تیندوا سامنے آیا۔ اعلیٰ حضرت نے گولی چلائی لیکن اس تیندوے کی بدنصیبی ہے کہ بادشاہ کا شکار نہ بنا۔ نشانہ بالکل خطا نہیں ہوا بلکہ گولی اس کے پاؤں کو لگتی ہوئی نکل گئی۔ آخری صفحات میں ایک قطعہ، رباعی، اور ایک منظوم عرضی درج ہے۔ قطعہ آموں کے عنایت ہونے کے شکریہ میں ہے۔ رباعی اور منظوم عرضی گل موتیا کی نذر کے ساتھ پیش کرنے کے لئے لکھی ہے۔

سیرِ پنجاب

یہ سفرنامہ ۱۵۹ صفحات پر مشتمل ہے جس میں ۶؍جون ۱۹۱۳ء سے ۱۳؍اگست ۱۹۱۳ء تک کے سفر کے حالات روزنامچہ کی صورت میں لکھے گئے ہیں۔ سائز ۹"×۶"، طباعت اور کاغذ دونوں عمدہ ہیں سنہ طباعت درج نہیں۔ ابتدا میں چھ صفحات کا دیباچہ ہے جس میں سفر کے فوائد بتائے ہیں۔

ایک جگہ لکھتے ہیں:

"سفر اخلاقی اور روحانی نیکیوں کی تعلیم دیتا ہے، تمدن اور حسن معاشرت کی اصلاح کرتا ہے۔ صناع ازل کی دلچسپ سبزیاں اور کوہ و صحرا کے مناظر دکھاتا ہے۔ زمانہ اور زمانے کے طبائع۔ علوم اور علوم کے نتائج سے آگاہ کرتا ہے۔"

پہلے اجمیر شریف کے عرس میں شرکت کی غرض سے جانے کا ذکر ہے۔ خواجہ صاحب کی زندگی کے حالات اخبار "توحید" کی مدد سے نہایت عالمانہ انداز میں قلمبند کئے ہیں درگاہ شریف اور دیگر قریبی مزاروں کی زیارت کے بعد ایک غزل موزوں کی ہے جو آٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ مہاراجہ شاد اجمیر شریف سے بمبئی روانہ ہوئے۔ بمبئی کے حالات پر انھوں نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ سڑکوں۔ بازاروں، ہوٹلوں اور اسٹیشنوں کے نام بھی دیئے ہیں۔ اعلیٰ حضرت کے بمبئی جانے کے وقت بمبئی پر ایک نظم لکھ کر پیش کی تھی۔ اس نظم کے ۱۰۶ اشعار ہیں۔ پوری نظم بہت ہی سادہ اور سلیس انداز میں لکھی گئی ہے۔ بمبئی کے ہر موڑ اور ہر شاہراہ سے روشناس کرایا ہے۔ دہرہ دون کے قیام کے زمانے میں ۱۴ رباعیاں لکھیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجہ شاد باوجود گوناگوں مصروفیات کے اپنے ذوق

شعری کو پورا کئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ دو رباعیاں یہاں نقل کی جاتی ہیں :

ہے کوہ اور شجر میں جلوہ کس کا — اے شاد ذرا دل ہے یہ شیدا کس کا
دیکھا جس کو وہی نظر میں آیا — ہے مردم چشم میں تماشا کس کا

کیا کفر ہے اور کیا یہ مسلمانی ہے — اے شاد دوئی خطور شیطانی ہے
کچھ صوم و صلواۃ پر نہیں ہے موقوف — توحید جو ہے یہ وصف رحمانی ہے

سفر کے دوران وقتاً فوقتاً جو قصائد، رباعیات، غزلیں اور مفرد اشعار موزوں ہوئے وہ بھی برمحل اسی روزنامچہ میں درج کر دئیے گئے ہیں۔ کھتری کانفرنس میں جو ایڈریس پیش کیا گیا تھا اس کے جواب میں شاد نے ایک تقریر کی تھی۔ اس تقریر کے ذریعہ زیادہ تر اپنے مذہب اور مشرب سے عوام کو واقف کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے خاندان کا سلسلہ راجہ ٹوڈرمل سے بتانے کے بعد اپنے عقائد اور مذہبی رجحانات کے بارے میں لکھتے ہیں :

"بیشک کھتری النسل سپاہی نژاد ہوں۔ لیکن جب سے میں نے ہوش سنبھالا میرا مذہب صوفیانہ رہا ہے اور انشاء اللہ رہے گا۔ مجھے اسلام کے ساتھ اس لئے اُنس ہے کہ میں سچے دل سے اپنے مُلک اور مالک سے محبت رکھتا ہوں اور جب تک زندہ رہوں گا انشاء اللہ تعالیٰ رکھوں گا۔ میرا تعلق ہندو اور مسلمانوں کے ساتھ ایسا ہے جیسا کہ روح کا تعلق جسم کے ساتھ۔"

آخری صفحات میں غزلیں دی گئی ہیں جو مختلف اوقات میں اور مختلف محرکات کے تحت موزوں ہوئیں۔ ان غزلوں کی تعداد ۱۳ ہے۔

شکار شیر

یہ سفرنامہ "سیر و شکار" کے عنوان سے رسالہ "حسن" جلد سوم نمبر ۷ اور ۹ میں دو قسطوں میں شائع ہوا ہے۔ ۸½" × ۵½"

سائز کے تقریباً ۲۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس سفرنامے کے بارے میں مرتب
کتاب "مہاراجہ کشن پرشاد" لکھتے ہیں۔

"اپنی جاگیر میں اپنے شکار شیر کے واقعات کو روزنامچہ
کی صورت میں مرتب کیا۔ رسالہ "حسن" میں طبع ہوا
ہے۔ علحدہ شائع ہونے کا پتہ نہ چلا۔ اس سے مہاراجہ
مرحوم کے سنجیدہ مذاق اور نوجوانی ہی سے سنجیدگی پر
روشنی پڑتی ہے۔"

اسی سفرنامہ کی اشاعت کے متعلق ایڈیٹر رسالہ "حسن" نے حاشیہ میں لکھا ہے:

"یہ مضمون مصنفہ جناب راجہ کشن پرشاد صاحب بہادر
بغرض حوصلہ افزائی دیگر امرائے وطن درج رسالہ کیا
جاتا ہے۔ امید ہے کہ ابتدائی حالت سے ہمارے
نوجوان امراء روز بروز لٹریچر میں ترقی کرتے رہیں گے۔
اور پبلک میں اپنا اثر پھیلائیں گے۔ جن مخصوص وجوہ
سے پیشکار صاحب کا یہ مضمون بہ مشکر گزاری درج
رسالہ ہوتا ہے وہ وثیقہ دوسرے اہل مضامین
کے لئے نہیں ہو سکتا۔"

ابتدائی صفحات میں مہاراجہ شاد نے سیر و شکار کے فوائد بتائے ہیں اس کے
بعد ورزش جسمانی کے اصول اور اس کے فوائد پر روشنی ڈالی ہے۔ نیز یہ بھی بتایا
ہے کہ ہر ملک کی آب و ہوا اور تہذیب و تمدن کے لحاظ سے سیر و تفریح کے
اصول اور قاعدے مختلف ہوتے ہیں۔ اپنی نجی زندگی سے مثالیں دے کر مہاراجہ
نے یہ واضح کیا ہے کہ کس طرح انھیں بچپن ہی سے بنوٹ، بندوق بازی اور
تیراندازی کے فنون سکھائے گئے تھے۔ اس ضمن میں مہاراجہ نے اپنے دو اساتذہ
کا بطور خاص ذکر کیا ہے کہ بنوٹ کے لئے میر وزارت علی فرزند مراد علی شاہ اور
تیراندازی اور بندوق بازی کے لئے میر عظمت علی خاں صاحب مقرر کئے گئے تھے۔
مہاراجہ لکھتے ہیں کہ پندرہ برس کی عمر میں وہ فن تیراندازی میں خاصے ماہر ہو گئے تھے۔

چنانچہ عظمت علی خاں صاحب نے شکار کے لئے ہفتہ میں دو دن جمعہ اور پیر مقرر کئے تھے۔

مہاراجہ لکھتے ہیں کہ جمادی الثانی ۱۳۰۵؁ھ م ۱۸۸۸ء میں وہ ۱۵ اپنے نانا راجہ نریندر بہادر سے دو ہفتہ کی اجازت لے کر اپنے دوستوں کے ساتھ موضع منگل پلی کو شکار کی غرض سے روانہ ہوئے۔ مہاراجہ کے ساتھ شجاعت علی خاں، شہاب الدین اور دیگر افراد تھے۔ ان دونوں افراد کی مہاراجہ شادؔ نے بطور خاص تعریف کی ہے۔ مختلف قسم کے شکار کرنے اور تفریحی مقامات پر جانے کا ذکر کرنے کے بعد طوائفوں کا گانا سننے کا تفصیلی حال لکھا ہے۔ ایک شخص کی شعبدہ بازی بے حد پسند آئی۔ اس کے کرتبوں کا ذکر کافی تفصیل سے کیا ہے۔

۱۹ر جمادی الثانی کے روزنامچہ میں موضع منگل پلی کے دفتری کاروبار کا معائنہ کرنے کا ذکر ہے۔ زمین، فصل، ذرائع آب پاشی اور وہاں کے مختلف پیشوں کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے بعد حسب ضرورت اصلاحیں تجویز کیں۔ رعایا کی پریشان حالی کی وجوہات اور ان کو دور کرنے کی تجاویز بھی لکھی ہیں۔ آخری صفحات میں اسی موضع کی آبادی، محل وقوع اور آب و ہوا کے بارے میں مزید تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ایک شیر کے شکار پر جانے کا ذکر ہے۔ یہ سفرنامہ ۱۶ر جمادی الثانی سے ۲۰ر جمادی الثانی تک کے سفر کے واقعات پر مشتمل ہے۔

قدوم سلطانی

قدوم سلطانی ۷" × ۵" سائز کے ۴۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ محبوب پریس علاقہ پیشکاری میں طبع ہوا۔ یہ ایک سفرنامہ ہے جس میں شیر کے شکار کے واقعات روزنامچہ کی صورت میں لکھے گئے ہیں۔ سفرنامے کے درمیان میں برموقع مہاراجہ کی تصاویر بھی دی گئی ہیں جو شکارگاہوں سے متعلق ہیں۔

اس سفرنامے میں ۱۲ر ذی قعدہ ۱۳۱۶؁ھ سے ۳۰ر ذی الحجہ ۱۳۱۶؁ھ تک کے واقعات روزنامچہ کی صورت میں قلمبند کئے گئے ہیں۔ آخر میں موضع ماماڑپلی جو مہاراجہ کی جاگیر ہے اس کا نقشہ بھی دیا گیا ہے۔

ایک سفرنامہ

یہ سفرنامہ باوجود ممکنہ سعی کے دستیاب نہ ہو سکا۔ مرتب کتاب "مہاراجہ کشن پرشاد" نے اس سفرنامہ کے بارے میں ایک نوٹ لکھا ہے۔ جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"کرنل پیٹے رزیڈنٹ آنے کے قبل بہ وجہ علالت مزاج تبدیل آب وہوا کے لئے کوئی مختصر سفر کیا تھا۔ اس کے حالات اور اپنی طرز زندگی و جذبات کی اس میں توضیح کی ہے۔ ان کے سفرناموں میں یہ بڑا دلچسپ ہے۔ مگر اب دستیاب نہیں ہوا ہے۔"

ـــــــــــ

ع۱: مہاراجہ کشن پرشاد ص ۳۰۹

خطوط

اردو میں خط لکھنے کا میلان انیسویں صدی کے وسط میں پیدا ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ فارسی کو بھی زوال آرہا تھا اور اردو کی مقبولیت بڑھتی جارہی تھی۔ ویسے تاریخی اعتبار سے رجب علی بیگ سرور کے خطوط ملتے ہیں جو "انشائے سرور" کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ لیکن ان خطوط کا انداز و اسلوب فارسی خطوط کا چربہ ہے۔ درحقیقت اردو میں خط نگاری کا آغاز غالب سے ہوتا ہے۔ غالب نے اردو میں خط لکھنے کا جو البیلا انداز ایجاد کیا تھا۔ اس انداز و اسلوب کے وہ موجد بھی تھے اور مختتم بھی۔ غالب کے بعد خطوط لکھنے اور چھپوانے کا میلان اس قدر عام ہوا کہ خطوط کے بیسیوں مجموعے ان کے بعد شائع ہوئے اور ہوتے چلے جارہے ہیں لیکن غالب کے خطوط کی بات کسی میں پیدا نہ ہوسکی۔

غالب کے بعد جن اہل قلم حضرات کے خطوط سے ادبی دنیا روشناس ہوئی ان میں سرسید، محسن الملک، وقارالملک، شبلی، حالی، آزاد، اکبر، امیر مینائی، داغ، مہدی افادی، نیاز فتح پوری، ابوالکلام آزاد، مولوی عبدالحق، اور عبدالماجد دریابادی قابل ذکر ہیں۔ ہر ادیب کے خطوط میں اس کے اسلوب نگارش کی جھلکیاں آگئی ہیں۔ اگر ان مجموعوں کا تجزیہ کیا جائے تو دو طرح کے خط نگار ملیں گے۔ ایک وہ جو سرسید کی طرح سادہ لکھنے والے ہیں دوسرے وہ جن کے خطوط میں شبلی کی طرح ادبیت اور زبان کی چاشنی ہے۔ محسن الملک، وقارالملک، حالی اور عبدالحق کا انداز نگارش سرسید سے ملتا جلتا ہے اور بقیہ ادیب شبلی سے مشابہت رکھتے ہیں۔ یہ سب کسی نہ کسی حد تک خطوط میں اسلوب پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ نیاز فتح پوری کے خطوط اس کی اچھی مثال ہیں۔ وہ یہ سمجھ کر خط لکھتے ہیں کہ ان کے خطوط شائع ہونے والے ہیں۔ اس احساس نے ان کے خطوط میں ادبی چاشنی تو پیدا کردی لیکن نہ ان کی شخصیت بے نقاب ہوسکی اور نہ ان میں نجی خطوط کی بے تکلفی کی فضا پیدا ہوسکی۔

مہاراجہ کشن پرشاد بھی عہد جدید کی خط نگاری کے ان رجحانات سے متاثر تھے

مہاراجہ کی شخصیت بہت جامع تھی وہ ادیب بھی تھے اور شاعر بھی اور مصلح اخلاق بھی سیاست داں بھی صوفی بھی تھے اور امیر بھی۔ سوسائٹی کے ہر طبقہ کے آدمی ان کے ملنے والوں میں شامل تھے۔ کم و بیش تمام دوستوں سے ان کی خط و کتابت تھی۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے اپنے پرائیوٹ دفتر میں ایک علحدہ شعبہ قائم کر رکھا تھا۔ اور ان کے پرائیوٹ سکریٹری غبار صاحب نے ہر ایک کے خطوط کے الگ فائل بنا رکھے تھے اور ان خطوط کے ساتھ مہاراجہ کے خطوں کے مسودے بھی منسلک کر دئیے تھے۔

مہاراجہ شاد کی خط نگاری کے دو طریقے تھے۔ کبھی تو وہ اپنے پرائیوٹ سکریٹری کو خط کا مسودہ لکھ لانے کی ہدایت کرتے اور مسودہ پیش ہونے کے بعد اس میں ضروری اصلاحیں کر دیتے۔ چنانچہ ان کے خطوط کی فائلوں میں ایسے متعدد خطوط ملتے ہیں جو غبار صاحب نے لکھے ہیں اور مہاراجہ نے ان میں اپنے قلم سے اصلاحیں کی ہیں۔ پرائیوٹ سکریٹری سے خطوط کے مسودے لکھوانے کی دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک وجہ تو ان کی گوناگوں مصروفیات تھیں جو انھیں اتنی مہلت نہ دیتی تھیں کہ بر وقت خطوط کا جواب خود لکھیں اس لئے وہ یہ کام اپنے سکریٹری سے لے لیتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ایسے کاروباری خطوط جن کا جواب بندھا ٹکا ہوتا وہ اپنے سکریٹری سے لکھوا لیتے۔ شاد کے پرائیوٹ سکریٹری غبار صاحب خود شاعر اور صاحب ذوق آدمی تھے اور ان کے ادبی مذاق سے اچھی طرح واقف تھے۔ چنانچہ ادیبوں اور شاعروں کے نام جن خطوط کے مسودے غبار صاحب نے لکھے ہیں ان میں برمحل اور برجستہ فارسی یا اردو کے اشعار نقل کئے ہیں اور مکتوب الیہ سے مہاراجہ کے روابط کی نوعیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے چٹکلے، لطیفے، اور تلمیحیں بھی قلم بند کرتے گئے ہیں۔ اگر کوئی اس حقیقت سے واقف نہ ہو تو پہچان نہیں سکتا کہ یہ خط مہاراجہ نے نہیں بلکہ غبار صاحب نے لکھے ہیں۔ جب کبھی فرصت ملتی مہاراجہ خود خطوط کے جوابات لکھتے۔ یہ نہیں تھا کہ بڑے لوگوں کے خطوط کے جواب خود لکھتے اور معمولی لوگوں کے خطوط کے جوابات غبار صاحب سے لکھواتے ہوں۔ فرصت کے اوقات میں وہ ہر درجہ کے آدمی کو اپنے قلم سے خط لکھتے تھے۔ یوں بھی مہاراجہ کے اسلوب میں سادگی اور بے تکلفی ہے۔ خطوط میں اس سادگی اور بے تکلفی میں جذبات و کیفیات کا خلوص بھی شامل ہو گیا ہے جس کی وجہ سے ان کے خطوط میں وہ تمام خصوصیات جمع ہو گئی ہیں

جو بھی خطوط میں ہونی چاہیئں۔

جو خطوط مہاراجہ نے ادیبوں اور شاعروں کے نام لکھے ہیں ان میں جگہ جگہ ادبی نکات چھیڑ دیئے ہیں۔ بزرگان طریقت کے نام لکھے گئے خطوط میں مذہبی مباحث اور تصوف کے نکات کا ذکر ملے گا۔ مہاراجہ کے خطوط کے موضوعات جو بھی ہوں ان کے تمام خطوط کی ایک مشترکہ خصوصیت یہ ہے کہ ان کا ہر خط ان کی تہذیب و شائستگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ مکتوب الیہ کے مرتبہ کا خصوصیت کے ساتھ خیال رکھتے ہیں اور چھوٹوں کو بھی وہ کبھی ایسی بات نہیں لکھتے جس سے ان کی دل شکنی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مہاراجہ کی تربیت ایک مخصوص ماحول اور ایک مخصوص تہذیب میں ہوئی تھی اور وہ اُس مخصوص تہذیب کے سراپا نمونہ تھے۔ اس لیے اس تہذیب کا ان کے خطوط پر چھایا ہوا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

مہاراجہ شادؔ کی خط و کتابت مختلف اہل قلم حضرات سے تھی۔ ان خطوط کو تبصرہ کی سہولت کے لئے دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ۱۔ مطبوعہ ۲۔ غیر مطبوعہ

خطوط کے مندرجہ ذیل پانچ مجموعے شائع ہوئے ہیں:

۱۔ رقعات شادؔ ۲۔ جمال یار ۳۔ شاد اقبال ۴۔ اکبرؔ الہ آبادی اور مہاراجہ کشن پرشادؔ کی خط و کتابت ۵۔ مکاتیب یمین السلطنت۔

رقعات شاد

یہ مجموعہ ۱۰ × ۶½ سائز کے ۲۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ سنہ اشاعت ۱۳۱۸ھ م ۱۹۰۰ء ہے۔ مقام اشاعت کا پتہ نہیں چلتا۔ اس میں مہاراجہ کے ۲۰۹ خطوط ہیں جو امراء، شعرا، علماء، اور اطباء وغیرہ کے نام ہیں ابتدا میں اعلیٰحضرت غفران مکاں کے نام عرائض ہیں جو شاہ پرستی کے جذبات سے بھرپور ہیں شادؔ نے اعلیٰحضرت کو ان الفاظ میں مخاطب کیا ہے "پیر و مرشد اعلیٰحضرت حضور پرنور بندگان عالی خلد اللہ ملکہ مدظلہ العالی" اور خود کو "جاں نثار خانہ زاد موروثی کشن پرشاد عفی عنہ" لکھا ہے۔ تمام عرائض میں حد درجہ ادب اور احترام کا لحاظ رکھا گیا ہے اور جگہ جگہ اعلیٰحضرت کی درازی عمر، بلند اقبالی اور سرخ روئی کے لئے دعا مانگی ہے۔

شعرا کے نام جو خطوط ہیں ان میں مختلف ادبی نکات ملتے ہیں۔ شعر و سخن کے تذکرے ہیں۔ الفاظ کے موزوں اور مناسب استعمال پر تبصرہ بھی ہے۔ داغؔ دہلوی

کے نام ایک خط ہے جس میں شاد لکھتے ہیں :

" آپ نے جتلانا، بتلانا، دکھلانا ان قافیوں پر جو کلام داغ میں متروک ہیں اعتراض فرمایا تھا۔ میں تسلیم کرتا ہوں چونکہ ذوق اور غالب کے کلام میں یہ جائز ہے اور آپ خود ذوق خاقانی ہند کے شاگرد ہیں اسی خیال سے میں نے یہ قافیہ باندھا۔ آیندہ سے ضرور خیال رکھوں گا۔"

غالب نے خطوط نگاری میں جدت پیدا کی تھی۔ پرانے اور فرسودہ طرز تخاطب کو ختم کر دیا تھا۔ مہاراجہ شاد نے بھی بعض جگہوں پر غالب ہی کا طرز اختیار کیا ہے۔ مولوی احمد حسین صاحب کے نام ایک خط ہے جس میں مہاراجہ نے انھیں اس انداز سے مخاطب کیا ہے گویا ان سے بالمشافہ گفتگو کر رہے ہیں۔ شاد لکھتے ہیں :

" مزاج شریف، مجلس امرا کیا برخواست ہو گئی کہ آپ کی ملاقات ایک دم ترک شد۔ خیر جہاں رہیے اچھے رہیے اور دوستوں سے دلی محبت رکھیئے۔ اور مالک کے خیر خواہ رہیے۔ ہاں! میں آپ کو ایک اور خیر خواہ کی طرف متوجہ کرتا ہوں۔ اگر آپ بھی سعی کریں گے تو بقول کسی ہندی کے جو سیوا کرے گا وہ میوا پائے گا۔"

بعض خطوط میں اپنے شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح دی ہے۔ اپنے ایک شاگرد قاسم علی خاں کو لکھتے ہیں :

" آپ کی غزلیں اور تاریخیں پہنچیں۔ فارسی غزل البتہ بھڑک ہوئی ہے۔ مگر دونوں اردو غزلیں اور تاریخیں لائق اصلاح نہ تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لکھنے میں نہایت عجلت کی گئی۔ بہت غور اور فکر کے ساتھ نہیں لکھی گئیں۔ اگرچہ ایک اردو غزل میں چند اشعار میں نے بھرتی کر دیے ہیں مگر دوسری غزل کو صرف دو چار اشعار دیکھ کر چھوڑ دیا۔ مکرر نہ آپ اس میں غور کر کے لکھیئے اور متقدمین کے دواوین میں قافیے دیکھ کر

لکھئے۔ کیونکہ قافیوں کا انتخاب بالکل غلط ہوا ہے۔ اکثر شعرا نے ان دونوں زمینوں میں غزلیں کہی ہیں۔ ضرور متقدمین کا کلام دیکھا کیجئے تاکہ آمد یا آورد مضامین میں مدد ملے۔"

مہاراجہ کے ایک دوست دیوی داس کی بیوی کا انتقال ہوگیا تھا۔ انھیں ان الفاظ میں تسلی دی ہے:

"آپ کی بیوی جو جنت کو سدھاریں خوب ہوا۔ روز کے دکھڑے سے بچے۔ دائم المریض تھیں۔ ہزار ہا روپیہ آپ کا برباد ہوا مگر اس کی بیماری میں فرق نہ آیا۔ مسیحا بھی ہوتے تو وہ اچھی نہ ہوتیں۔ اللہ بیچاری کو غریق رحمت کرے۔ . . . . . جو کچھ گزری اس کو غنیمت جان لو اس بیچاری کے مرنے کا غم نہ کرو۔ مگر ہاں اس کی اطاعت اور فرماں برداری آپ کو یاد آتی ہوگی۔ خیر! دعا کرو کہ خدا مغفرت کرے۔ اگر آپ جنت میں جائیں تو وہی حور پیکر ہو کر آپ کو نصیب ہوں۔"

"رقعات شاد" کے آخری صفحات میں صفحہ ۲۰۸ سے ۲۳۶ تک مختلف اہل قلم حضرات کی تقریظیں اور قطعات ہیں۔ پہلی تقریظ مہاراجہ کشن پرشاد نے اپنے لڑکے چندا پرشاد کے انتقال پر لکھی ہے جو رقعات شاد کے مرتب ہیں۔ اس کے بعد سید نور الضیاء الدین صاحب ضیا اور سید محمد قادری صاحب کی تقریظیں ہیں جو فارسی میں ہیں۔ سید عبدالعلی صاحب حقانی اور لطیف احمد مینائی کی تقریظیں اردو میں ہیں۔ اس کے بعد تاریخی قطعات ہیں۔ جن میں پہلا فارسی قطعہ سید اعظم اللہ حسینی کا لکھا ہوا ہے۔ لطیف احمد مینائی اور رائے ٹھاکر پرشاد کے قطعات اردو میں ہیں۔ آخری قطعہ فارسی ہے جو قاضی صاحب نے لکھا ہے۔

"رقعات شاد" ادبی حیثیت کے حامل ہیں۔ اس مجموعے کے اکثر خطوط علماء اور شعرا کے نام ہیں۔ جن میں شعر و سخن کے تذکرے ملتے ہیں۔ کتابوں کی تصنیف و اشاعت کا ذکر ہے۔ دوسروں کے اشعار پر اصلاح دی گئی ہے اور اپنے اشعار

پر اصلاح لی گئی ہے۔

جمال یار مہاراجہ شاد اور جمال الدین نوری کی خط و کتابت کا یہ مجموعہ ۲½"×۵" سائز کے ۳۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ سنہ ۱۳۴۱ھ م ۱۹۲۲ء شمس الاسلام پریس حیدر آباد میں طبع ہوا۔ ابتدا میں ابو محمد عمر بن صلاح یافعی نے چار صفحات کا سر نامہ لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے وضاحت کی ہے کہ مہاراجہ نے ان سے اس مجموعہ کا کوئی نام رکھنے کی فرمائش کی تھی چنانچہ انھوں نے "جمال یار" تجویز کیا۔ "سر نامہ" کے بعد مُلّا محمد عبد الباسط صاحب کا لکھا ہوا دیباچہ ہے۔ دیباچہ میں انھوں نے مولانا نوری اور مہاراجہ شاد کی علمی و ادبی صلاحیتوں کو سراہا ہے

جمال یار میں دو خط مولانا نوری کے اور ایک خط مہاراجہ کا ہے۔ پہلے خط میں مولانا نوری نے سجادہ نشین چشتی چمن سید ظہور عالم حسینی کے لئے مہاراجہ سے مالی اعانت چاہی ہے۔ ان کی زندگی کے حالات سے واقف کرانے کے بعد مہاراجہ سے مالی امداد کی ان الفاظ میں درخواست کی ہے:

> "امیر دریا دل وزیر ماہ منزل نواب مستطاب یمین السلطنت بہادر کی دریا دلی گھنگھور گھٹا ہو کر درویشانِ بے نوا پر زر و گوہر کا مینہ برساتی ہے۔ فقرائے ہند جھولیاں بھر کر نہال ہو جاتے ہیں اور مشائخ طریقت موتی رول کر مالا مال۔ اس لئے امید بندھتی ہے کہ ان کی بے کسی اور بے بسی پر بھی مہر کی نظر ہو جائے۔ آفتاب ہمت چمکے گا، ابر کرم برسے گا اور ماہانہ کچھ نہ کچھ ماہوار یا روزانہ کچھ نہ کچھ یومیہ مقرر ہو کر دعا گویان دولت میں شمار ہو جائے گا اور بخت خفتہ بیدار۔"

اس خط کے جواب میں مہاراجہ نے جو خط لکھا ہے اس میں انھوں نے مولانا نوری کے خط کو "گلدستۂ معرفت" سے تعبیر کیا ہے۔ مولانا نوری نے جن صاحب کے لئے سفارش کی تھی ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "آپ نے جس کے لئے سفارش کی ہے ان کے واسطے مجھ سے جو کچھ ہو سکا وہ نہ آپ کی سفارش کے لائق ہے نہ ان کے۔ نہ مجھ حقیر کے خاندان

کی شان کے لائق ہے۔ مگر حقیر نقیر ہے اس لئے میری ذاتی شان
کے لائق اگر سمجھا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ پندرہ روپیہ ماہانہ آپ کی
تحریر کی تاریخ سے اجرائی کے لئے جیب خاص کے نام حکم دیا گیا ہے"

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجہ کسی کی درخواست کو کبھی رد نہیں کرتے تھے اور جس قدر ہو سکے مالی امداد سے دریغ نہیں کرتے تھے۔

مولانا نوری کا دوسرا خط کافی طویل ہے۔ اس میں انھوں نے تصوف کے بہت سے مسائل کو حل کیا ہے۔ توحید کے چار مختلف درجوں کی وضاحت کی ہے۔ نیز مہاراجہ کی سخاوت امارت اور شان فقیری کی تعریف کی ہے۔ اس سلسلے میں مولانا نوری لکھتے ہیں:

"ایک نہیں کئی امیروں کو میں نے دیکھا ہے، دولت کے نشے میں چور ہوتے ہیں اور حکومت پر مغرور۔ دل ہوس کا قبر ہوتا ہے اور دماغ فرعون کا دار الخلافہ لیکن قصر وزارت کا رنگ دیکھتا ہوں تو کچھ عالم نظر آتا ہے، امیروں کے عمل میں فقیروں کی شان ہے اور فقیروں کے رنگ میں امیروں کا ٹھاٹ۔ نہ دولت کا نشہ ہے نہ حکومت کا گھمنڈ۔ امارت کی بلندی میں تواضع کی پستی ہے۔ سخاوت کے دریا میں خجالت کا جوش ہے اور بخشش کے نشے میں معافی کا ہوش اس لئے قلم گوہر نگار کی نگارہ بندی پر جب نگاہ پڑتی ہے تو کیا کہوں کہ مجھ پر کیا کیفیت گزر جاتی ہے۔"

○

شاد اقبال

مہاراجہ کشن پرشاد اور ڈاکٹر اقبال کی خط و کتابت کا یہ مجموعہ ۸" × ۶½" سائز کے ۱۷۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں اعظم اسٹیم پریس حیدر آباد دکن میں طبع ہوا۔ اس مجموعہ میں مہاراجہ شاد کے ۵۲ خطوط علامہ اقبال کے نام اور اقبال کے ۴۹ خطوط مہاراجہ کے نام ہیں۔ یہ تمام خطوط ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۷ء تک کے زمانے کے لکھے ہوئے ہیں۔ اور سلسلہ وار مرتب کئے گئے ہیں۔ ابتدا میں مرتب کتاب ڈاکٹر زور نے تقریباً بتیس صفحات کا مقدمہ لکھا ہے۔ جس میں انھوں نے مہاراجہ اور اقبال کے تعلقات پر وضاحت سے روشنی ڈالی ہے۔ اور حسب موقع ان کے خطوط کا

حوالہ بھی دیا ہے۔ مقدمہ کے بعد علامہ اقبال اور مہاراجہ شاد کی تصاویر اور ان کے خطوط کے نمونے دیئے گئے ہیں۔

اقبال سے مہاراجہ کے دیرینہ مراسم تھے۔ اس لئے اس مجموعے کے تمام خطوط نہایت بے تکلفانہ انداز میں لکھے گئے ہیں۔ تمام خطوط خانگی زندگی کے واقعات، سیاسی حالات اور شعروادب کی باتوں سے بھرپور ہیں۔ مہاراجہ کے خطوط سے حد درجہ خلوص کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک خط میں اقبال کو لکھتے ہیں:

"میرے پیارے اقبال

خدا تمہیں دل شاد وسلامت رکھے۔ بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ جس وقت اقبال کا خط دیکھتا ہوں باچھیں کھل جاتی ہیں اور نہایت دل شاداں اور مسرور ہو جاتا ہے۔ اللہ کے واسطے محبت ہے نہ کوئی غرض دنیوی نہ دین کا سوال۔ حالانکہ اس قسم کا ارتباط اور بھی ایک دوسے ہے۔ مگر آپ سے کیوں اس قدر خلوص ہے اس کا علم بھی اس عالم الغیب کو ہے۔"

اس خط کے جواب میں اقبال لکھتے ہیں:

"سرکار والاتبار۔

محبت نامہ مل گیا۔ جس کے لئے اقبال سراپا سپاس ہے۔ الحمد للہ کہ آئینہ دل گرد غرض سے پاک ہے۔ اقبال کا شعار ہمیشہ سے محبت وخلوص رہا ہے اور انشاء اللہ رہے گا۔ اغراض کا شائبہ خلوص کو مسموم کر دیتا ہے۔ دل تو بہت عرصہ سے آرزومند آستانہ بوسی ہے مگر کیا کیا جائے ایک مجنوں اور سوزنجیریں۔"

مہاراجہ اپنی غزلیں اور دیگر تصانیف اقبال کو بھیجا کرتے تھے۔ چنانچہ اقبال نے مہاراجہ کی ایک فارسی غزل کی تعریف کرتے ہوئے خواہش ظاہر کی ہے کہ ان کا فارسی دیوان بھی شائع ہو کر منظر عام پر آجائے۔ اقبال لکھتے ہیں:

"فارسی غزل کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ آپ کا والا نامہ بارہ دن میں ملا تھا۔ بھوپال کے وکالت پیشہ احباب میں بعض ذوق سخن رکھتے ہیں۔ اہل پنجاب کے دلوں پر آپ کا نقش تو پہلے سے ہے۔ فارسی غزل "کیستم من" جب

پڑھی گئی تو ارباب ذوق سرمست ہو گئے۔ واقعی لاجواب غزل ہے۔ انھیں باتوں سے اقبال آپ کا گرویدہ ہے .... کیا خوب ہو اگر سرکار عالی کا فارسی دیوان مرتب ہو کر دیدہ افروز اہل بصیرت ہو۔"

اسی طرح خود مہاراجہ اپنی ایک نظم کے بارے میں لکھتے ہیں:

"میں نے ایک نظم لکھی ہے جس کا حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب نے نام رکھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس کی شرح بھی لکھ رہے ہیں۔ بعض احباب نے تقریظیں بھی لکھی ہیں۔ اگرچہ ابھی شائع نہیں کی۔ لیکن ایک کاپی مکمل پروف کی آپ کے پاس بھیجتا ہوں اس پر نہ ٹائٹل پیج ہے نہ ابھی اس کی تکمیل ہوئی ہے۔ اس کو آپ بالاستیعاب دشمن کی نظر سے ہر پہلو ہر نظر ڈالئے اور بغور تمام دیکھ کر اگر اشاعت کے قابل سمجھیں تو ایک تقریظ بھی لکھیں۔ اور اسی ہفتہ میرے پاس بھیج دیں۔ آپ اس کے متعلق جو کچھ بھی لکھیں گے خوب لکھیں گے۔ آپ کی رائے مستند ہو گی۔ اگر کوئی شعر یا اشعار نکالنے کے قابل سمجھتے ہیں تو بخوشی میں عمل کروں گا۔ ترمیم و تنسیخ کی آپ کو اجازت ہے"

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجہ اپنی ادبی تخلیقات اقبال کو دکھایا کرتے تھے۔ ان سے مشورہ لے کر اس پر عمل بھی کرتے تھے۔ مہاراجہ کے اکثر خطوط سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ان کی نظم و نثر کے بعض حصوں کو علامہ اقبال نے تنقیدی نظر سے دیکھا ہے اور اپنی رائے ظاہر کی ہے۔

اقبال سے چونکہ مہاراجہ کے روابط بہت مخلصانہ تھے اس لئے اکثر خطوں میں گھریلو حالات لڑکیوں کی شادی بیاہ بیویوں اور بچوں کی علالت وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ نیز مہاراجہ نے وقتاً فوقتاً اپنے مذہب اور مسلک پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اور پیران طریقت سے انھیں جو دلی عقیدت ہے اس کی بھی وضاحت کی ہے۔

O

مہاراجہ اور اکبر الہ آبادی

اکبر الہ آبادی اور مہاراجہ کشن پرشاد کی خط وکتابت

کی خط وکتابت کا یہ مجموعہ ۷″ × ۵″ سائز کے ۴۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ سنہ ۱۳۷۰ھ میں محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں طبع ہوا۔ اس مجموعہ میں مہاراجہ کے ۹ خطوط اکبر کے نام اور اکبر کے ۲۵ خطوط مہاراجہ کے نام ہیں۔ اس مجموعہ کو خواجہ حسن نظامی صاحب نے شائع کیا ہے۔ سرورق پر لکھا ہے:

> "حضرت مولانا سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی مرحوم اور مہاراجہ سرکشن پرشاد مرحوم وزیر اعظم حیدرآباد دکن کی خط وکتابت، جس میں حضرت اکبر کے ۲۵ خطوط مہاراجہ کے نام اور مہاراجہ کے ۹ خطوط حضرت اکبر کے نام درج کئے گئے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی نے ان خطوط پر حواشی لکھ کر بزم اکبر پاکستان کے لئے طبع کرائے۔"

اس نوٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب نے کسی اور سے یہ مجموعہ مرتب کروا کر شائع کیا ہے۔

مہاراجہ شاد اکبر الہ آبادی کی شخصیت اور ان کے کلام سے بے حد متاثر تھے اور ان کی شاعری کی تعریف کرتے تھے۔ اکبر کو مہاراجہ کا طرز تحریر پسند تھا۔ وہ اکثر ان کے طرز تحریر کو سراہتے تھے۔ چنانچہ وہ مہاراجہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "آپ بے مثل انسان ہیں کہ آپ نے باوجود اس قابلیت اور اقتدار کے ہم ایسے گوشہ نشینوں اور دل شکستوں کو مہربانیوں خوش اخلاقیوں اور دل نوازیوں سے ایسا وابستہ دامن دولت کر رکھا ہے کہ آپ سے مراسلت میں ایک انبساط قلب محسوس ہوتا ہے۔ بڑائی اور بزرگی اور اعلیٰ قابلیت کی یہی پہچان ہے۔ یوں تو آپ کے ہر خط کی عبارت دل آویز ہوتی ہے۔ لیکن ایک دفعہ آپ نے ایک فقرہ تحریر فرمایا تھا کہ ہم ہیں

ہم آپ کے دل کی سنیں آپ میرے دل کی سنیں" وہ اب تک یاد ہے اور ابھارتا اور اکسا تا رہتا ہے کہ شرف ملاقات ہو۔"

اسی طرح ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں :

" آپ سے مراسلت نہ صرف باعث عزت ہے بلکہ غذائے روح ہے ۔"

اکبر نے اپنے ایک خط میں مہاراجہ کی ایک غزل اور مضمون کی تعریف کی تھی اس قدر افزائی کا شکریہ مہاراجہ نے ان الفاظ میں کیا ہے :

" شاد نہ خوشامدی ہے نہ خوشامد پسند ، البتہ سچے اور دلی ہمدردوں کی قدرافزائی کا شکریہ ادا نہ کرنا اخلاق کی کمی تصور کرتا ہے۔ اور وہ بھی کون ؟ جس کو ہر طرح واجب العزت سمجھتا ہے. آپ جس شعر یا جس غزل کی داد دیتے ہیں ، شاد اس کو اپنی محنت وجاں فشانی کا ثمرہ اور ان الفاظ کو اپنے لئے باعث سند یا سرٹیفکٹ تصور کرتا ہے ۔"

○

مکاتیب یمین السلطنت

مہاراجہ شاد اور سید معصوم علی وارثی معتمد پبلسٹی واسٹیٹ کی خط وکتابت کا یہ مجموعہ ۶½ × ۹½ سائز کے ۱۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ منقبول وارثی کے اہتمام سے سنہ ۱۳۷۱ھ میں طبع ہوا۔ ابتدا میں ناظر یار جنگ نے پیش لفظ لکھا ہے ۔ جس میں انھوں نے مہاراجہ سے معصوم علی وارثی کے تعلقات اور روابط پر روشنی ڈالی ہے ۔ "تعارف" میں بھی نظامت جنگ بہادر نے ان دونوں کے تعلقات واضح کرتے ہوئے ان کے خطوط کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے ۔

تعارف کے بعد تین تقریظیں ہیں ۔ پہلی تقریظ خواجہ حسن نظامی صاحب کی ہے ۔ دوسری آر۔ ایس ۔ نائک صاحب کی اور تیسری تقریظ خلیل الزماں صاحب کی لکھی ہوئی ہے ۔ ان تقریظوں میں مہاراجہ اور ان کے خاندانی اوصاف پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ نیز مہاراجہ سے معصوم علی وارثی کے تعلقات کی بھی وضاحت کی گئی ہے ۔ اس کے بعد "روح دیباچہ" کے عنوان سے مہاراجہ کا ایک عزت نامہ "قدم سلطانی"

کا اقتباس دیا گیا ہے جو ۴۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس اقتباس کے بعد معصوم علی وارثی کے عرائض اور مہاراجہ شاد کے خطوط ہیں۔ ایک خط مہاراجہ نے منوہر آباد کیمپ سے لکھا ہے۔ جس میں انھوں نے معصوم علی وارثی کی خدمات کی ستائش کرتے ہوئے انھیں ایک گھڑی بطور تحفہ دینے کا ذکر کیا ہے۔ مہاراجہ لکھتے ہیں:

"ناظم صاحب! الحمدللہ جتنے دن میں یہاں رہا بہت خیریت سے رہا۔ اور میرے عیال و اطفال سب خیریت سے رہے آپ نے میری سربراہی اور کیمپ کے متعلق جس دلسوزی اور جفاکشی سے انتظام رکھا اور اپنی ذات سے نگرانی کرتے رہے میں نہ صرف ہمیشہ شکر گزار رہوں گا بلکہ آپ کی محنت اور عمدہ کارگزاری میرے دل میں یادگار رہے گی۔ اور میرا دل ہمیشہ آپ کی قدر کرتا رہے گا۔ اگرچہ آپ کی خدمات کے لحاظ سے صلہ بھی ویسا ہی ملنا چاہیئے تھا مگر میں بطور صلہ کے نہیں بلکہ بطور ایک مختصر تحفہ کے ایک گھڑی اس غرض سے بھیجتا ہوں کہ انسان وقت کی قدر کرے اور ہر وقت وہ گھڑی میری یاد آپ کو دلاتی رہے۔"

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجہ اپنے ماتحتین سے کس قسم کا برتاؤ کرتے تھے۔

خطوط اور عرائض کے بعد صفحہ ۶۵ سے ۱۰۵ تک مہاراجہ کے سفرنامہ "سیر پنجاب" کا اقتباس دیا گیا ہے۔ صفحہ ۱۱۳ سے ۱۳۶ تک مہاراجہ کے دوسرے سفرنامہ "جام جہاں نما" کا اقتباس دیا گیا ہے۔ مثنوی "خمار شاد" خواجہ حسن نظامی صاحب کے دیباچہ کے ساتھ دی گئی ہے۔ مہاراجہ کے چند منتخب خطوط کے بعد آخری صفحات میں معصوم علی صاحب وارثی کے لڑکے ممتاز علی وارثی نے ان کے مختصر حالات زندگی تحریر کئے ہیں۔ اس طرح یہ مجموعہ متفرقات کا مجموعہ بن گیا ہے۔

○

غیر مطبوعہ خطوط

مقالہ نگار کو مہاراجہ کے کئی غیر مطبوعہ خطوط دستیاب ہوئے ہیں جو مختلف اہل قلم حضرات کے نام لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو بعد میں طبع ہو کر منظر عام پر آ گئے ہیں اور بعض ابھی تک شائع نہیں ہوئے۔ غیر مطبوعہ خطوط جو دستیاب ہوئے ہیں ان کی تعداد ۴۹ ہے[۱] اور مندرجہ ذیل اصحاب کے نام لکھے گئے ہیں:

نام اصحاب	تعداد خطوط
۱۔ نظم طباطبائی	۱
۲۔ جوش	۱
۳۔ عبدالماجد دریابادی	۳
۴۔ نیاز فتح پوری	۴
۵۔ نصیر حسین خاں خیال	۱
۶۔ نواب عماد الملک	۷
۷۔ حکیم لقمان الدولہ	۲۵
۸۔ عبدالجبار خاں آصفی	۳
۹۔ غلام مصطفےٰ رسا	۱
۱۰۔ انوار اللہ خاں	۲
۱۱۔ کاظم علی باغ	۱

مہاراجہ شاد کے نام مشاہیر نے جو خطوط لکھے ہیں ان کی تعداد ۵۶ ہے ذیل میں مشاہیر کے نام اور ان کے خطوں کی تعداد دی جاتی ہے:

۱۔ انوار اللہ خاں فضیلت جنگ	۳
۲۔ آغا شاعر قزلباش	۱

---

[۱] مقالہ نگار کو یہ خطوط حسب ذیل کتب خانوں اور اصحاب سے ملے ہیں:
۱۔ حیدری گشتی کتب خانہ ۲۔ کتب خانہ عرشی ۳۔ شاد لائبریری
۴۔ محمد اشرف صاحب خلف حکیم لقمان الدولہ بہادر ۵۔ احمد خاں صاحب درویش

۳۔ نصیر حسین خاں خیال ۱
۴۔ عبد الجبار خاں آصفی ۱۲
۵۔ شرر ۱
۶۔ عماد الملک ۷
۷۔ جوش ۲
۸۔ عبد الماجد دریابادی ۲
۹۔ عابد مرزا بیگم ۱
۱۰۔ تاجور نجیب آبادی ۲
۱۱۔ تلوک چند محروم ۱
۱۲۔ صادق حسین غبار ۱
۱۳۔ ریاض خیر آبادی ۱
۱۴۔ نیاز فتح پوری ۲۱

○

خطبات و تحریکات

تحریکات یہ مجموعہ ۱۰" × ۶½" سائز کے ۸۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ تحریکات کی جملہ تعداد ۷۲ ہے۔ دارالطبع سرکار عالی میں طبع ہوا۔ ان تحریکات میں مختلف سماجی، سیاسی، اخلاقی اور معاشی مسائل اور ان کے حل کرنے کی تجویزیں ہیں۔ نیز متعلقہ اصحاب کو بطور خاص توجہ دلائی گئی ہے۔ آخر میں مہاتما گاندھی کا ایک انگریزی خط مہاراجہ کے نام ہے۔ جس میں مہاراجہ کے کھادی کی تحریک میں دلچسپی لینے پر مسرت کا اظہار کیا گیا ہے۔

ضمیمہ تحریکات ضمیمہ تحریکات میں جملہ ۱۶ تحریکات ہیں۔ ۱۰" × ۶½" سائز کے ۲۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ دارالطبع سرکار عالی میں طباعت ہوئی۔ ضمیمہ تحریکات میں جو تحریکات پیش کی گئی ہیں۔ وہ زراعت، ریلوے

مدارس، صفائی بلدہ، باغات وغیرہ سے متعلق ہیں۔ مختلف حکام کی درخواستوں پر منظوری دی گئی ہے۔ اور رفاہ عام کے کاموں کی ترقی کے لئے احکام جاری کئے گئے ہیں۔

○

خطبہ صدارت

خطبہ صدارت مہاراجہ کی تین صفحات کی تقریر ہے جو انھوں نے حیدرآباد ریلیف اسوسی ایشن کے سلسلہ میں بمقام ریڈی دوبالہ ہال کی تھی۔ سائز ۱۰ × ۶ ½۔ نظامت طباعت سرکار عالی میں طبع ہوئی۔

مسز واکر اور دیگر خواتین نے حیدرآباد ریلیف اسوسی ایشن کے تحت کارنمایاں انجام دیئے تھے مہاراجہ نے اپنی تقریر میں خواتین کی ان خدمات کی تعریف کی ہے۔ اسی سلسلہ میں وہ آگے لکھتے ہیں:

"عورت ماں کی حیثیت میں مربی، ایک زوجہ کی حیثیت میں مددگار زندگی، ایک شہری کی حیثیت میں ہمدردی، محبت اور خدمت گزاری کی بہتی گنگا ہے۔ اس لئے عورت کی عزت اور اس کی عظمت قدرتاً مردوں پر لازم ہوگئی ہے۔ جس کا ظہور آج اس جلسہ کی بانیان معزز خواتین کی کوششوں سے برملا ہے۔"

آخر میں اس اسوسی ایشن کے لئے ایک ہزار روپیہ چندہ دینے کا ذکر ہے:

○

خطبۂ جامعہ عثمانیہ

مہاراجہ نے یہ خطبہ جامعہ عثمانیہ میں جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر پڑھا تھا۔ ½۷ × ۵ سائز کے ۲۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ سنہ ۱۳۳۷ ف م ۱۹۲۷ء میں دار الطبع جامعہ عثمانیہ سرکار عالی میں طبع ہوا۔

اس خطبہ میں مہاراجہ نے حاضرین جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ جلسہ محض ایک رسم کی ادائی نہیں ہے۔ بلکہ اس تقریب کے موقع پر تمام لوگ ان طلبہ کو دیکھتے ہیں جو اعلیٰ تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔ ان تعلیم یافتہ طلباء ہی پر ملک کی ذہنی، اخلاقی اور معاشی ترقی کا دارومدار ہوتا ہے۔

تعلیم کے مقاصد پورا کرنے والے عوامل دو ہیں۔ فطرت اور تربیت۔ ان کی تشریح مہاراجہ نے اپنے خطبے میں ان الفاظ میں کی ہے:-

"فطرت سے مراد طالب علم کا وہ جوہر قابل ہے جو قدرتی اسباب کی بناء پر اس میں موجود ہے

اس کے ابھارنے یا سنوارنے کا نام تربیت ہے۔ کسی قوم و ملت کی ذہنی اور اخلاقی تربیت اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ ارباب تعلیم طلباء کی قومی خصوصیات و روایات اور انفرادی مذاق و رجحان اور دوسری فطری قابلیتوں کو مدنظر رکھ کر ان کی زبان میں تعلیم نہ دیں۔"

اعلیٰ تعلیم کے حقیقی مقصد کو پورا کرنے کے لئے مہاراجہ نے زرعی اور صنعتی تعلیم السنۂ مغربی سے واقفیت تحقیقات، تصنیف و تالیف، علمی رسالوں کی اشاعت اور لکچرز پر زور دیا ہے۔ آخر میں مہاراجہ نے اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں کے لئے دعا کی ہے۔ جن کی بدولت جامعہ عثمانیہ کی علمی زندگی برقرار ہے۔

سپاس نامہ جات و جوابات و دیگر تقریرات

اس عنوان سے سپاسناموں اور ان کے جوابات کے دو مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ پہلا مجموعہ ۱۰" × ۶½" سائز کے ۱۱۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۳۳۹ ف م ۱۹۳۹ء میں دار الطبع سرکار عالی میں طبع ہوا۔ اس میں جملہ ۲۷ سپاسنامہ جات، جوابات اور دوسری صدارتی تقاریر شامل ہیں۔ پہلا سپاسنامہ موتیل سروس لیگ کی طرف سے ہے۔ جس کے جواب میں مہاراجہ کی تقریر ہے۔ اس تقریر میں انھوں نے مدرسین کے کارنمایاں کی تعریف کرتے ہوئے طلباء کی ہمت افزائی کی ہے۔

آگے کئی سپاسنامے اور ایڈریس ہیں جو مختلف صوبوں کے وکلاء اور اساتذہ وغیرہ کی طرف سے پیش کئے گئے ہیں۔ ان سب کے جوابات جو مہاراجہ نے دئیے ہیں اُن کی تعداد دس ہے۔

سپاس نامہ جات و جوابات و دیگر تقریرات

یہ مجموعہ ۱۰" × ۶½" سائز کے ۲۵ صفحات پر مشتمل ہے سنہ ۱۳۴۰ ف م ۱۹۳۰ء میں دار الطبع سرکار عالی میں طبع ہوا۔ اس میں دو سپاس نامے ہیں اور ان کے جوابات ہیں جو مہاراجہ کی طرف سے دئیے گئے ہیں۔ نیز مسٹر اے بی کاکس کی تقریر کا ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔

مہاراجہ کی تقاریر سے ان کی پبلک خدمات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مقامات کے لوگوں کے معاشی اور سماجی حالات سے انھیں کس قدر دلچسپی ہے۔

اپیچ محبوب گنج مہاراجہ کی یہ اسپیچ ۸½" × ۵½" سائز کے دس صفحات پر مشتمل ہے۔ انھوں نے یہ اسپیچ محبوب گنج کے افتتاح کے موقع پر ۲۵ر شوال سنہ ۱۳۲۲ھ کو ضلع اندور میں دی تھی۔ سنہ طباعت اور مقام طباعت کا پتہ نہیں چلتا۔

ابتدا میں ضلع اندور کی رعایا کے خلوص اور وہاں کے اعلیٰ عہدیداروں کی خدمات کی ستائش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "مجھے آئے ہوئے آج گیارھواں روز ہے۔ عہدیداران سرکاری نے میرے آنے کی تقریب میں جس گرم جوشی کے ساتھ اپنے خلوص کا اظہار کیا ہے۔ میں اس کا بہ دل شکر گزار ہوں۔ مگر مجھے مسرت زیادہ اس بات کی حاصل ہے کہ میں یہاں کی رعایا کو مرفہ الحال اور خوش اور عہدیداروں کو اپنے افسر اعلیٰ یعنی اول تعلقدار مسٹر برزوجی سے راضی پاتا ہوں۔"

مہاراجہ نے ہمستان کی رانی جانکا بائی کی خاص طور سے تعریف کی ہے۔ ان کی فیاضی، رعایا پروری اور ہر دل عزیزی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ اپنے اسٹیٹ کی لائق منتظمہ ہیں۔ نیز اس امر کا بھی انکشاف کیا ہے کہ دوسرے ہمستان بھی ان کی پیروی کریں تو نیک نام رہ سکتے ہیں۔

ضلع اندور کے مختلف محکموں کا یہ تفصیل معائنہ کرکے وہاں کے عہدیداروں کی فرض شناسی اور ان کی خدمات کا ذکر کیا ہے۔ چند باتیں جو اصلاح طلب ہیں ان کا سلسلہ وار ذکر کیا ہے۔ پہلی خرابی جو انھوں نے محسوس کی یہ ہے کہ اکثر عہدیدار تلنگی، مرہٹی اور اردو زبانوں سے نا واقف ہیں۔ دوسرے یہ کہ سرکاری دفاتر میں صفائی کا بطور خاص خیال نہیں رکھا جاتا۔ اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ جن مکانوں میں دفاتر ہیں ان کے نصف حصوں میں

خود عہدیدار بھی رہتے ہیں ۔ مہاراجہ نے یہ تجویز کی کہ جو مکان دفتر کے لئے بنایا جائے اس میں صرف دفتری کام ہی ہونا چاہیئے ۔

سررشتۂ جنگلات کے متعلق رعایا نے مہاراجہ کے سامنے عرضی پیش کی تھی اور محصول کا بار کم کرنے کی درخواست کی تھی ۔ مہاراجہ نے مسٹر ڈنلاپ اور مقتدر جنگ بہادر سے تمام واقعات کی چھان بین کر کے لکڑی کا محصول معاف کر دیا ۔ محبوب گنج کے افتتاحیہ جلسہ میں مسٹر ڈنلاپ اور نواب مقتدر جنگ بھی موجود تھے ۔ مہاراجہ نے ان دونوں عہدیداروں کی مستعدی ، تجربہ کاری اور رعایا پروری کی تعریف کی ہے ۔ مہاراجہ نے اندور کے قیدخانہ کا بھی معائنہ کیا تھا ۔ اس کے جائے وقوع کی صراحت کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ دنیا کی ہر شئے میں تبدیلی اور انقلاب ہے ۔ ان کا کہنا ہے کہ اس حقیقت کا ایک کھلا ثبوت یہ قیدخانہ ہے ۔ اس لئے کہ یہ کسی زمانے میں مندر تھا ۔ اس کے بعد قلعہ ہوا اور آخر میں قیدخانہ بنا ۔ قیدخانہ کی تعمیر کے سلسلے میں مسٹر ہنکن کے کام کی تعریف کی ہے ۔ لیکن ایک نقص یہ بتایا ہے کہ تمام قیدیوں کے ساتھ برہمنوں جیسا سلوک کیا جاتا ہے ۔ یعنی گوشت نہیں دیا جاتا ۔ مہاراجہ کا خیال ہے کہ قیدیوں کو ایک ماہ میں کم از کم دو یا تین بار گوشت ملنا چاہیئے ۔

آخری صفحات میں عدالت دیوانی و فوجداری ، ٹپہ خانہ ، دواخانہ ، مدارس ، ذرائع آب پاشی وغیرہ پر رائے زنی کی ہے ۔ جس کسی شعبہ میں اصلاح کی ضرورت ہے اس کے لئے متعلقہ اصحاب کو توجہ دلائی ہے ۔ محبوب گنج کو بسانے کا سہرا مسٹر برزوجی کے سر تھا ۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے مہاراجہ آخر میں اپنی اسپیچ میں حاضرین سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں :

> "مسٹر برزوجی کی سعی سے یہاں کی رعایا نے اپنے محبوب کے نام سے جو گنج بسایا ہے اس کے افتتاح کے لئے بحکم اعلیٰ حضرت قدر قدرت میں اس وقت یہاں کھڑا ہوں اور حضرت کی جانب سے میں نیابتاً اس گنج کا افتتاح اس پیارے محبوب کے برگزیدہ نام کے ساتھ موسوم کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں ۔ یعنی یہ گنج محبوب گنج کے نام سے آج سے پکارا جائے گا ۔ مسٹر برزوجی کی خوش نصیبی اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ آج کا مبارک دن نصیب ہوا

کہ ان کی تحریک پیشگاہ خداوندی سے منظور ہوئی اور حضرت اقدس
ذ اعلیٰ کے نام نامی کے ساتھ ان کا بسایا ہوا گنج موسوم ہوا۔"

آخر میں اعلیٰ حضرت کی درازی عمر کے لئے دعا کی ہے نیز اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ رانی جانکا بائی نے اعلیٰ حضرت کی چہل سالہ سالگرہ کی یادگار میں جو کلاک ٹاور قائم کرنے کی تحریک پیش کی تھی حیدرآباد جانے کے بعد اعلیٰ حضرت سے عرض کریں گے اور ان کے حکم کی اطلاع دیں گے۔

O

تمہیدات و تقریظات

دیباچہ مثنوی راسخ

مثنوی راسخ مہاراجہ کے حکم سے سنہ ۱۳۲۴ھ م ۱۹۰۶ء میں محبوب پریس حیدرآباد دکن میں طبع ہوئی۔ مہاراجہ نے اس مثنوی پر تقریباً چار صفحات کا دیباچہ لکھا ہے۔ یہ دیباچہ دکن ریویو ص ۱۹ جلد ۳ نمبر ۴ جنوری سنہ ۱۹۰۹ء میں بھی شائع ہوا ہے۔

تمہید دیوان حسن سنجری

دیوان حسن سنجری مہاراجہ کی سرپرستی میں سنہ ۱۳۵۱ھ م ۱۹۳۳ء میں مکتبہ ابراہیمیہ میں طبع ہوا۔ اس دیوان پر مہاراجہ نے تقریباً تین صفحات کی تمہید لکھی ہے۔ تمہید میں انھوں نے اپنی بے تعصبی اور علم دوستی کا ذکر کرتے ہوئے امیر حسن سنجری کی شاعرانہ صلاحیتوں کی تعریف کی ہے۔ ابتدا میں اپنی بے تعصبی اور وسیع المشربی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"بندہ آزاد شادؔ نے آنکھ کھول کر اپنے ولی نعمتوں اور اپنے بزرگوں کی علم نوازی اور معارف پروری کے اکثر روح پرور سماں دیکھے اور بے شمار ہمت افزا استانیں سنی ہیں اور ایسی فضاء میں پرورش پائی ہے جو اہل دل اور ارباب علم وفضل کی عقیدت اور عظمت سے مملو تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ابتدا و سن شعور سے حضرات صوفیہ اور ارباب علم وفضل کا خواہ وہ کسی مذہب یا فرقہ کے ہوں، دل وجان سے شیفتہ اور فریفتہ رہا ہے اور ان کی تعظیم وتکریم اور خدمت وعظمت جس طرح اور جس حد تک ہوسکے اپنے لئے سعادت دارین کا ذریعہ تصور کرتا ہے۔"

دیوان کی ترتیب واشاعت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس کے پہلے جز کا کام خود انھوں نے مکمل کیا اور دوسرے جز کی تکمیل مسعود علی محوی نے کی۔

دیباچہ سفینہ شیخ علی حزیں

شیخ علی حزیں نے مختلف فارسی شعرا کے کلام کا انتخاب "سفینہ شیخ علی حزیں" کے عنوان سے کیا تھا۔ تمہید میں مسعود علی محوی لکھتے ہیں کہ انھوں نے شیخ علی حزیں کے اس سفینہ کا ذکر مہاراجہ سے کیا تو مہاراجہ نے ازراہ علم دوستی منہ مانگی قیمت دے کر اس نسخہ کو خرید لیا اور اپنی جیب خاص سے اس کی دوبارہ طباعت کا انتظام بھی کر دیا۔ شعرا کے کلام کے انتخاب سے پہلے مہاراجہ نے دیباچہ لکھا ہے جو ۷½" × ۵" سائز کے ۵۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ مہاراجہ نے نہایت ہی تفصیل کے ساتھ شیخ علی حزیں کے سلسلۂ نسب، تعلیم و تربیت اور ان کی شاعری وغیرہ کے بارے میں سیر حاصل مواد فراہم کیا ہے۔ ابتدائی صفحات میں شیخ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"شیخ کی تاریخ پیدائش ۲۷ ربیع الآخر ۱۱۰۳ھ م ۱۶۹۲ء ہے۔ ان کے والد کا نام ابوطالب تھا۔ ان کا سلسلۂ نسب اٹھارھویں پشت میں تاج الدین ابراہیم سے جا ملتا ہے .... اس خاندان کے لوگ پیرزادے کہلاتے ہیں اور شاہان صفویہ کے تمام عہد حکومت میں بڑی وقعت اور عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔"

تقریظ دیوان قمر

دیوان قمر پر مہاراجہ نے اردو میں تقریظ لکھی ہے۔ جو ۹" × ۵½" سائز کے تین صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں مہاراجہ نے وضاحت کی ہے کہ ڈاکٹر محمد قمر الدین ہلالی شاہ کی فرمائش پر انھوں نے یہ تقریظ لکھی ہے قمر کی شاعری کی داد دیتے ہوئے مہاراجہ لکھتے ہیں:

"تمہاری بیاض کا ہر ایک مصرعہ روانی میں چلتی ہوئی تلوار ہے اور ہر ایک لفظ چبھتا ہوا نشتر۔ اور ہر ایک حرف افسردہ ختم انگو اور ہر ایک کلمہ بھڑکتا ہوا شعلہ ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس بیاض عاشقاں کو حرز جان بناؤں اور اپنے دل شیدا کو عمر بھر معانی کا تصویر خانہ ٹھہراؤں۔"

تقریظ کے بعد ایک مختصر مدحیہ مثنوی ہے جو درج ذیل ہے :

بیاض عاشقاں سے دل ہے بے تاب
نظر ہے دیکھنے سے اس کے سیماب
ہے شوخی سے ہر اک لفظ اس کا نشتر
رگِ جاں کو تپش پھر ہو نہ کیوں کر
ہلالی شاہ ہیں وہ ماہِ کامل
کہ جن کے نور سے روشن ہے ہر دل
مرے خواجہ کے کہلاتے ہیں پیارے
تو پھر کیوں نہ پیارے ہوں ہمارے
مئے وحدت سے بھر دے ان کا ساغر
الٰہی مست رکھ تا روزِ محشر
کمال ان کا زمانہ میں عیاں ہے
منور ان کے پرتو سے جہاں ہے
کرے کیا شاؔد اب تعریف ان کی
کہ کرتا ہے جہاں توصیف ان کی

○

مہاراجہ کی سرپرستی

دربار شاد کے مشاعرے

مہاراجہ شاد کے جد اعلیٰ مہاراجہ چندو لال شاداںؔ اردو کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ ان کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔ ان کی ڈیوڑھی میں اکثر شعر و سخن کی محفلیں آراستہ ہوتی تھیں۔ جن میں نامور شعرا حصہ لیتے تھے۔ کئی شعرا کو مہاراجہ کی سرپرستی حاصل تھی۔ چندو لال شاداں کی طرح مہاراجہ شاد کی طبیعت بھی ابتدا ہی سے شعر و سخن کی طرف مائل تھی۔ وہ خود شعر کہتے اور دوسروں کو شعر کہنے کی ترغیب دیتے تھے۔ ان کے یہاں بھی مختلف اوقات میں مختلف صحبتوں میں شعر و سخن کی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ جن میں متعدد شعرا حصہ لیا کرتے تھے۔ "ایوان شاد" میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں عموماً مندرجہ ذیل شعرا حصہ لیا کرتے تھے:

۱۔ استاد الملک شوستری
۲۔ راجہ گردھاری پرشاد باقیؔ
۳۔ سیتل پرشاد خورم
۴۔ فضل رب عرشی
۵ عبدالعلی والہ
۶۔ محمد امیر خاں امیر
۷۔ عبدالجبار خاں آصفی
۸۔ طلسمی
۹۔ محمد جعفر زہری
۱۰۔ ترک علی شاہ ترکی
۱۱۔ غلام قادر گرامی
۱۲۔ ضیاء یار جنگ ضیاء
۱۳۔ قاسم علی انجم
۱۴۔ نعیم

۱۵۔ ابوالحسن قادری قیصر
۱۶۔ سراج الدین سائل
۱۷۔ ایرانی
۱۸۔ غلام مصطفےٰ رسا
۱۹۔ استاد ظہیر
۲۰۔ عقیل حقانی
۲۱۔ بشیر
۲۲۔ فصاحت جنگ جلیل
۲۳۔ اختر یار جنگ اختر
۲۴۔ حیدر یار جنگ طباطبائی
۲۵۔ تراب یار جنگ
۲۶۔ عزیز یار جنگ
۲۷۔ اکرم الدین خاں اکرم
۲۸۔ وحید الدین خاں وحید
۲۹۔ جوش
۳۰۔ فانی
۳۱۔ ضامن کنتوری
۳۲۔ ماہر القادری
۳۳۔ آزاد انصاری
۳۴۔ حیرت بدایونی
۳۵۔ پنڈت سورج بھان تھانوی میکش
۳۶۔ محمد یعقوب ناندیڑی
۳۷۔ مرزا فرحت اللہ بیگ
۳۸۔ کاظم علی باغ
۳۹۔ غلام پنجتن

۴۰۔ اجلال
۴۱۔ عابد مرزا بیگم
۴۲۔ مفتوں شیرازی
۴۳۔ طلعت یزدی
۴۴۔ لبیب دہلوی
۴۵۔ مسعود علی محوی
۴۶۔ محمد علی داعی الاسلام
۴۷۔ راجہ نرسنگ راج عالی
۴۸۔ عبدالمجید مجید
۴۹۔ محبوب راج محبوب
۵۰۔ مظفر الدین معلیٰ
۵۱۔ حبیب الدین صغیر
۵۲۔ نواب وزیر یار الدولہ ہادی
۵۳۔ مسعود الزماں جاہ
۵۴۔ حکیم سید محمد عابد
۵۵۔ نواب لطف الدولہ بہادر لطف
۵۶۔ مرزا محمد ہادی مرزا
۵۷۔ سید ہاشمی
۵۸۔ عبدالسلام ذکی
۵۹۔ محمد رحیم خاں فرخ
۶۰۔ عبداللہ خاں کامل
۶۱۔ نجیب الدین خاں نجیب
۶۲۔ نواب سید شاہ علی اسد
۶۳۔ میر مہدی حسین الم
۶۴۔ سید امین الحسن بسمل

۶۵۔ نادر علی برتر
۶۶۔ میر اعجاز علی شہرت
۶۷۔ نواب ہدایت محی الدین
۶۸۔ سید حسن جرت
۶۹۔ آفتاب علی مہر
۷۰۔ عبدالصمد واصفی ع۱

مجلۂ عثمانیہ کے مہاراجہ نمبر میں کسی صاحب نے "ایم۔ اے" کے قلمی نام سے "سر مہاراجہ یمین السلطنت آنجہانی کے مشاعرے" کے عنوان سے مضمون لکھا ہے جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ پیشکاری کی خدمت پر سرفراز ہونے کے بعد ہی سے مہاراجہ کے پاس مشاعروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ابتدا میں عموماً مہینے میں دو بار مشاعرے کی محفلیں ہوا کرتی تھیں جو صبح سے شام تک چلتی رہتی تھیں۔ شعرا کے کھانے وغیرہ کا انتظام مہاراجہ کی طرف سے ہوتا تھا۔ اس مخصوص محفل میں شریک ہونے والے شعرا کے نام یہ ہیں:

۱۔ نواب ضیاء یار جنگ ضیاء
۲۔ ترک علی شاہ ترکی
۳۔ قاسم علی اخگر
۴۔ طلسمی
۵۔ فہیم
۶۔ ایرانی
۷۔ ظہیر
۸۔ غلام مصطفےٰ رسا
۹۔ عقیل حقانی
۱۰۔ فصاحت جنگ جلیل
۱۱۔ اختر یار جنگ اختر

ان مشاعروں میں کسی خاص مصرعۂ طرح کی پابندی نہیں ہوتی تھی ع۲

ع۱ بزم شاد بابتہ ماہ شعبان سنہ ۱۳۴۷ھ و شوال ۱۳۴۹ھ
ع۲ مجلۂ عثمانیہ، مہاراجہ نمبر ص ۷۰ تا ۷۷

مہاراجہ مدارالمہامی کے جلیل القدر عہدے پر فائز ہوئے تو ان کی سرکاری معروفیات میں اضافہ ہوگیا۔ اسی بناء پر گزشتہ مشاعروں کا سلسلہ موقوف ہوگیا۔ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ ہر اتوار کو مہاراجہ کی ڈیوڑھی میں شعرا آجایا کرتے اور اپنا کلام سنا کر مہاراجہ کی داد کے طلب گار رہتے تھے۔ شعروسخن کی یہ محفلیں کچھ عرصہ تک چلتی رہیں۔ اس کے بعد مہاراجہ کے عہدۂ مدارالمہامی سے سبکدوش ہوتے ہی لوگوں کی آمد و رفت بھی کم ہونے لگی۔ شعروسخن کی گرم بازاری ختم ہوگئی۔ لیکن چار پانچ افراد روزآنہ مہاراجہ کے پاس حاضری دے جایا کرتے تھے۔ ان ہی افراد کی وجہ سے شعروشاعری کی محفلوں کا سلسلہ بالکلیہ طور پر منقطع ہونے نہیں پایا۔ چند سال بعد رفتہ رفتہ آنے والے شعرا کی تعداد بڑھتی گئی اور اتنی بڑھی کہ کسی موزوں و مناسب دن اور مقام کا تعین کرنا پڑا۔ سنہ ۱۳۳۷ ف م ۱۹۲۷ء سے جو باقاعدہ مشاعرے شروع ہوئے ان کی بنا اسی طرح پڑی۔ ان مشاعروں میں حسب ذیل شعرا خصوصیت کے ساتھ حصہ لیتے تھے:

۱۔ ضیاء یار جنگ ضیاء
۲۔ نظم طباطبائی
۳۔ اختر یار جنگ
۴۔ تراب یار جنگ
۵۔ عزیز یار جنگ
۶۔ وحید الدین خاں
۷۔ اکرم الدین
۸۔ فانی
۹۔ ضامن کنتوری
۱۰۔ جوش
۱۱۔ مرزا فرحت اللہ بیگ
۱۲۔ ماہر القادری
۱۳۔ آزاد
۱۴۔ باغ
۱۵۔ غلام پنجتن
۱۶۔ عابد مرزا بیگم
۱۷۔ غلام مصطفےٰ ارس
۱۸۔ مفتوں شیرازی
۱۹۔ طلعت یزدی

۲۰۔ لبیب دہلوی
۲۱۔ مسعود علی محوی
۲۲۔ محمد علی
۲۳۔ حافظ محمد عبد المجید
۲۴۔ نرسنگ راج عالی
۲۵۔ حیرت بدایونی

یہ مشاعرے عموماً رات میں ہوتے تھے۔ فارسی اور اردو شعرا باری باری اپنا کلام سناتے دو سال تک ان مشاعروں کا سلسلہ قائم رہنے کے بعد کسی ناخوشگوار واقعہ کی وجہ سے ختم ہو گیا اور پھر ایسا ختم ہوا کہ دوبارہ شروع نہ ہو سکا۔

مہاراجہ کی شعرا پروری اور ادب نوازی کا چرچا عام تھا۔ جب کبھی باہر سے کوئی شاعر آتا تو اس کے اعزاز میں مہاراجہ بڑے اہتمام سے مشاعرہ منعقد کرواتے۔ چنانچہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی اور علامہ اقبال وغیرہ کی آمد کے موقع پر بڑے شاندار مشاعرے منعقد ہوئے تھے۔

مہاراجہ شادؔ کے مشاعروں کے بارے میں علامہ حیرت بدایونی نے مجھے ایک تحریری نوٹ دیا تھا۔ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ وہ تقریباً چودہ پندرہ سال تک مہاراجہ شادؔ کی دیوڑھی کے عقبی سمت کے ایک مکان میں رہا کرتے تھے اس لئے انھوں نے مہاراجہ کے پاس منعقد ہونے والی شعر و شاعری کی تمام محفلیں دیکھی ہیں۔ علامہ حیرت بدایونی لکھتے ہیں:

> "صبح سے دوپہر تک اور چار بجے سہ پہر سے مغرب تک جو باہر نشست رہتی تھی میں بھی پابندی سے موجود رہتا تھا۔ حیدرآباد کے تقریباً تمام ممتاز شعرا دربار میں آتے تھے اور صبح و شام کی صحبتوں میں شعر و شاعری کا چرچا رہتا تھا۔ مگر چند سال تک ماہانہ مشاعروں کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ایک طرح فارسی کی اور ایک اردو کی دی جاتی تھی۔ مشاعرہ شاد منزل کے سامنے والے محل یعنی خاص باغ میں رات کے نو بجے سے شروع ہو کر شب کے ایک دو بجے ختم ہوتا تھا۔ صرف مدعو شعرا و سامعین شرکت کرتے تھے ... ... پہلے فارسی مشاعرہ شروع ہوتا تھا۔ اس کے ختم ہونے پر چائے سے پرتکلف لوازمہ کے ساتھ شرکا کی تواضع کی جاتی تھی۔ اس کے بعد اردو مشاعرہ

ہوتا تھا۔ فارسی کہنے والوں میں آٹھ دس سے زیادہ شعرا نہ ہوتے تھے۔ اردو کہنے والوں کی تعداد بیس پچیس تک پہنچ جاتی تھی۔ مہاراجہ بہادر کی غزل فارسی میں بھی ہوتی تھی اور اردو میں بھی۔ لیکن سب سے آخر میں پڑھی جاتی تھی۔"

علامہ حیرت بدایونی آگے لکھتے ہیں:

"مہاراجہ کی فیاضی سے شعرا بھی متمتع ہوتے تھے۔ حیرت بدایونی، ماہر القادری، جوش ملیح آبادی، ان بیرونی شعرا کے علاوہ مقامی شعرا بھی مہاراجہ کی نوازش سے مستفید ہوتے تھے۔ حضرت داغ دہلوی، اختر مینائی اور جلیل مانک پوری کا حیدرآباد میں عروج درحقیقت مہاراجہ بہادر کی ہی شاعر نوازی کا مرہونِ منت ہے۔"

مہاراجہ کی دیوڑھی میں جو مشاعرے وقتاً فوقتاً منعقد ہوا کرتے تھے ان کی فارسی اور اردو غزلیں "بزم شاد" میں شائع ہوا کرتی تھیں۔ مجھے "بزم شاد" کے تین شمارے دستیاب ہوئے۔ ابوالاشرف مجید آغائی ابوالعلائی مہتمم مشاعرہ "بزم شاد" نے اس سلسلہ کے تیسرے نمبر کے بارے میں لکھا ہے:

"بزم شاد کا یہ تیسرا نمبر اس مشاعرہ خاص کا پہلا نمبر ہے۔ جس کو عالی جناب صدر نشین ادب ہز اکسلنسی مہاراجہ یمین السلطنت سرکشن پرشاد بہادر شاد صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی نے بعنوان "آئینہ خانہ" بتاریخ ۸ رشہریور سنہ ۱۳۴۱ف روز پنجشنبہ ۹ ساعت شب خانہ باغ کے درباری دیوان خانے میں منعقد فرمایا تھا۔"

○

مہاراجہ کے تعلقات مشہور شاعروں اور ادیبوں سے

مہاراجہ چندولال کی طرح مہاراجہ کشن پرشاد بھی علم و ادب کی سرپرستی میں شہرت حاصل کر چکے تھے۔ ہندوستان کے اکثر نامور لکھنے والوں سے مہاراجہ شاد کے گہرے تعلقات تھے۔ شاعروں اور ادیبوں سے مہاراجہ کے تعلقات کی وسعت کا اندازہ اس سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ ان کے پاس شاعروں اور ادیبوں سے خط و کتابت کا ایک علحدہ اور مستقل دفتر تھا۔ اس دفتر میں تمام خطوط باقاعدہ جمع رکھے جاتے تھے۔ اور پھر ان کے جوابی مسودوں کو بھی بطور خاص محفوظ کیا جاتا تھا۔

جن اہل قلم حضرات سے مہاراجہ شادؔ کے تعلقات تھے ان میں خاص اور قابل ذکر امیر مینائی، سرشار، داغ، سید علی بلگرامی، حالی، شبلی، اکبرالہ آبادی، شررؔ، عابد مرزا بیگم، نظم طباطبائی، ریاض، نصیر حسین خاں خیال، اقبال، فانی، جلیل، فرحت اللہ بیگ، سر شیخ عبدالقادر، سید سلیمان ندوی، خواجہ حسن نظامی، کیفی، ظفر علی خاں اور مولوی عبدالحق وغیرہ ہیں۔ ان میں اکثروں کی مہاراجہ سے خط و کتابت تھی۔ مہاراجہ کے فرزند چندا پرشاد نے مہاراجہ کے چند مکتوبات کو "رقعات شاد" کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ جس میں متذکرہ صدر ادیبوں میں سے داغ دہلوی، حالی، سرشارؔ امیر مینائی وغیرہ کے نام مہاراجہ کے خطوط ہیں۔ اکبرالہ آبادی اور اقبال سے مہاراجہ کی مراسلت علحدہ کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہے۔ حضرت خواجہ حسن نظامی کے نام مہاراجہ کے خطوط سنہ ۱۹۶۳ء کے رسالہ "منادی" میں بالاقساط شائع کر دیئے گئے ہیں۔ مجھے شررؔ، عابد مرزا بیگم، نظم طباطبائی، ریاض خیرآبادی، نصیر حسین خاں خیال، نیاز فتح پوری، عبدالماجد دریابادی، عماد الملک، تاجور نجیب آبادی اور جوش وغیرہ سے مہاراجہ کی خط و کتابت کے چند مسودات دستیاب ہوئے ہیں۔ ان تمام خطوط سے پتہ چلتا ہے شاعروں اور ادیبوں سے مہاراجہ کے تعلقات کس قسم کے تھے۔ باہم مخاطب کس طرح ہوتی تھی اور خطوط کے مضامین عام طور پر کیا ہوا کرتے تھے۔

ادیبوں اور شاعروں سے مہاراجہ کے روابط پر روشنی ڈالنے کے لئے خطوط کے علاوہ دوسرے ماخذوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود خطوط کے پورے سرمایہ کی عدم دستیابی

اور دیگر ماخذوں کے تشنہ اور سرسری بیانات کے باعث اکثر اہل قلم حضرات سے مہاراجہ کے روابط کی چگونگی اور ان کے ساتھ مہاراجہ کے سلوک پر خاطر خواہ روشنی نہیں ڈالی جاسکتی ۔ تاہم یہ سرسری جائزہ مہاراجہ کی سیرت و شخصیت، ان کی ادب دوستی، علم پروری اور اردو نوازی کا اندازہ کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوگا ۔

○

امیر مینائی امیر مینائیؒ رامپور میں ۴۲ برس گزارنے کے بعد نظام حیدرآباد کی فرمائش پر سنہ ۱۹۰۰ء میں حیدرآباد آئے ۔ حضور نظام کے یہاں باریابی کے بعد مہاراجہ سے بھی رسم و راہ پیدا ہوئی ۔ "رقعات شاد" میں ان کے نام مہاراجہ کے دو خط ہیں ۔ ایک خط میں مہاراجہ نے ان کی شعری صلاحیتوں کو سراہا ہے ۔ دوسرے خط سے پتہ چلتا ہے کہ مہاراجہ ان سے ملنے اور ان کے درشن کرنے کے لئے بے چین تھا ۔ خط کا اقتباس درج ذیل ہے :

> " آپ کے حیدرآباد آنے کے قبل ہی میری آنکھوں کو انتظار اور کانوں کو اشتیاق تھا کہ آپ کو دیکھوں اور آپ کا کلام سنوں ۔ انشاء اللہ تعالیٰ اب وہ وقت قریب آتا جاتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو شفائے عاجلہ عطا فرمائے " ۱ ؎

امیر مینائیؒ کے انتقال سے مہاراجہ کو بڑا دکھ ہوا ۔ ان کے انتقال کے بعد مہاراجہ نے ایک تعزیتی خط ان کے لڑکے اختر مینائیؒ کو لکھا ۔ جس میں امیر مینائیؒ کی شخصی خوبیوں کی تعریف کی ہے اور ان کی موت کو ناقابل تلافی نقصان قرار دیا ہے ۔ مہاراجہ شاد کے خط کا اقتباس ذیل میں دیا جاتا ہے :

> " آپ کے والد بزرگوار امیر احمد صاحب مینائیؒ جن کو پرسوں تک سلمہ اللہ تعالیٰ لکھا کرتے تھے آج خدا بخشے مرحوم لکھے جاتے ہیں ۔ ان کی بے وقت اور غریب الوطنی کی موت نے ایک عالم کو ناشاد

---

۱ ؎ رقعات شاد ص ۲۲۵

کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس جامعیت کا مقدس، سچے مسلمان اور استاد کا ہمیشہ کے لئے آنکھوں سے اوجھل ہو جانا قیامت کا سامنا ہے۔ مجھے مرحوم کی وفات نے بہت صدمہ پہنچایا۔ افسوس ہے کہ صورت بھی نہیں دیکھنے پائی" ؎۱

امیر مینائی نے سنہ ۱۹۰۰ء میں حیدر آباد میں انتقال کیا۔ ان کے بارے میں محمد عبدالحکیم حکمت لکھتے ہیں:

"حالت مرض میں جناب فصیح الملک اور پنڈت رتن ناتھ سرشار تیمار داری میں مصروف رہے۔ اور مہاراجہ کشن پرشاد شاد کئی بار مزاج پرسی اور عیادت کے لئے تشریف لائے۔ عیادت کے شکریہ میں حضرت نے حالت مرض میں چند رباعیاں تصنیف فرما کر بھیجی تھیں۔ ان رباعیوں میں صرف ایک رباعی مجھے دستیاب ہوئی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ رباعی رباعی ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

ہے آپ کا اخلاق جو ہمدرد مرا
رشک دم عیش ہے دم سرد مرا
فرماتے ہیں ہر روز عیادت میری
درماں مرے حق میں ہو گیا درد مرا" ؎۲

افسوس ہے کہ امیر مینائی کا کوئی خط مہاراجہ کے نام دستیاب نہ ہو سکا۔

سرشار

پنڈت رتن ناتھ سرشار سے مہاراجہ کو بڑی عقیدت اور محبت تھی۔ وہ ان کی ادبیت کا لوہا مانتے تھے۔ چنانچہ مہاراجہ نے اپنے اکثر ناول سرشار کو دکھائے اور ان سے اصلاح لی۔ سرشار کی تصانیف کا مہاراجہ نے اس درجہ مطالعہ کیا تھا کہ ان کی نثر میں سرشار کے طرز کی جھلک آ گئی تھی۔ سرشار کا ذکر مہاراجہ

؎۱ رقعات شاد ص ۲۲۶

؎۲ دبدبۂ امیری ص ۸۲

کی اکثر تصانیف میں ملتا ہے۔ "رقعات شاد" میں سرشار کے نام مہاراجہ کے سولہ خطوط ہیں۔ سرشار سے مہاراجہ کافی بے تکلف تھے۔ ان سے مہاراجہ نے مختلف جگہوں پر مختلف طرح سے خطاب کیا ہے۔ جیسے "سرشار بادہ فصاحت پنڈت رتن ناتھ صاحب" "سرشار ذی وقار پنڈت رتن ناتھ صاحب" "اجی حضرت سرشار" "سرشار بمیار" وغیرہ۔

سرشار کے نام مہاراجہ کے تمام خطوط شعروادب کی باتوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ایک موقع پر مہاراجہ نے اپنی غزل سرشار کو دی تھی کہ ہمیشہ کی طرح کسی مشاعرے میں اس کو پڑھیں۔ سرشار نے مہاراجہ کے مطلب کو ٹھیک طور پر نہ سمجھتے ہوئے یہ جواب دیا کہ انھوں نے کوئی غزل نہیں کہی۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے مہاراجہ لکھتے ہیں:

"آپ کی جادو طرازی اور سحر پردازی کا ہیں کیا تمام ہندوستان قائل ہے۔ مگر مرزا خدا خط تو اچھی طرح پڑھا کرو۔ میں تو لکھتا ہوں کہ فیضی صاحب کا مشاعرہ کل ہی ہے آپ میری غزل لے جاکر حسب معمول پڑھ دیجئے۔ کھلی ہوئی بات ہے۔ آپ اس کے جواب میں لکھتے ہیں کہ سرکار فدوی نے فیضی صاحب کے مشاعرے کے لئے کوئی غزل نہیں کہی ... اس خط کو پھر برائے خدا پڑھیے اور میری غزل فیضی صاحب کے مشاعرے میں پڑھ دیجئے۔" [1]

اس خط میں "حسب معمول" سے معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجہ کی غزلیں سرشار اکثر مشاعروں میں پڑھا کرتے تھے۔ مہاراجہ اور سرشار کے تعلقات کی وسعت کا اندازہ مہاراجہ کے اس خط سے بھی ہوتا ہے جس میں انھوں نے سرشار کی نثر نگاری کو مانتے ہوئے اپنی نثر نگاری کا ذکر تعلی کے انداز میں کیا ہے۔ مہاراجہ لکھتے ہیں:

"مگر ہاں کہئیے تو پرسوں شب کو میں نے جو رقعہ بھیجا تھا۔ اس کی عبارت کیسی تھی۔ آپ کو دعویٰ تھا کہ لکھنؤ کے مقابل میں اور خصوصاً سرشار کے مقابل میں کوئی نثر نگار نہیں لکھ سکے گا۔ مگر اب بھی کچھ مانو گے کہ نہیں کہ ہم حیدر آبادی بھی لکھ لیتے ہیں۔

---

[1] رقعات شاد ص ۱۷۰

سیح کہنا کہ بارش کی کیسی عمدہ سینیری نثر میں کھینچ کے دکھائی تھی" ۱

بعض خطوط میں مہاراجہ نے سیاست کے مختلف پہلوؤں پر بھی بحث کی ہے۔ الفاظ کی تذکیر و تانیث کے اصولوں کا ذکر کیا ہے۔ جا بجا اشعار بھی دیئے ہیں۔ "فسانۂ آزاد" کے مطالعہ سے مہاراجہ کو نثر نگاری کا شوق پیدا ہوا تھا۔ سرشار کے طرز تحریر کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"پنڈت سرشار لکھنوی کا احسان اردو لٹریچر پر کوئی مانے یا نہ مانے مگر میں اپنی کہتا ہوں کہ مجھے جو نثر نگاری کی طرف میلان ہوا اس کا اصل باعث فسانۂ آزاد کی سیر ہے۔ وہ طرز تحریر، وہ آمد وہ بے ساختہ پن، وہ ہر ہر فقرے میں محاوروں، مثلوں، مقولوں کا برسنا، وہ گرما گرمی وہ شوخی میرے دل میں کھپ گئی۔ اگرچہ اس کے بعد جب میری نظر سے حضرت غالب اور حضرت آزاد کی تصنیفات گزریں میں نے انھیں کی طرز کو ترجیح دی اور ساعی ہوں کہ ان کے لٹریچر کے مدرسہ میں کامیابی حاصل کروں" ۲

مہاراجہ نے نہ صرف سرشار سے متاثر ہو کر ان کا رنگ اختیار کیا بلکہ از راہ قدردانی ان پر عنائتوں کا دروازہ کھول دیا تھا۔ مہاراجہ نے انھیں اپنے یہاں ملازم بھی رکھ لیا تھا۔ ایک جگہ اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"۱۳۱۵ھ میں ایک رسالہ دبدبۂ آصفی نام جاری کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ سرشار مرحوم میرے پاس ملازم ہو چکے تھے۔" ۳

اس ملازمت کی وجہ سے بھی مہاراجہ اور سرشار کا رشتۂ مودت استوار تر ہو گیا تھا۔ سرشار کے ناولوں کا مہاراجہ نے بہ نظر غائر مطالعہ کیا تھا جس کے اثر سے مہاراجہ کی نثر پر سرشار کے طرز تحریر کا رنگ چڑھتا گیا۔ اس حقیقت کا اعتراف مہاراجہ نے ان الفاظ

---

۱ رقعات شاد ص ۱۸۶

۲ دیباچہ ارمغان وزارت ص ۴

۳ دیباچہ ارمغان وزارت ص ۵

میں کیا ہے :

"چونکہ پہلے پہل انھیں کے لکھے ہوئے ناول کا میں نے اکثر مطالعہ کیا اور وہی شب و روز ہمدم رہا کرتے تھے۔ لہذا اکثر میری گزشتہ نثر میں ان کی زبان اور خیالات کا رنگ نظر آتا ہے۔" ع۱

سید محمد فاروق سرشار اور مہاراجہ کے تعلقات کے بارے میں لکھتے ہیں :

"۱۸۹۵ء میں جب میں حیدر آباد گیا تو حضرت سرشار وہاں پہلے سے موجود تھے ... ہز اکسلنسی مہاراجہ کشن پرشاد اس زمانے میں وزیر افواج نظام تھے۔ ان کے دولت کدہ پر حضرت سرشار رہتے تھے۔ مہاراجہ بہادر ان پر بہت عنایت کرتے تھے۔ آخر دم تک سرشار پھر ان سے جدا نہ ہوئے۔

حضور نظام مرحوم کی سالگرہ کی یادگار میں دبدبۂ آصفی اور محبوب الکلام نثر اور نظم کے پرچے مہاراجہ بہادر کی سرپرستی میں حضرت سرشار کے اہتمام سے شائع ہوتے تھے۔ بالخصوص دبدبۂ آصفی ان کے مضامین سے لبریز رہتا تھا۔" ع۲

سید محمد فاروق کی اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ سرشار ۱۸۹۵ء سے پہلے حیدر آباد آچکے تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۰۲ء میں حیدر آباد ہی میں ہوا۔

داغ دہلوی

رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں کہ داغ ۱۸۸۸ء میں حیدر آباد آئے اور تقریباً ۱۸ برس انھوں نے حیدر آباد میں قیام کیا۔ یہاں کے تمام امراء و روساء نے ان کی قدردانی کی۔ ع۳

داغ دہلوی سے مہاراجہ کے تعلقات محتاج بیان نہیں۔ اعلیٰ حضرت کے دربار میں داغ

ع۱ دیباچہ ارمغان وزارت ص ۵

ع۲ "العصر" ص ۸۴، ۸۵ (جلد ۱ نمبر ۲۔ اپریل ۱۹۱۳ء)

ع۳ تاریخ ادب اردو ص ۳۶۷، ۳۶۸

کی باریابی کے بعد ہی مہاراجہ کے تعلقات بھی ان سے بڑھتے گئے اور آخر دم تک داغ مہاراجہ کی عنایتوں سے سرفراز ہوتے رہے۔ اعلیٰ حضرت نے داغ کی قادر الکلامی کو دیکھ کر انھیں اپنا استاد مقرر کر لیا تھا اور ساتھ ہی مہاراجہ کو بھی داغ کا شاگرد بنا دیا تھا۔ علامہ حیرت بدایونی اس بارے میں لکھتے ہیں:

"دربار شاہی میں فصیح الملک نواب مرزا خاں داغ دہلوی مرحوم کی جب باریابی ہوئی تو حضور مرحوم خود بھی داغ کے شاگرد ہوئے اور اپنے وزیر اعظم مہاراجہ کشن پرشاد کو بھی داغ کا شاگرد کرایا۔" ع ۱

داغ کی شاگردی قبول کرنے کے بعد مہاراجہ سے داغ کے تعلقات بڑھتے گئے۔ خط و کتابت کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ مہاراجہ کے خطوط جو داغ کے نام ہیں ان میں علمی مباحث کثرت سے ملتے ہیں "رقعات شاد" میں داغ کے نام مہاراجہ کے چھ خطوط ہیں۔ ایک خط میں جو داغ کے خط کا جواب ہے مہاراجہ نے اپنی غلطی کو صاف الفاظ میں تسلیم کیا ہے۔ مہاراجہ لکھتے ہیں:

"آپ نے جتلانا، بتلانا، دکھلانا، ان قافیوں کو جو کلام داغ میں متروک ہیں اعتراض فرمایا تھا۔ میں تسلیم کرتا ہوں۔ چونکہ ذوق اور غالب کے کلام میں یہ جائز ہیں اور آپ حضرت ذوق خاقانی ہند کے شاگرد ہیں اس خیال سے میں نے یہ قافیہ باندھا۔ آئندہ سے مزید خیال رکھوں گا۔" ع ۲

دوسرے خط میں اپنے استاد سے مہاراجہ شاد اس طرح مخاطب ہیں:

"حسب فرمائش ایک دوست کے حضرت ذوق کے تتبع میں چند شعر لکھے ہیں۔ چنانچہ آپ کے دیکھنے کے لئے بھیجتا ہوں۔

اس غزل کے دیکھنے کے بعد اس زمین میں قدم رکھنا گویا منہ

ع ۱ نورس غزل نمبر ص ۱۰۳

ع ۲ رقعات شاد ص ۴۶

چڑانا ہے۔ مگر استادوں ہی کے کلام دیکھنے اور سیکھنے سے مبتدی بھی بجائے خود استاد بن جاتا ہے۔ یقین ہے کہ جناب کا مزاج خیریت سے ہوگا۔ خدائے تعالیٰ جل شانہ' ہمیشہ خیریت سے رکھے۔" ع۱

مہاراجہ کو داغ سے بے حد خلوص تھا۔ وہ ان کا ادب کرتے تھے۔ چنانچہ تمام خطوط میں وہ اپنے استاد سے اس طرح مخاطب ہیں۔

"جناب من نواب فصیح الملک بہادر حضرت داغ دہلوی سلمہ اللہ تعالیٰ"

مہاراجہ کے ناول "چنچل نار" پر داغ نے تاریخی قطعہ لکھا ہے۔ جس میں انھوں نے مہاراجہ کی ادبی صلاحیتوں کی داد دی ہے ع۲

رسالہ دبدبۂ آصفی میں مہاراجہ کے سات قطعات بہ عنوان "قطعات تاریخ رحلت فصیح الملک داغ" ہیں۔ ان میں پانچ اردو اور دو فارسی ہیں۔ تمام قطعات مہاراجہ شاد کے سچے جذبات عقیدت کی ترجمانی کرتے ہیں اور ان کے گہرے رنج و غم کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ داغ کی موت مہاراجہ کے لئے دلی صدمہ کا باعث ہوئی۔ ذیل کے قطعہ سے مہاراجہ کے تاثرات پر روشنی پڑتی ہے:

باکمالوں میں جو باقی رہ گئے تھے ایک داغ
ان کو بھی چھوڑا نہ تو وائے چرخ عنبری

داغ کے مرنے سے باغ شاعری مرجھا گیا
اب انھیں کے دم سے شاخ نظم اردو تھی ہری

خوش مزاق و خوش بیاں رنگین مزاج و خوش طبع
شاعری وہ کی کہ عالم میں ہوی نام آوری

روزمرہ اس مزے کا لوٹ جائے جس پہ دل
ہر سخن میں دلبری ہر بات میں جادوگری

شعر جو نکلا زباں سے ہوگیا مقبول عام
سچ تو یہ ہے کر گئے ملک سخن میں سروری

بلبل ہندوستاں تھے اور استاد جہاں
ان کے رتبے سے ہوئی شعر و سخن کو برتری

شاد نے موزوں کیا یہ مصرعہ سال وفات
چھپ گیا آنکھوں سے اب وہ آفتاب شاعری ع۳

ع۱ رقعات شاد ص ۴۸

ع۲ چنچل نار ص ۲۰۸۱

ع۳ دبدبۂ آصفی ص ۳۴ نمبر ۹ جلد ۱۰ سنہ ۱۳۲۲ھ

داغ نے سنہ ۱۹۰۵ء میں حیدرآباد میں انتقال کیا۔ احاطہ درگاہ حضرت یوسف صاحب وشریف صاحب میں امیر مینائی کے بازو دفن کئے گئے۔

سید علی بلگرامی

سید علی بلگرامی نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کے چھوٹے بھائی تھے۔ ۱۸۷۶ء میں نواب سالار جنگ بہادر اول نے انھیں رڑکی کالج سے بلا کر اپنے پرسنل اسٹاف میں شامل کر لیا۔ وہ حیدرآباد میں مختلف اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۰۱ء میں حیدرآباد سے پنشن لے کر انگلستان چلے گئے۔ ان کا انتقال ۱۹۱۱ء میں ہوا۔ انھوں نے دربار شاد میں کئی بار شرکت کرنے کی عزت حاصل کی تھی۔ ان دونوں کی باہمی خط وکتابت بھی ہوتی تھی۔ ایک خط میں مہاراجہ لکھتے ہیں:

"آپ کے اعتراض کے قربان، اگر اعتراض صحیح ہوتا تو میں شکریہ کے ساتھ تسلیم کر لیتا اور یہ سمجھتا کہ خطا و نسیاں ترکیب انسانی ہے اور بے عیب ذات خدا۔" [1]

سید علی بلگرامی کا کوئی خط مہاراجہ کے نام دستیاب نہ ہو سکا

حالی

حالی علی گڑھ کالج کے ڈیپوٹیشن کے ساتھ ۱۸۸۷ء کے بعد حیدرآباد آئے تھے غالباً ان کی مہاراجہ سے پہلی ملاقات اسی وقت ہوئی تھی۔ حالی دوبارہ ۱۹۰۵ء میں نواب میر محبوب علی خاں کی حویلی میں سرکاری مہمان کی حیثیت سے شرکت کے لئے حیدرآباد آئے۔

"رقعات شاد" میں حالی کے نام مہاراجہ کا ایک خط ہے جو غالباً پہلا خط ہے۔ یہ خط کافی طویل ہے۔ لیکن پہلا خط ہی مہاراجہ نے جس خلوص اور بے تکلفی سے لکھا ہے اس سے ان کی ادب دوستی اور ارباب ادب کی قدر افزائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ خط کا اقتباس درج ذیل ہے:

"خال رخسار فضل وکمال خواجہ الطاف حسین صاحب حالی! بظاہر ہے

---

[1] مجلۂ عثمانیہ مہاراجہ نمبر ص ۱۶۰

کہ آپ سے مجھ کو تعارف نہیں۔ میں اور آپ روشناس نہیں۔ اس بے تعارفی میں بے تکلفی بینی چہ۔ مگر میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ کان دھر کر سنیئے۔ میں نے آپ کی تصنیفات سے دو کتابیں دیکھیں۔ ایک حیات سعدی (بارک اللہ) دوسری یادگار غالب (سبحان اللہ) مجھ میں نہ اس قدر استعداد ہے نہ قابلیت کہ آپ کی تعریف کروں۔ مگر یہ ضرور کہوں گا کہ یہ دونوں کتابیں انمول ہیں اور آپ کا دم نعمتات میں سے ہے۔ خدا چشم زخم حوادث سے بچائے۔ میں نہ عالم نہ فاضل۔ نہ ادیب اور نہ شاعروں میں میرا شمار ہے۔ ایک بندۂ خدا ہوں۔" ؎۱

مہاراجہ شاد مرزا غالب کے کلام سے بحد متاثر تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس پہلے خط میں غالب سے اپنی شیفتگی کا اظہار کرتے ہوئے غالب کی تصانیف دیکھنے اور پڑھنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"بات یہ ہے کہ جس قدر مرحوم کی تصانیف مطبوعہ کے نام آپ نے یادگار غالب میں لکھے ہیں وہ سب معہ اپنے کل تصانیف کے بذریعہ دی پی روانہ کیجئے اور جس قدر مکتوب وغیرہ مرحوم کے، جیسا کہ آپ نے یادگار غالب میں ذکر کیا ہے طبع ہوتے جائیں وقتاً فوقتاً بھیج دیا کیجئے۔ کیا کوئی کتاب خانہ ایسا ہے جہاں سے وقتاً فوقتاً آپ کے ذریعہ سے بغرض مطالعہ یا خریداری طلب کر سکتا ہوں ضرور لکھئے۔ میری ٹوٹی پھوٹی اردو پر اعتراض نہ کیجئے گا۔" ؎۲

حالی سے مہاراجہ کے تعلقات کی وسعت کا اندازہ مہاراجہ کی تصنیف "سیر پنجاب" سے بھی ہوتا ہے۔ "سیر پنجاب" میں حالی سے ملاقات کا ذکر مہاراجہ نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"آج صبح کو مولوی الطاف حسین صاحب حالی آئے ان کا دم غنیمت ہے۔ گو پیری نے اپنا عمل دخل کر لیا ہے مگر دل جوان اور عقل آزمودہ کار

؎۱ رقعات شاد ص ۱۷۶

؎۲ رقعات شاد ص ۱۷۷

ہے۔ ان کی ہر بات دل سے نکلتی ہے اور دل میں ایسی اترتی ہے جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔ خدا زندہ رکھے۔ لطف صحبت سے میں نہایت محظوظ اور مستفید ہوا۔ بہت دیر تک باتیں رہیں۔" ع۱

مہاراجہ کے نام حالی کے خطوط غالباً تلف ہو چکے ہیں ان کا ایک خط بھی مجھے نہ مل سکا۔ تاہم حالی کے خطوط کے جو جوابات مہاراجہ نے دیئے ہیں ان کے پڑھنے سے ان دونوں کے تعلقات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مہاراجہ شاد خواجہ حسن نظامی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"وزارت کے زمانہ میں فقیر شاد نے "شاد بیتی" لکھنا شروع کیا تھا۔ چنانچہ بہت سا حصہ اس کا مرحوم حالی صاحب کو دکھایا تھا۔ چنانچہ ان کے دستخطی اوراق اب تک محفوظ ہیں" ع۲

اس خط سے اس امر کا بھی پتہ چلتا ہے کہ مہاراجہ نے اپنی بعض تحریریں حالی کو بھی بنظر اصلاح دکھائی تھیں۔

شبلی

شبلی کے حیدرآباد آنے کے تعلق سے رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

"مولانا کا سفر حیدرآباد نواب وقار الامراء کی وزارت کے زمانہ میں ہوا۔ سب سے پہلے وہ مولوی سید علی بلگرامی کی کوشش سے ناظم محکمہ تعلیم بمشاہرہ دو سو روپیہ ماہوار مقرر ہوئے۔ جو بعد کو تین سو روپیہ ہو گیا تھا۔ مولانا یہاں چار برس رہے اس زمانہ میں انھوں نے محکمہ تعلیم میں بہت کچھ ترقیاں کیں" ع۳

حامد حسن قادری لکھتے ہیں کہ شبلی نے ۸ر اگست سنہ ۱۸۹۴ء سے "الفاروق" لکھنا شروع کیا اور ۱۵ر جولائی ۱۸۹۸ء کو ختم کیا۔ الفاروق علی گڑھ کی ملازمت کے زمانے میں شروع ہوئی تھی اور حیدرآباد کی ملازمت کے زمانہ میں ختم ہوئی ع۴ حامد حسن قادری

ع۱ سیر پنجاب ص ۱۴۲

ع۲ منادی ص ۲۳ - اکتوبر ۱۹۶۱ء

ع۳ تاریخ ادب اردو ص ۶۷، ۶۸

ع۴ داستان تاریخ اردو ص ۱۲۷، ۱۳۷

کی اس صراحت سے پتہ چلتا ہے کہ شبلی ۱۸۹۴ء اور ۱۸۹۸ء کے درمیان حیدرآباد آئے۔
اور چار سال تک مقیم رہے۔

مہاراجہ سے شبلی کے اچھے تعلقات تھے۔ باہم مراسلت بھی یقیناً رہی ہوگی لیکن ان دونوں کی خط وکتابت اس وقت موجود نہیں ہے۔ "رقعات شاد" میں بھی مہاراجہ کا کوئی خط ان کے نام نہیں ہے۔ لیکن مجلۂ عثمانیہ "مہاراجہ نمبر" میں مہاراجہ کا ایک خطبہ نقل کیا گیا ہے۔ اس خطبہ میں مہاراجہ نے شبلی کا ذکر کرتے ہوئے ان سے واقفیت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

> "مولوی عزیز مرزا صاحب نے دارالعلوم کی ترقی کے سلسلہ میں ایک یونیورسٹی کے قیام کی اسکیم بڑی محنت سے تیار کی تھی اور میں نے عبدالحلیم شرر اور مولوی شبلی نعمانی کو (جن سے میں بخوبی واقف ہوں) اس کام کے لئے طلب بھی کیا تھا"[1]

شبلی نے سنہ ۱۹۱۴ء میں انتقال کیا۔

اکبر الہ آبادی

اکبر الہ آبادی سے بھی مہاراجہ کے مخلصانہ تعلقات تھے۔ اکبر کی مزاحیہ شاعری مہاراجہ کو بے حد پسند تھی۔ چنانچہ مہاراجہ نے بھی اپنے بعض خطوط میں، جو اکبر کے نام ہیں، وہی مزاحیہ طرز تحریر اختیار کیا ہے۔

اکبر الہ آبادی سے مہاراجہ کے مراسم کا اندازہ کرنے کے لئے ان دونوں کے خطوط کا مطالعہ کافی ہے۔ حضرت خواجہ حسن نظامی نے اکبر الہ آبادی کے ۲۵ خطوط مہاراجہ کے نام اور مہاراجہ کے ۹ خطوط اکبر الہ آبادی کے نام جمع کر کے سنہ ۱۹۵۱ء میں شائع کئے ہیں۔ خواجہ صاحب کا کہنا ہے کہ مہاراجہ کے تمام خطوط نہیں مل سکے۔ صرف ۱۹۱۸ء کے خطوط ملے۔ حالانکہ مہاراجہ شاد اور اکبر الہ آبادی کی باہمی خط وکتابت ۱۹۱۴ء سے تھی۔ اکبر الہ آبادی سے مہاراجہ کے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے خواجہ صاحب لکھتے ہیں:

> "مہاراجہ بہادر کو میرے تعلقات کے سبب اکبر سے بہت عقیدت تھی

۱۔ مجلہ عثمانیہ "مہاراجہ نمبر" ص ۱۵۷

اور وہ ان سے ملنے کے لئے حیدر آباد سے الہ آباد گئے تھے۔ کیونکہ
میں نے مہاراجہ کو بعض ایسے اذکار اور اشغال کی تعلیم دی تھی جو مجھے
حضرت اکبر سے حاصل ہوئے تھے" ؎۱

حضرت خواجہ حسن نظامی نے ایک بار مہاراجہ سے دریافت کیا تھا کہ آپ نے حضرت اکبر کو کیسا پایا۔ اس کا جواب مہاراجہ نے ان الفاظ میں دیا تھا:

"میں نے ہر ملک کے بڑے بڑے شاعروں کو دیکھا اور کلام سنا۔ مگر
جو اثر حضرت اکبر کی ذات اور شخصیت اور ان کا کلام خود ان کی زبان
سے سن کر میرے دل پر ہوا وہ غیر معمولی ہے۔ وہ جج اور شاعر ہی نہیں
بلکہ ایک مرد باخدا ہیں" ؎۲

اکبر الہ آبادی سے مہاراجہ کے تعلقات کا اندازہ مہاراجہ کے سفر ناموں سے بھی ہوتا ہے پنجاب کی سیر کے سلسلہ میں مہاراجہ اکبر الہ آبادی سے ملنے ان کے گھر گئے تھے۔ اس دن کے روزنامچہ میں لکھتے ہیں:

"رامچندر پرشاد کو لے کر اکبر حسین صاحب کے مکان پر جاکر ان سے ملاقات
کی۔ نہایت زندہ دل، آشنا پرست، عارف باللہ اور ہر فن مولیٰ ہیں۔
بہت دیر تک لطف صحبت رہا۔ کلام ان کا درد سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔
مضامین بلند، بندش چست، صاحب دیوان ہیں۔" ؎۳

مہاراجہ اور اکبر الہ آبادی کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ یہ آپس میں اس قدر بے تکلف تھے کہ خطوط میں زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرتے، ایک دوسرے کو ہدایتیں دیتے اور ایک دوسرے سے مشورہ لیتے تھے۔ مہاراجہ شاد اکبر الہ آبادی کو بہ حیثیت ایک بلند پایہ شاعر اور صوفی کے مانتے تھے۔ ان کی قدر اور عزت کرتے تھے۔ ۱۰ مارچ ۱۹۱۵ء کو ایک خط اکبر الہ آبادی نے مہاراجہ کے نام لکھا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مہاراجہ کی عنایت اور مہربانی

؎۱ اکبر الہ آبادی اور مہاراجہ کشن پرشاد کی خط و کتابت ص ۵

؎۲ اکبر الہ آبادی اور مہاراجہ کشن پرشاد کی خط و کتابت ص ۱۰

؎۳ سیر پنجاب ص ۱۴۹

کا اکبر کو کتنا احساس تھا۔ خط کا اقتباس درج ذیل ہے :

"یہ نیاز نامہ اس غرض سے لکھا کہ زیادہ غیر حاضری احسان فراموشی نہ سمجھی جائے۔ درحقیقت آپ کا کرم و احسان ہے کہ آپ مجھ تنگ دل اور بے ہنر کی قدر دانی فرماتے ہیں" ؎۱

مہاراجہ اکبر الہ آبادی سے ملنے بے چین تھے اور انھیں بار بار حیدر آباد آنے کی دعوت دیا کرتے تھے۔ ایک خط کے آخر میں لکھتے ہیں :

"میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں اور آج مکرّر لکھتا ہوں کہ آپ ضرور حیدر آباد آنے کا ارادہ فرمائیے۔ آج کل موسم بھی بُرا نہیں ہے۔ اگر ارادہ ہو تو مطلع کیجئے کہ میں اپنے مصاحبین یا عہدیداروں میں سے کسی کو بھیج دوں تاکہ آپ کو بہ آرام حیدر آباد لائے" ؎۲

مہاراجہ کے اکثر خطوط جو اکبر الہ آبادی کے نام ہیں ان میں علمی و ادبی مباحث بھی ملتے ہیں یہ دونوں حضرات اپنی غزلیں ایک دوسرے کو دکھایا کرتے اور داد لیا کرتے تھے۔ اپنی غزلوں کے بارے میں شادؔ لکھتے ہیں :

"آپ جس شعر یا جس غزل کی داد دیتے ہیں شادؔ اس کو اپنی محنت و جانفشانی کا ثمرہ اور ان الفاظ کو اپنے لئے سند یا سرٹیفکیٹ تصور کرتا ہے" ؎۳

مہاراجہ کی نظروں میں اکبر الہ آبادی کی کافی وقعت تھی۔ وہ ان کی شخصیت کی بڑائی اور بزرگی کو جانتے اور تسلیم کرتے تھے۔ مندرجہ بالا خط ہی میں لکھتے ہیں :

"خط لکھتے لکھتے جو دو تین رباعیاں بے ساختہ خیال میں آئیں وہ زبانِ قلم سے ادا کرتا ہوں ؎

ہے ہند میں شاعروں کا افسر اکبر
بندہ بھی ہے اور بندہ پرور اکبر
صوفی بھی حکیم بھی ہے عارف بھی ہے شادؔ
ہے قیصر جرمنی کا قیصر اکبر

؎۱، ؎۲، ؎۳ اکبر الہ آبادی اور مہاراجہ کشن پرشاد کی خط و کتابت صفحات ۲۵، ۵۸، ۶۱

اکبر کو کوئی شاد نہ اصغر سمجھے
سمجھے تو قسم خدا کی اکبر سمجھے
رتبہ اکبر کا کوئی کیا سمجھے شاد
سمجھے اسے کنگ یا کہ قیصر سمجھے

—

اکبر جو ہے شاد وہ ہر فن مولیٰ
اکبر سا کوئی اور نہ دیکھا نہ سنا
صوفی بھی ہے عارف بھی محقق بھی ہے
شاعر بھی زمانے میں ہے بے شک یکتا "

—

اکبر الہ آبادی اور مہاراجہ شاد دونوں ایک دوسرے کے مذہبی رجحانات سے بھی خوب واقف تھے۔ مہاراجہ نے اپنے مسلک کے تعلق سے کوئی بات اکبر سے چھپا نہیں رکھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اکثر خطوط جو اکبر کے نام ہیں ان میں انھوں نے اپنے مشرب اور مسلک کی صاف اور واضح الفاظ میں تشریح کر دی ہے۔

شرر شرر نے ۱۸۹۱ء میں رسالہ " دلگداز " اور اخبار " مہذب " دونوں کو بند کر کے حیدر آباد کا سفر کیا اور یہاں دو سو روپیہ ماہوار پر ملازم ہو گئے۔ ۱۸۹۵ء میں نواب وقار الامراء کے صاحبزادہ کے ساتھ انگلستان گئے اور ۱۸۹۶ء میں لوٹے۔ ۱۹۰۰ء میں لکھنؤ چلے گئے۔ ۱۹۰۲ء میں پھر حیدر آباد آئے اور ۱۹۰۴ء میں پھر لکھنؤ واپس ہو گئے۔ شرر نے ۱۹۲۶ء میں انتقال کیا۔

شرر کو ایک شاعر اور ادیب کی حیثیت سے مہاراجہ جانتے تھے۔ شرر کا ایک خط مجھے دستیاب ہوا ہے۔ اس خط کا وہ حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مہاراجہ سے اہل قلم امداد و اعانت کی کیسی توقعات رکھتے تھے:

" دلگداز کو میں نے وی۔ پی نہیں روانہ کیا۔ اور در اصل وہی عام قیمت جو سارے ملک سے لی جاتی ہے۔ اس کو جناب سے

بھی لینا میں شان کے خلاف تصور کرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں
کہ دلگداز کو کچھ سالانہ تنخواہ مقرر ہو جائے اور امید ہے کہ
سرکار اس درخواست کو قبول فرمائیں گے۔" ؏۱

شرر کے اس خط سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے حیدر آباد آنے سے پہلے ہی مہاراجہ سے خط و کتابت کے ذریعہ رسم و راہ پیدا ہو گئی تھی۔ اس خط کا جواب جو مہاراجہ نے دیا وہ نہیں مل سکا۔ لیکن یقیناً مہاراجہ نے سالانہ رقم مقرر کر دی ہوگی۔ اس لئے کہ وہ بہت کم کسی کی درخواست کو رد کرتے تھے۔ پھر شرر جیسی بلند پایہ شخصیت کی اس معمولی درخواست کو مہاراجہ کیوں کر ٹال سکتے تھے۔ بہر حال قیاس کیا جاتا ہے کہ شرر آخر تک مہاراجہ کی عنائتوں سے سرفراز ہوتے رہے ہوں گے۔ مہاراجہ نے شرر سے کسی وقت عطر خریدنے کا ذکر کیا تھا۔ عید کے قریب مہاراجہ کے اس وعدہ کو یاد دلاتے ہوئے شرر لکھتے ہیں :

"میں بکمال ادب یاد دہانی کرتا ہوں کہ عیدالفطر کا زمانہ قریب آگیا ہے جب کہ سرکار میں عطر کی خریداری لازمی طور پر ہوگی۔ اس موقع پر بھی کارخانۂ مذکور کو یاد کیا جائے تو کمال پرورش ہوگی۔ میں امید کرتا ہوں کہ اس عنایت سے محروم نہ رکھا جاؤں گا" ؏۲

جس طرح مہاراجہ شرر سے ملنے کے مشتاق تھے ویسے ہی شرر بھی مہاراجہ سے ملنے کے لئے بے چین نظر آتے ہیں۔ خط کے آخری فقرے ملاحظہ ہوں :

"سرکار نے لکھنؤ میں آنے کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا اور اس وقت جو شوق قدم بوسی خاکسار کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ اس وقت تک باقی ہے۔ معلوم نہیں سرکار کا کب تک آنے کا ارادہ ہے؟ اس سے بھی ضرور اطلاع دی جائے" ؏۳

شرر نے ایک دعائیہ شعر میں مہاراجہ کا ذکر اس طرح کیا ہے ؎

یا الٰہی شاد اور آصف کو رکھ دن رات شاد ۔۔۔ خوش رعایا ہیں ہمیشہ ان کے فیض عام سے ؏۴

؏۱ تا ؏۳ خط مخزونہ حیدری گشتی کتب خانہ حیدر آباد دکن ؏۴ گلدستہ جشن آصفیہ ص ۴۷

عابد مرزا بیگم

عابد مرزا بیگم کے حیدرآباد آنے کے تعلق سے تمکین کاظمی مولف "تذکرہ ریختی" لکھتے ہیں :

"کلکتہ سے بھوپال کا چکر کاٹ کر حیدرآباد دکن آئے، نواب محبوب یار جنگ کے توسط سے دربار حضور نظام میں باریاب ہوئے۔ حضور نے ریختی سنی۔ بہت پسند فرمایا۔ دو ہزار کا بھاری نلواں ڈوپٹہ مرحمت فرمایا۔ مگر حضرت فصیح الملک داغ نے بڑھنے نہ دیا۔ ...
... ہز اکسلنسی مہاراجہ سر کشن پرشاد، نواب سالار جنگ بہادر وغیرہ خبر لیتے تھے"۔ ؏۱

مہاراجہ شاد بیگم کے بڑے قدرداں تھے۔ انھیں حیدرآباد آئے ۱۹ سال گزر چکے تھے۔ تنگ دستی و مفلسی میں بھی خودداری نے انھیں کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے سے مانع رکھا۔ لیکن جب پریشانی حد سے گزر گئی تو مہاراجہ سے تذکرہ کر ہی دیا۔ دفتر پیشی کے خطوط کی جو فائلیں دستیاب ہوئی ہیں ان میں مہاراجہ کے منتظم سید صادق حسین غبار کا ایک معروضہ مہاراجہ کے نام ہے۔ جس میں انھوں نے بیگم کو مہاراجہ کے مصاحبوں میں شریک کر لینے کی درخواست کی ہے۔ نیز بیگم نے اپنے بارے میں غبار صاحب سے جو کچھ عرض کیا تھا اسے ان ہی الفاظ میں لکھ کر مہاراجہ کے پاس پیش کیا۔ بیگم کے الفاظ یہ ہیں :

"بیگم کی سکونت حیدرآباد کی عمر ۱۹ برس کی ہے مگر افکارات و پریشانی سے اسی عمر میں بڑھیا ہوگئی۔ اب اس بڑھاپے کا بھی خاتمہ ہے۔ بیگم نے آج تک کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ اگرچہ امراء و رؤساء بہت نظر آئے۔ جس کی تھی اس کے نام پر ۱۹ برس سے بیٹھی ہے۔ سرکار، سر مہاراجہ بہادر، بیگم کے پرانے قدرداں ہیں اور آج تک اس کا جو سہاگ باقی رہا صرف سرکار ہی کی قدردانی سے باقی رہا اب بیگم کو راج کنور طال عمرہ کا صدقہ نان نفقہ ملنا چاہیے۔ فاقہ کشی کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے"۔ ؏۲

؏۱ تذکرہ ریختی ص ۱۴۲ ؏۲ خط مخزونہ حیدری گشتی کتب خانہ حیدرآباد دکن

اس کے ساتھ بیگم نے ایک درخواست بھی مہاراجہ کی خدمت میں لکھ کر پیش کی تھی۔ اس درخواست میں انھوں نے اپنی مالی پریشانیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے مہاراجہ سے مدد مانگی ہے۔ مہاراجہ نے ان کی درخواست پر ۳۰ روپیہ ماہوار پوان کا تقرر کر لیا۔

مہاراجہ کی اکثر تصانیف کے آخر میں بیگم کے تاریخی قطعات ملتے ہیں۔ مثنوی جلوۂ کرشن کی تاریخ درج ذیل ہے:

شاد کی خدمت میں یہ تاریخ بیگم نذر دو
مثنوی ان کی نویلی ہے چھبیلی موہنی
۱۳ ۵ ۴۷

بیگم کے دو شعر درج ذیل ہیں جن میں انھوں نے مہاراجہ کی سرپرستی کا ذکر کیا ہے۔

انھیں کے دم سے ہے قائم سہاگ بیگم کا
الٰہی شاد سلامت رہے یوں ہی برسوں[1]

جانتے ہیں سب یمین السلطنت کی ہے کنیز
کونسی محفل میں تبرا ذکر اے بیگم نہیں[2]

نظم طباطبائی سید علی حیدر نظم طباطبائی واجد علی شاہ کے انتقال کے بعد حیدرآباد آئے۔ یہاں نظام کالج میں اردو کے استاد مقرر ہو گئے اور بتیس سال تک کارگزار رہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ میں ناظر ادبی کی حیثیت سے بھی کام کیا۔[3]

نظم طباطبائی سے مہاراجہ کے خاص تعلقات کی بڑی وجہ یہ تھی کہ نظم سے مہاراجہ اپنے مضامین اور اشعار پر اصلاح لیا کرتے تھے۔ نظم کے شاگرد ہونے کی حیثیت سے مہاراجہ ان کا

---

[1] رسالہ "حیات سخن" ص ۳۹ ، جلد ۱، نمبر ۶ مارچ ۱۹۳۱ء
[2] کشکول ص ۱۵ - مرتبہ احمد علی بیگ آغائی ابوالعلائی
[3] تاریخ ادب اردو ص ۱۷۶ مرتبہ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

بے حد ادب اور لحاظ رکھتے تھے ۔ مہاراجہ کے منتظم پیشی اور دو سید صادق حسین غبار کے جو معروضے دستیاب ہوئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ مہاراجہ اپنے مضامین طبع ہونے سے پہلے نظم طباطبائی کو دکھایا کرتے تھے ۔ چنانچہ معروضوں میں ایک مضمون کا ذکر ہے جس کے بارے میں مہاراجہ شاد نے لکھا ہے کہ طبع ہونے سے پہلے نظم کو دکھایا جائے

مہاراجہ اپنے کلام پر بھی نظم سے اصلاح لیا کرتے تھے ۔ وہ غبار صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

" ایک غزل فارسی کی بھیجتا ہوں ۔ یہ لفافہ حیدر نواز جنگ بہادر طباطبائی یعنی طباطبائی صاحب جن کو حال میں خطاب ملا ہے بھجوا کر لکھئے کہ بعد اصلاح لفافہ بند کر کے میرے نام واپس کریں ۔ کل بھی دو غزلیں بھیجی تھیں ۔ ان کی رائے کے لئے بھی لکھئے ۔[1]"

نظم کے انتقال کے بعد مہاراجہ کو بے حد افسوس ہوا انھوں نے اپنے دلی تاثرات کو ایک مرثیہ کی صورت میں قلمبند کیا ہے ۔ جس سے مہاراجہ کی بے لوث محبت اور عقیدت کا اظہار ہوتا ہے ۔ نظم کی موت پر نوحہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

واحسرتا کہ نظم جہاں سے گزر گئے ۔۔۔ حکم قضا سے سوئے قضا و قدر گئے
مرنے سے ان کے علم و کمالات مر گئے ۔۔۔ خون جگر سے دیدہ نمناک بھر گئے
رکن رکین جلسۂ ارباب فن گیا ۔۔۔ شاعر خموش بیٹھے ہیں لطف سخن گیا[2]

مرثیہ کا ایک اور بند ملاحظہ ہو :

موت ایسے باکمال کی ہے علم و فن کی موت
ہے انجمن نواز کی موت انجمن کی موت
بلبل نہیں تو گل کی ہے رحلت چمن کی موت
ہاں جب سخن طراز نہ ہو ہے سخن کی موت
مرنے سے نظم کے ہوا دل شق ہزار حیف ۔۔۔ بزم ادب کی اٹھ گئی رونق ہزار حیف[3]

---

[1] خط مخزونہ حیدری گشتی کتب خانہ حیدر آباد دکن

[2]، [3] مرثیہ طباطبائی ص ۴ ، ۵

مرثیہ کے آخری اشعار میں مہاراجہ نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ وہ نظم طباطبائی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں :

شاگرد داغؔ کے علم و ادب میں کثیر تھے
شعر و سخن میں نظم مرے بھی مشیر تھے
اصلاح نظم و نثر میں وہ بے نظیر تھے
سچ یہ ہے کہ وہ موئیدِ ربِ قدیر تھے

نظم طباطبائی نے مہاراجہ کی وزارت کی تہنیت میں ایک نظم لکھی تھی جو "دبدبہ آصفی" ص ۲۵ نمبر ۴ جلد ۹، رجب ۱۳۳۲ھ میں شائع ہوئی ہے۔ یہ نظم ۳۳ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں نظم طباطبائی نے مہاراجہ کی عالی نسبی کا ذکر کیا ہے۔ نیز مہاراجہ کے اسلاف کے کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔

ریاض خیرآبادی

دیگر مشاہیر ہند کی طرح ریاض خیرآبادی بھی مہاراجہ کی علم دوستی اور سخن پروری کا شہرہ سن کر حیدرآباد چلے آئے تھے۔ مہاراجہ کے یہاں کئی دن مہمان بھی رہے۔ ریاض خمریات کے بہترین شاعر ہی نہیں اچھے انشاپرداز بھی تھے۔ تسنیم مینائی نے لکھا ہے کہ ریاض جس وقت حیدرآباد آئے تھے تو مہاراجہ کے یہاں مہمان تھے اور مہاراجہ نے ان کی مہمان داری کا انتظام سرشار کے سپرد کیا تھا۔[1]

ریاض کا ایک خط مہاراجہ کے نام دستیاب ہوا ہے جس میں انھوں نے اپنی پیرانہ سالی اور کثیر العیالی کا ذکر کر کے مہاراجہ سے حسن طلب کے انداز میں امداد و اعانت کی درخواست کی ہے۔ ذیل میں ریاض کا خط نقل کیا جاتا ہے :

" اسے دامنِ تو قبلۂ مشتِ غبارِ من
رات آخر وقت نازک ہے ریاض ؛ لو لگی ہے شمع کی اللہ سے

حضور والا !

بہ اعتبار عمر میرے خدا رسیدہ ہونے میں شک نہیں۔ میں جوان تھا

---

[1] میخانۂ ریاض ص ۱۳۱

جب بھی لوگ کہتے تھے ؎

دیکھ کر ہنستے ہو کیا تم صورت پاکِ ریاضؔ ؛ یہ بڑے پہنچے ہوئے اللہ والے لوگ ہیں

بہ فرض اس میں ریاض کی ریا کو بھی دخل ہو مگر بڑھاپے کے اس نازک وقت میں ہر شخص چاہتا ہے کہ ایسی مسلمہ برگزیدہ ہستی سے جس کے ساتھ نسبت قرب حاصل ہو چکی ہو اور دوری کی نسبت ہر وقت حاصل ہو، تا امکان وہ نسبت قرب کے حصول کی تجدید کیوں نہ کرے۔

میں اس موقع پر بہ کمال ادب بلا گردان ہو کر کیوں نہ اس امر کے استفسار کی تکلیف دوں۔ سجع کے پیرائے میں کسی نے اپنے نمک پروردہ کو سر اختصاص بد دعا دی تھی ؎

شاد صاحب کی دعا ہے ہر دم　　رہے سرسبز ریاض احمد

اس دعا نے شرف اجابت نہ پایا ہوتا تو مجھے اتنی درازی عمر ہرگز حاصل نہ ہوتی۔ ریاض احمد قیامت تک سرسبز رہے گا۔ مگر نشاً اس دعا سے جو سرسبزی مجھے اب تک حاصل ہوتی رہی کیا کم ہے۔ ہر طرح پھولا پھلا۔ یہاں تک کہ آخر عمر میں خدا نے سات بچے دیئے۔ جن میں پچھلے دونوں بھائی بہن توام۔ اللہ دینے والی مقدس ہستی کو مجھ پر اور میرے ان بچوں کے سر پر (جو بڑھاپے کی اولاد عزیز ہیں اور اپنی پرورش و پرداخت کے لئے محض بے ذریعہ ہیں) سایہ گستر رکھے۔ آمین۔ آمین۔ ہزار بار آمین۔

ایسے ظل شانہ و ظل اللہ کے حضور میں وقت آخر نسبت قرب کی تجدید کے لئے کیوں نہ حاضر ہوں۔ اس تمنا میں نیاز فتح پوری سے یہ سن کر اور بھی ہیجان پیدا ہو گیا کہ سرکار دولت مدار مہاراجہ بہادر میرا ذکر فرماتے ہیں ؎

ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

ان الفاظ سے طلب اجازت مقصود نہیں۔ نہ مجھ سے وابستہ دامن کو اس کی ضرورت، اور ہو بھی تو میں اس کا اہل نہیں۔ خدا تصور کا بھلا کرے ہر وقت باریاب ہو کر کہہ سکتا ہوں ؎

اے دامن تو قبلہ مشت غبار من

میں یقیناً انشاءاللہ تعالیٰ نیاز فتح پوری کے ساتھ ہی اگست
کی کسی تاریخ میں شرف حضوری حاصل کروں گا۔

دولت و اقبال مستدام

ریاض

نمک پروردہ حضور مدار المہام"

مہاراجہ سے ریاض کے تعلقات اور ان کی غیرت اور نازک مزاجی کے بارے میں رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں:

"مہاراجہ سرکشن پرشاد ریاض سے خالص محبت اور عقیدت رکھتے تھے اور بے حد خواہش مند تھے کہ ان کو اپنے جیب و گریبان بنا کر اپنے ساتھ رکھیں۔ مگر ریاض مرحوم اتنے بے طمع اور قانع تھے کہ مہاراجہ صاحب محمود آباد کی اولش نوازی اپنے لئے کافی سے زیادہ سمجھتے رہے" [۱]

مہاراجہ کے نام ریاض کا صرف ایک خط ملا ہے اور غالباً پہلا خط ہے جو ریاض نے مہاراجہ کو لکھا ہے۔ ریاض کے حیدر آباد آنے کی کوئی تفصیل بھی معلوم نہیں ہو سکی۔ اس لئے پتہ نہیں کہ مہاراجہ نے ریاض صاحب کی توقعات کو کہاں تک پورا کیا۔ لیکن ریاض کے اس ایک خط سے واضح ہوتا ہے کہ وہ مہاراجہ سے امداد و اعانت کے طلب گار ہیں۔ اور اپنے کم سن بچوں کی پرورش کے لئے مہاراجہ کے الطاف و اکرام کے آرزومند ہیں۔ اس ایک خط کی روشنی میں رئیس احمد جعفری کا یہ بیان خلاف واقعہ معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجہ تو ریاض صاحب کو اپنا جیب و گریبان بنا لینا چاہتے تھے مگر ریاض کی بے طمعی اور قناعت پسندی نے مہاراجہ محمود آباد کی اولش نوازی پر اکتفا کیا۔

ریاض کی زبان دانی سے متعلق رئیس احمد جعفری نے متعدد اہل قلم حضرات کی رائیں نقل کی ہیں جن میں مہاراجہ کی حسب ذیل رائے بھی شامل ہے:

---

[۱] رند پارسا ص ۲۲۸

"ریاض بڑے خوش گو اور مشاق شاعر تھے۔ طبیعت خوب راہ دینے والی پائی تھی۔" ع۱

نصیر حسین خاں خیالؔ

مہاراجہ کے نام نصیر حسین خاں خیالؔ کا ایک خط دستیاب ہوا ہے جو ۲۲ر جولائی ۱۹۲۵ء کا لکھا ہوا ہے۔

اس خط کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان عرصے سے مراسلت کا سلسلہ جاری ہے۔ نیز اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ خیالؔ مہاراجہ سے ملاقات کر چکے ہیں اور یہ خواہش رکھتے ہیں کہ جلد از جلد پھر مہاراجہ سے ملیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"مائی ڈیر سر یمین السلطنت بہادر

عرض بندگی چاکرانہ

ایک عرصہ دراز سے خیر و عافیت مزاج مبارک و عالی معلوم نہیں۔ امیدوار ہوں کہ از راہ شفقت بزرگانہ دو کلمۂ خیریت ارشاد فرما کر سرفراز و ممتاز کیا جاؤں۔ زیارت قدم بوسی کے اشتیاق کو کیا عرض کروں۔ اس اثناء میں اکثر شرف ملاقات و نیاز کا قصد ہوا کہ ایک مرتبہ پھر حیدرآباد حاضر ہو کر مشرف ہوں مگر شومئ قسمت سے قاصر رہا اور اب تک قاصر ہوں۔ دیکھئے ایسا مبارک موقع پھر کب نصیب ہوتا ہے۔ اور جناب عالی کب یاد فرما کر نفقر کے دیرینہ اشتیاق کو پورا فرماتے ہیں۔" ع۲

اس خط کا جواب جو مہاراجہ نے دیا وہ بھی کافی اہم ہے۔ مہاراجہ کے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود مہاراجہ بھی خیالؔ کے حالات جاننے کے لئے بے چین ہیں۔ مہاراجہ نے خط کا جواب تاخیر سے دینے کی معافی چاہی ہے۔ اور اپنی خانگی پریشانیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ مہاراجہ کا خط ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

" مائی ڈیر حضرت خیال سلمہ اللہ تعالیٰ

ع۱ رند پارسا ص ۲۸۹

ع۲ خط مخزونہ حیدری گشتی کتب خانہ حیدرآباد دکن

بعد نیاز دلی فقیر شاد اس یاد فرمائی کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ آپ کی بے خیالی کا اثر کچھ ایسا عالمگیر ہوگیا ہے کہ اکثر احباب کے خیال سے شاد فراموش ہوچکا ہے یا لائق یاد فرمانے کے نہیں رہا۔ فقیر اگر جواب کو لکھتا تو کس اڈریس پر۔ اس لئے کہ جب کبھی دریافت کیا کہ حضرت خیال سلمہ کہاں تشریف فرما ہیں تو جتنی زبانیں اتنی ہی چیزیں۔ کوئی مشرق، کوئی مغرب، کوئی شمال، کوئی جنوب۔ الغرض یہ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو آپ زمین کے ساتھ گرم سفر ہیں یا آپ کے بلا گردوں ہے۔ بہرحال آپ کی جانب سے کوئی بھی دو حرفی خط موصول ہونے پر بھی فقیر جواب سے تساہل کرتا تو ٹھیک مجرم تھا۔ اور میں تو دلی دوستوں سے اس قدر غافل رہنے کو بھی فقیر جرم سمجھتا ہے جس کا یہ فقیر مرتکب ہے۔ اور معافی کا خواستگار۔ کیا حیدرآباد سے آپ اس قدر ناراض ہوگئے کہ جس تاریخ سے روانہ ہوگئے ہیں۔ بھولے سے بھی کبھی آپ نے اس طرف کا قصد نہیں کیا۔ فقیر شاد معہ فیملی کے خیریت سے ہے۔ لیکن آپ نے ضرور سنا ہوگا کہ فقیر زادہ خواجہ پرشاد سلمہ اللہ تعالیٰ کی بائیں آنکھ آہنی کھیلے کے صدمے سے ایسی مجروح ہوئی کہ بینائی میں اس آنکھ کی فرق آگیا۔ اس بدنصیبی کو کیا کہوں کہ کئی اولاد ذکور میں وارث جائز اور چراغ خاندان خدا رکھے رہ گیا تھا۔ اس میں بھی یہ نقص پیدا ہوگیا۔ ڈاکٹروں کے مختلف آرا ہیں۔ بعض تو کہتے ہیں کہ جوں جوں عمر میں ترقی ہوگی ضرور بصارت آجائے گی۔ اور بعض ناامیدی کا اظہار کرکے فقیر کے دل کو صدمہ پہنچاتے ہیں۔ یقین مانئے کہ اس تاریخ جس کو کہ سال کا عرصہ ہوتا ہے فقیر کی آنکھوں میں دنیا اندھیری ہے۔ پانچ چھ ماہ کے عرصہ سے کچھ روشنی جو نہیں نظر آتی تھی کہتا ہے کہ اب نظر آنے لگی ہے۔ دعا فرمائیے کہ خدائے تعالیٰ فضل فرمائے۔ باقی اور کیا لکھوں۔ ہر طرف سے مایوسی بھیانک صورت اپنی دکھلا کر ڈراتی ہے۔ لیکن کرم و رحمت

لاتقنطو من رحمت اللہ کہہ کر ڈھارس دیتی ہے۔ امی بھروسہ پر زندگی کے دن امید میں گزر رہے ہیں۔ یقین ہے کہ آپ معہ فیملی کے خیریت سے ہوں گے۔ حیدر آباد کب تشریف لائیں گے؟ اور ضرور تشریف لائیے۔"[۱]

علامہ اقبال

علامہ اقبال اور مہاراجہ کی باہمی خط وکتابت کو ڈاکٹر زور نے "شاد اقبال" کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ اقبال اور مہاراجہ کے تعلقات بہت دیرینہ اور دوستانہ تھے۔ ان کی آپس کی مراسلت سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے کس درجہ خلوص تھا۔ اور ایک دوسرے کی کس قدر عزت کرتے تھے۔ ان کی خط وکتابت کا سلسلہ آخر تک جاری رہا۔ ان کے خطوط میں کوئی نہ کوئی علمی مسئلہ یا ادبی بحث ضرور ہوتی۔ اقبال جب کوئی نظم لکھتے تو مہاراجہ سے داد لینا ضروری سمجھتے اور مہاراجہ جواب میں ان کے اعلیٰ ذوق شعری اور ان کی بہترین دماغی صلاحیتوں کو سراہتے تھے۔

ڈاکٹر زور "شاد اقبال" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ ان دونوں کی پہلی ملاقات سنہ ۱۹۱۰ء میں حیدر آباد میں ہوئی اور دوبارہ سنہ ۱۹۱۳ء میں پنجاب میں انھیں ملنے کا موقع ملا[۲]۔ مہاراجہ نے اپنے سفر نامہ "سیر پنجاب" میں علامہ اقبال سے خوش گوار ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے۔ لاہور پہنچنے پر علامہ اقبال نے مہاراجہ کا استقبال کیا تھا۔ اس کا ذکر مہاراجہ اس طرح کرتے ہیں:

"اسٹیشن پر میرے بے ریا دوست ڈاکٹر محمد اقبال بیرسٹرایٹ لا موجود تھے ان سے ملا۔ اور اپنے ڈبوں کو علیحدہ کرا کر ایک طرف قیام کیا۔"[۳]

اسی سفرنامے میں دوسری جگہ اقبال کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"۵ بجے شام کے میرے دوست ڈاکٹر محمد اقبال بیرسٹرایٹ لا آئے۔ بہت دیر تک لطف صحبت رہا۔ بڑے مزے کے آدمی ہیں۔ خدا زندہ رکھے۔"[۴]

---

[۱] خط مخزونہ حیدری گشتی کتب خانہ حیدر آباد دکن

[۲] مقدمہ شاد اقبال ص ۹، ۱۳ - [۳] و [۴] سیر پنجاب ص ۸۸، ۸۹ اور ۹۲

مہاراجہ کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اقبال سے قدرے بے تکلف تھے۔ ہمیشہ انھیں "مائی ڈیر اقبال" یا "میرے پیارے اقبال" سے مخاطب کرتے اور اقبال انھیں ہمیشہ "سرکار والاتبار" لکھا کرتے تھے۔ "شاد اقبال" میں مہاراجہ کا ایک طویل خط اقبال کے نام ہے جس سے مہاراجہ کی بے پناہ محبت ظاہر ہوتی ہے اور اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ انھیں اقبال سے ملنے کا اشتیاق کس قدر بڑھ گیا تھا۔ خط کا اقتباس درج ذیل ہے:

"میرے پیارے اقبال

خدا تمھیں دل شاد و سلامت رکھے۔ بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ جس وقت اقبال کا خط دیکھتا ہوں باچھیں کھل جاتی ہیں۔ اور بہا بیت دل شاداں اور مسرور ہو جاتا ہے۔ اللہ کے واسطے محبت ہے نہ کوئی دنیاوی غرض ہے نہ دین سے سوال۔ حالانکہ اس قسم کا ارتباط اور بھی ایک دو سے ہے۔ مگر آپ سے کیوں اس قدر خلوص ہے اس کا علم بھی اس عالم الغیب کو ہے۔ خیر بھئی یہاں تو کسی طرح انشاء اللہ کبھی نہ کبھی مل ہی لیں گے مگر اس عالم میں کس طرح ملاپ ہوگا۔ واللہ اعلم آپ تو جنت میں مزے اڑاتے رہیں گے۔ ہم گنہگار اپنی ہستی کی زنجیروں میں، خدا نہ کرے جکڑے گئے ہوں گے یا کیا؟ خیر جب تک زندہ ہیں خدا اتنا تو نہ ترسائے ملاقات کے لئے جیسا کہ اب کی بار ترس گیا۔ واللہ چار برس سے لاہور اور اقبال کے لئے دعائیں کر کر کے تھک گیا۔ مگر وائے نصیب کہ دعا مستجاب نہ ہوئی۔ نہ لاہور پہنچے نہ اقبال کو دیکھے ... ... میرے پیارے اقبال۔ خدا کے واسطے لاہور بلاؤ۔ اگر یہ ناممکن ہو تو خیر درشن ہی دو۔ بہت ترس گیا۔"[1]

اس خط کا جواب جو اقبال نے دیا وہ بھی اہم ہے۔ اس سے اقبال کے خلوص اور ان کی عقیدت مندی کا اظہار ہوتا ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجہ کی طرح اقبال بھی ان سے ملنے کا اشتیاق رکھتے ہیں۔ خط کی ابتدا میں لکھتے ہیں:

۱۔ شاد اقبال ص ۱۷-۱۸

"سرکار والاتبار:
تسلیم مع التعظیم۔
محبت نامہ مل گیا ہے۔ جس کے لئے اقبال سراپا سپاس ہے۔ الحمدللہ کہ آئینۂ دل گردِ غرض سے پاک ہے۔ اقبال کا شعار ہمیشہ سے محبت و خلوص رہا ہے۔ اور انشاءاللہ رہے گا۔
... دل تو بہت عرصہ سے آرزومند آستانہ بوسی ہے مگر کیا کیا جائے۔ ایک مجنوں اور سو زنجیریں۔ تین چار ماہ ہوئے کہ ارادہ مصمم سفر حیدرآباد کا کر لیا تھا۔ مگر استخارہ کیا اجازت نہ ملی۔ خاموش رہا۔ اب سرکار مع الخیر پھر حیدرآباد واپس تشریف لے جائیں اور پنجاب کی سردی بھی قدرے کم ہوجائے تو پھر قصد کروں۔ کئی باتیں راز کی آپ سے کرنی ہیں۔ گو یا ممکن ہے کہ میرے حیدرآباد آنے تک وہ راز خود بخود آشکارا ہوجائے اور مجھے افشا کرنے کی ضرورت نہ ہو" ؏[1]

آخر وقت تک ان دونوں کے پرخلوص روابط قائم رہے اور خط وکتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ مہاراجہ نے اقبال کے نام جو خطوط لکھے ہیں ان کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بہت کم کسی دوسرے سے اتنے بے تکلف ہوئے ہوں گے جس قدر کہ وہ اقبال سے ہوگئے تھے۔

فانی

فانی سے مہاراجہ کی پہلی ملاقات ۱۹۲۶ء میں حیدرآباد میں ہوئی۔[2] اس کے بعد ان دونوں کے روابط بڑھتے گئے۔ مہاراجہ نے فانی کو ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔[3] فانی نے اپنے مضمون "بہ یادِ شاد" میں اس بات کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

"میں تیسری اور شاید آخری مرتبہ سنہ ۱۹۳۲ء میں حیدرآباد

؏۱ شادِ اقبال ص ۲۳
؏۲ و ؏۳ مجلۂ عثمانیہ مہاراجہ نمبر ص ۱۰۷، ۱۶۷

پہنچا۔ یہاں پہنچنے کے بعد مہاراجہ بہادر نے میرے لئے جو کچھ کیا۔ جس حد تک میری قدر افزائی فرمائی وہ کسی سے مخفی نہیں۔ یہ محتاج اعادہ نہیں کہ میرے لئے کن کن دشواریوں سے مقابلہ کرنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ کتنی مخالف قوتوں سے سینہ سپر ہونا پڑا۔ کس قدر طویل زمانے تک بذات خود میری ضروریات زندگی کی کفالت فرماتے رہے۔" [1]

مہاراجہ نے فانی کی ملازمت کے سلسلہ میں بھی کافی کوشش کی تھی اور ہیڈ ماسٹری پر اُن کا تقرر کروادیا تھا۔ فانی کے ملازم ہو جانے کے بعد چند حاسدوں نے مہاراجہ کو مشورہ دیا کہ چونکہ فانی سرکاری ملازم ہو چکے ہیں اس لئے مہاراجہ انھیں جو ماہانہ رقم دیتے ہیں وہ بند کر دیں۔ چنانچہ ان کے کہنے پر مہاراجہ نے فانی کی ماہانہ تنخواہ بند کر دی۔ پھر بھی شدید ضرورت کے موقع پر انھیں کچھ نہ کچھ عنایت کر دیتے تھے۔ [2]

مہاراجہ کی موت فانی کے لئے نہایت افسوس اور پریشانی کا باعث ہوئی۔ ان کے انتقال کے بعد فانی کی مالی مشکلات بڑھتی ہی گئیں۔ مہاراجہ کے انتقال پر فانی نے اپنے جذبات اور تاثرات کو نظم کی شکل میں ان الفاظ میں پیش کیا ؎

اے مہاراجہ بہادر اے یمین السلطنت
تو مجسم خیر تھا انسانیت عبارت تجھ سے تھی

اب کہاں رسم مروت اور کہاں ہندوستاں
آج بھی باقی یہاں رسم مروت تجھ سے تھی

جس شرافت کی اداؤں پر رہا مشرق کو ناز
اٹھ گئی اب وہ شرافت وہ شرافت تجھ سے تھی

بزم ارباب ادب اُجڑی ہوئی محفل ہے آج
بزم ارباب ادب کی ساری زینت تجھ سے تھی

زندہ رکھا تھا سخاوت نے تو خود حاتم کا نام
اور تیرے دور میں زندہ سخاوت تجھ سے تھی

دل سے تیری یاد ہرگز محو ہو سکتی نہیں
اب بھی فانی کو وہی ہے کل جو نسبت تجھ سے تھی [3]

ع۱ مجلہ عثمانیہ مہاراجہ نمبر ص ۱۱۰

ع۲ فانی ص ۱۴۳

ع۳ وجدانیات فانی ص ۸

اس نظم کے سرنامہ پر فانی نے یہ نوٹ لکھا ہے :

"یہ میری آنکھوں سے بے اختیار ٹپک جانے والے آنسو اور میرے دل سے بے ساختہ نکلی ہوئی آہیں ہیں جو نظم ہو گئیں"۔

فانی جیسے خوددار اور پابند وضع شاعر کا یہ خراج عقیدت مہاراجہ کے اعلیٰ اوصاف کی سند ہے۔

فصاحت جنگ جلیل

جلیل ۱۳۱۸ھ میں امیر مینائی کے ساتھ حیدرآباد آئے تھے۔ اس وقت مہاراجہ وزیر افواج اور پیشکار سلطنت تھے۔ امیر مینائی کے انتقال کے بعد مہاراجہ شاد کی توجہ جلیل پر مبذول ہوئی۔ مہاراجہ نے جلیل کو اپنے مصاحبین میں شریک کر لیا۔ نیز ان سے مشورہ سخن بھی حاصل کرنے لگے۔ اس عرصہ میں مہاراجہ نے دبدبۂ آصفی اور محبوب الکلام کی ادارت اور ان پرچوں کے تمام حقوق بھی ان ہی کو دے دئیے تھے[۱]۔

مرتب کتاب "مہاراجہ کشن پرشاد" نے لکھا ہے کہ جلیل کے حیدرآباد آنے کے بعد مہاراجہ شاد نے عرصہ دراز تک ان کی سرپرستی کی اور اپنے اسٹیٹ سے ماہانہ کچھ رقم دیا کرتے تھے[۲]۔ حمید الدین شاہد نے لکھا ہے کہ جب داغ کا انتقال ہوا تو والئی دکن نواب میر محبوب علی خاں نے جلیل کو اپنا استاد مقرر کیا اور مشورہ سخن کرنے لگے[۳]۔

جلیل نے مہاراجہ کے ناول "چنچل نار" پر قطعۂ تاریخ کہا ہے۔ جس میں مہاراجہ کی علمی صلاحیتوں کی ان الفاظ میں تعریف کی ہے :

تر زبانی خوش بیانی شاد کی ہو کیا بیاں
داستاں ساری ہے رنگیں دلنشیں میرا بیاں
ختم ناول کی کہی تاریخ میں نے اے جلیل
کتنی پاکیزہ زباں ہے صاف ہے کتنا بیاں[۴]

۱۔ بیاض مملوکہ عبد الرزاق عرشی صاحب
۲۔ مہاراجہ کشن پرشاد ص ۲۲۸
۳۔ حیدرآباد کے شاعر ص ۴۸
۴۔ چنچل نار ص ۲۸۵

مرزا فرحت اللہ بیگ

مہاراجہ کے انتقال کے بعد مرزا فرحت اللہ بیگ نے "یاد رفتگان" کے عنوان سے ایک طویل اور دلچسپ مضمون لکھا تھا جو مجلۂ عثمانیہ کے مہاراجہ نمبر میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے بتایا ہے کہ ۱۹۲۷ء تک وہ مہاراجہ سے بالکل ناواقف تھے اور مہاراجہ بھی انھیں نہیں جانتے تھے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کا ایک مضمون ۱۲۶۱ھ میں "دہلی کا ایک مشاعرہ" رسالہ اردو میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کو مہاراجہ نے بے حد پسند کیا اور ایک اشرفی بطور انعام روانہ کی تھی۔ اس واقعہ کو فرحت اللہ بیگ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> "خط اور اشرفی لانے والوں نے میری تلاش شروع کی۔ مگر میں ایسا گمنام شخص تھا کہ کئی روز تک میرا پتہ نہ چلا۔ ہوتے ہوتے کھوج مل ہی گیا اور وہ اشرفی مجھ تک پہنچ گئی۔ میں نذر دینے مہاراجہ بہادر کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ پہلا روز تھا کہ میں نے ان کو دیکھا اور انھوں نے مجھے دیکھا۔ اس کے بعد میرا آنا جانا ان کے ہاں ہوگیا۔ اور رفتہ رفتہ میری عقیدت ان کے ساتھ اور ان کی محبت میرے ساتھ اتنی بڑھی کہ بیان سے باہر ہے۔" [۱]

فرحت اللہ بیگ لکھتے ہیں کہ مہاراجہ کا حکم تھا کہ ان کے ہاں ہفتہ میں ایک دن ضرور آیا کریں۔ اور جب بھی آئیں ایک غزل لکھ کر لائیں۔ چنانچہ ایک عرصہ تک فرحت اللہ بیگ نے ان کے حکم کی تعمیل کی۔

مہاراجہ فرحت اللہ بیگ کی نظم و نثر سے بے حد متاثر تھے اور ان کی ادبی تخلیقات کے صحیح معنوں میں قدر داں تھے۔ چنانچہ مرزا فرحت اللہ بیگ کا کہنا ہے کہ جب کبھی ان کی کوئی کتاب مہاراجہ کی نظر سے گزرتی وہ اس کو شروع سے آخر تک پڑھتے اور اس پر ریویو لکھ بھیجتے۔ "مضامین فرحت" کا مطالعہ کرنے کے بعد مہاراجہ فرحت کے طرز بیان سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ انھوں نے مرزا صاحب کو جو خط لکھا تھا اس کا آخری حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

---

[۱] مجلہ عثمانیہ مہاراجہ نمبر ص ۲۰

"مرزا صاحب آپ نے رلایا بھی اور ہنسایا بھی۔ طبیعت بہت خوش ہوئی۔ خدا آپ کو شاد بامراد رکھے۔ ایک رسٹ واچ تحفتاً بھیجتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اس کو قبول کر کے مجھے شاد کریں گے اور دل کو فرحت بخشیں گے۔" ع۱

اس کا جواب جو فرحت نے دیا اس کا اقتباس درج ذیل ہے

"فرحت کے قدردان سرکار

خدا آپ کو شاد اور آباد رکھے۔ تحفہ ملا۔ شکریہ اور بہت بہت شکریہ۔ عنایت نامہ نے جو اثر کیا وہ بیان سے باہر ہے۔ ہر لفظ سے جوش قدردانی ٹپکتا ہے اور ہر حرف ہمت افزائی کرتا ہے۔ بھلا میں کیا اور میرا کام کیا۔ ہاں سرکار ہی جیسے قدردانوں کے برتے پر کچھ لکھ لیتا ہوں۔ پرانی تہذیب کا دلدادہ ہوں اور اسی کو تازہ رکھنا میرا کام ہے۔ اکثر مضامین اسی پہلو سے لکھے ہیں اور اگر قلم نے یاری دی تو آیندہ بھی لکھوں گا۔ جب خدمت والا میں حاضر ہوتا ہوں تو خدا بہتر جانتا ہے کہ میرے دل کا کیا حال ہوتا ہے۔ سوچتا ہوں کہ یا اللہ جب ہر امیر کے ہاں پہلے یہی صحبت ہوگی تو اس زمانہ والوں کی کیسی اچھی گزرتی ہوگی۔ پہلے زمانہ کے لوگ کہا کرتے تھے کہ بادشاہ کی شکل دیکھنے سے چالیس روز کا رزق بڑھتا ہے۔ آج کل کوئی اس کو مانے یا نہ مانے۔ میں تو یہی کہوں گا کہ جب شاد کے پاس تھوڑی دیر بیٹھ کر انسان ساری کلفتیں بھول جاتا ہے تو بادشاہ کا دیکھنا جو کچھ نہ کرے تھوڑا ہے۔" ع۲

فرحت اللہ بیگ نے اپنے اسی مضمون میں اپنی شاعری کی ابتدا کا بھی ذکر کیا ہے

ع۱ مجلہ عثمانیہ نمبر مہاراجہ نمبر ص ۳۱

ع۲ " " " "

اور لکھا ہے کہ جس طرح ان کی نثر کی قدر افزائی کرنے والی سب سے پہلی ہستی مہاراجہ شاد کی تھی اسی طرح شاعری میں بھی ان کی ہمت افزائی کرنے والی شخصیت مہاراجہ کی تھی۔

فرحت اللہ بیگ لکھتے ہیں کہ مہاراجہ کے پاس ہر مہینہ ایک مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ اور اس میں شرکت کے لیئے وہ ہر وقت ایک نئی غزل لکھا کرتے تھے۔

فرحت اللہ بیگ کی ایک غزل کے بارے میں مہاراجہ لکھتے ہیں:

"شب میں مشاعرہ آپ کے لیئے تھا اور آپ مشاعرے کے لیئے۔ جو تضمین آپ نے کی تھی بے مثل تھی۔ زبان اور محاورہ کا لطف بے اندازہ قابل تعریف تھا۔ برگ سبز است تحفۂ درویش۔ اس تحفہ کو آپ قبول کریں گے تو بڑی مسرت کا باعث ہوگا۔ خدائے تعالیٰ آپ کو شاد و آباد رکھے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ نثر کے سلسلہ کو موقوف نہ کیجئے۔ انشاء اللہ مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا مدد کروں گا۔" [1]

مہاراجہ نے اس اندیشہ سے کہ کہیں طباعت و اشاعت کے مصارف کا خوف فرحت کے ذوق تصنیف و تالیف کو ہٹا نہ کر دے خط کے آخر میں امداد و اعانت کا یقین دلایا ہے۔

سر شیخ عبدالقادر

سر شیخ عبدالقادر کے بارے میں محمد مصلح الدین صاحب نے لکھا ہے کہ جس وقت وہ پہلی بار حیدر آباد آئے تھے۔ تو مہاراجہ نے انھیں دعوت دے کر ان کی قدر افزائی کی تھی۔ [2]

اقبال کی ایک نظم "شکریہ" کے عنوان سے سر شیخ عبدالقادر کے رسالہ "مخزن" جون سنہ ۱۹۱۰ء میں چھپی تھی۔ اس نظم میں اقبال نے مہاراجہ کے اخلاق اور ان کی بلند شخصیت کی تعریف کی ہے۔ سر شیخ عبدالقادر نظم سے پہلے بطور تمہید لکھتے ہیں:

---

[1] مجلہ عثمانیہ مہاراجہ نمبر ص ۳۶
[2] " " " ص ۱۲۴

"دکن کے علم دوست اور ہنر پرور وزیر اعظم کی اس خوبی
کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے کہ اہل علم کی قدر دانی
ان کا شیوہ اور مشاغل علمی سے انھیں شغف ہے۔
انھوں نے جو الطاف نامہ شیخ محمد اقبال صاحب کو لکھا اس
سے نہ صرف شیخ صاحب موصوف کی قدر افزائی مقصود
تھی بلکہ ان کی شاعری کے لئے ایک زبردست تحریک،
جس کے لئے میں بھی غائبانہ طور پر مخزن کے ناظرین کی طرف
سے ہز اکسلنسی مہاراجہ صاحب بہادر کا شکریہ ادا کرتا ہوں[1]۔"

اس تمہید سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ عبدالقادر مہاراجہ کی علم دوستی اور ہنر پروری سے کس درجہ متاثر تھے۔

سید سلیمان ندوی

مصلح الدین صاحب نے لکھا ہے کہ ہوش بلگرامی نے مہاراجہ سے سید سلیمان ندوی کا تعارف کرایا تھا۔ رفتہ رفتہ مہاراجہ ان کی قدر کرنے لگے تھے۔ مہاراجہ ان کے تحقیقی مضامین کو بھی دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے۔ مصلح الدین صاحب نے مہاراجہ کے ایک غیر مطبوعہ مضمون کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس غیر مطبوعہ مضمون میں مہاراجہ شاد نے سید صاحب کی تعریف کی ہے اور ان سے اپنے تعلقات کا بھی ذکر کیا ہے[2]۔ مجھے یہ غیر مطبوعہ دستیاب نہ ہو سکا۔

خواجہ حسن نظامی

خواجہ حسن نظامی سے مہاراجہ کو بے حد عقیدت تھی۔ انھوں نے خواجہ صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ خواجہ صاحب مہاراجہ کو مسلمان سمجھتے تھے۔ اور ان کے عقائد سے مطمئن تھے۔ انھوں نے مہاراجہ کو خماری شاہ کا خطاب مرحمت فرمایا تھا۔
"رقعات شاد" میں خواجہ صاحب کے نام مہاراجہ کا کوئی خط نہیں ہے۔ البتہ

---

[1] مقدمۂ شاد اقبال ص ۱۱
[2] مجلہ عثمانیہ مہاراجہ نمبر ص ۱۲۴

رسالہ "منادی" میں مہاراجہ کے خطوط خواجہ صاحب کے نام سلسلہ وار چھپ چکے ہیں۔ ان خطوط میں سیاسی، سماجی اور مذہبی امور پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ مہاراجہ کا مذہب عوام کے لئے ایک معمہ بنا ہوا تھا۔ کوئی انھیں کفر کا فتویٰ دیتا تو کوئی نام بدلنے پر مجبور کرتا۔ جس زمانہ میں مہاراجہ کا مذہب موضوع بحث بن گیا تھا مہاراجہ اس کا ذکر کرتے ہوئے خواجہ صاحب کو لکھتے ہیں:

"ایک خبر مجھ تک پہنچی ہے۔ عام نہیں خاص ہے۔ شاید کہ عام ہو جائے۔ وہ یہ کہ مسرت محل مرحومہ کی دختروں کی شادی جو شاہزادوں سے ہونے کا کچھ چرچا تھا وہ اس شرط کے ساتھ ہونا سنا جاتا ہے کہ شاد اسلام اختیار کرے اور حبیب عیدروس کے ہاتھ پر بیعت کرے۔ اللہ اللہ دھیڑنی، چمارنی کو مسلمان کے شادی کرنا جائز۔ پارسن کو شادی کرنا درست، انگریزنی کو شادی کرنا تو گویا رواج۔ ان میں سے کسی کے باپ کو بھی نہ بیعت کرنے کہا جاتا ہے نہ مسلم ہونے کے لئے ترغیب دی جاتی ہے۔ مگر کم بخت شاد ہی گویا ایسی رذیل قوم کا ہے کہ اس کے وہ دختر بھی جن کے ماں مسلم تھے عیب دار سمجھے جاتے ہیں*۔ یہ سب باتیں دل خراش گویا شاد کو رسوا کرنے کی ہیں۔ اس زمانہ میں احساس نہیں۔ دلی جذبات کو پامال کرنا گویا ثواب ہے۔ دوسری قوموں کو ذلیل کرنا فرض سمجھا گیا ہے" ؎۱

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی

کیفی انگریزی، اردو اور فارسی کی اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے۔ ادیب، شاعر نقاد اور ڈرامہ نگار تھے۔ ان کی کتاب "کیفیہ" محققانہ طرز بیان کی حامل ہے "واردات" ان کا مجموعہ کلام ہے۔ ڈراموں میں "راج دلاری" اور "مراری دادا" قابل دید ہیں ؎۲

---

* یہ جملہ قواعد کی رو سے غلط ہے

؎۱ رسالہ منادی ص ۲۲ ستمبر ۱۹۶۱ء

؎۲ "تاریخ ادب اردو" ص ۱۵ مرتبہ ڈاکٹر نذیر احمد

مصلح الدین صاحب نے لکھا ہے کہ کیفی جب حیدر آباد آئے تھے تو مہاراجہ نے ان کی صدارت میں ایک مشاعرہ منعقد کیا تھا۔ باہمی خط و کتابت بھی ہوتی تھی۔ دونوں کے تعلقات زیادہ وسیع نہ تھے پھر بھی مہاراجہ کیفی کی قدر افزائی کر کے اپنی علم دوستی کا ثبوت دیا کرتے تھے۔ [1]

کیفی نے اپنے مضمون "اک شمع رہ گئی وہ بھی خموش ہے" میں مہاراجہ کی علم پروری، ادب نوازی اور دیگر شخصی خوبیوں کو سراہا ہے۔" [2]

ظفر علی خاں

ظفر علی خاں نے حصول تعلیم کے بعد حیدر آباد آکر فوج میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ہی مولوی عزیز مرزا صاحب نے انھیں ہوم آفس میں مترجمی کے عہدہ پر رکھ لیا۔ رفتہ رفتہ وہ کونسل میں رجسٹرار ہو گئے۔ حیدر آباد میں ۱۹۰۲ء میں "فسانہ" رسالہ جاری کیا۔ اس کے بعد "دکن ریویو" شائع کرنا شروع کیا۔ ۱۹۰۹ء میں کسی سازش کے الزام میں حیدر آباد سے چلے جانے پر مجبور ہو گئے۔ [3]

مہاراجہ سے ظفر علی خاں کی خط و کتابت کا سلسلہ ۱۳۳۷ھ ۱۹۱۸ء سے شروع ہوا، اور عرصہ تک خوش گوار تعلقات قائم رہے۔ مہاراجہ سے ظفر علی خاں کے دیرینہ تعلقات کا اس واقعہ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ جس زمانہ میں وہ "ستارہ صبح" نامی رسالہ نکالتے تھے تو مہاراجہ بھی اپنی غزلیں بغرض اشاعت روانہ کرتے تھے۔ [4]

"شاد اقبال" میں مہاراجہ نے اقبال کے نام ایک طویل خط میں ظفر علی خاں کا ذکر دو جگہوں پر کیا ہے۔ مہاراجہ نے ظفر علی خاں کی فرمائش پر ایک غزل روانہ کی تھی۔ اس غزل کے ایک مصرع کو ظفر علی خاں نے کسی مصلحت کی بناء پر بدل دیا تھا۔ اس کی شکایت کرتے ہوئے اقبال کو لکھتے ہیں:

۱۔ مجلہ عثمانیہ مہاراجہ نمبر ص ۱۶۹

۲۔ " " " ص ۸۱، ۸۲

۳۔ سیر المصنفین ص ۲۶۰ مرتبہ محمد یحیٰ تنہا

۴۔ مجلہ عثمانیہ مہاراجہ نمبر ص ۱۷۱

"مولوی ظفر علی خاں کی فرمائش پر ایک تازہ غزل جو فی البدیہہ لکھی تھی روانہ کردی تھی۔ اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھنا یہ آپ کی عین محبت ہے۔ مگر تعجب ہے کہ مولوی صاحب نے ایک مصرعہ میں خود تصرف کیا یا ان کے مددگار نے، حالانکہ عموماً قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی رسالے یا اخبار کے ایڈیٹر کو کوئی شعر یا مصرعہ پسند نہ آئے تو اس کو ترک کر دے، درج نہ کرے نہ کہ تصرف بے جا۔ چونکہ وہ بڑے قدیم دوستوں سے تھے۔ اس لیے سکوت کیا۔"[1]

مہاراجہ نے مولوی ظفر علی خاں کو لکھ بھیجا تھا کہ وہ اپنے رسالہ میں صوفیوں کے گروہ پر جو لعن طعن کر رہے ہیں اس کا سلسلہ ختم کر دیں۔ اس پر ظفر علی خاں نے پھر صوفیوں کی خبر لی اور ان پر کفر کا فتویٰ بھی دے دیا۔ اس بارے میں مہاراجہ اقبال کو لکھتے ہیں:

"مولوی ظفر علی خاں صاحب بھی میرے دوست ہیں۔ اور سمجھ دار ہیں دور اندیش ہیں اور قلم کے دھنی اور تحریر اور تقریر میں بہت گنجائش ہے اور نہایت وسعت ہے۔ ایسے وسیع میدان میں شعار اسلام جو خلق پر مبنی ہے، چھوڑ کر بد اخلاقی سے پیش آنا اور قوتِ تحریر کو برائی کی طرف محدود کر دینا غالباً وہ خود پسند نہ کریں گے۔"[2]

بہر حال مہاراجہ نے جہاں کہیں ظفر علی خاں کا ذکر کیا ہے۔ انھیں اپنے قدیم دوستوں میں شمار کیا ہے۔ اور ہمیشہ ان کی صلاحیتوں کی تعریف کی ہے۔

مولوی عبدالحق

مولوی عبدالحق صاحب سے مہاراجہ شاد کے تعلقات کے بارے میں محمد مصلح الدین صاحب لکھتے ہیں:

"مولوی عبدالحق معتمد انجمن ترقی اردو کو حضرت شاد سے کوئی نفس

---

[1] شاد اقبال ص ۷۳

[2] " " ۷۵

برس پہلے سے تعارف حاصل تھا اور مولوی صاحب کو آنجہانی ہمیشہ "مولوی عبدالحق" یا "مولوی صاحب" سے یاد فرمایا کرتے تھے گو ان کی مراسلت باضابطہ موجود نہیں ہے مگر آنجہانی کے سپاس ناموں میں جہاں کہیں مولوی صاحب کو آنجہانی نے یاد کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قدر عزت کیا کرتے تھے" ع۱

مہاراجہ جس وقت اورنگ آباد گئے تھے مولوی صاحب نے کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے انھیں سپاس نامہ پیش کیا تھا۔ اس کے جواب میں مہاراجہ نے مولوی صاحب کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا اس کا اقتباس درج ذیل ہے:

"اورنگ آباد میں مولوی صاحب آپ نے جو کچھ کوشش اس کالج کو کامیاب بنانے سے متعلق کی ہے۔ وہ نہایت لائق قدر اور قابل تحسین ہے۔ آپ نے اورنگ آباد میں علمی فضاء کو قائم کرنے اور اس کو ترقی دینے میں حدود کالج سے باہر بھی جو کوشش کی ہے اس سے اہل ملک خوب واقف ہیں اور وہ اس کی قدر کرتے ہیں۔ علم کی ترقی میں آپ کا وجود ظاہر و باطن میں ہندوستان کی متعدد علمی خدمات کا ذمہ دار ہے .... اورنگ آباد کو اردو کا مستقر قرار دے کر جو علمی رونق اور اردو کے لئے بجا مرکزیت پیدا کر دی ہے وہ اس شہر کے لئے مایۂ ناز ہے جس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔" ع۲

مندرجہ بالا عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجہ کو مولوی عبدالحق کی علمی خدمات کا کس قدر صحیح اندازہ تھا۔ نیز اس سے مہاراجہ کی علم دوستی پر بھی روشنی پڑتی ہے مہاراجہ کی ادب نوازی کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے بہت سے ذی علم اور اہل قلم حضرات ان کے ادبی حلقہ میں شامل تھے۔

ع۱ مجلہ عثمانیہ مہاراجہ نمبر ص ۱۷۲

ع۲ " " " " ۱۷۳

مولوی عبدالحق سے مہاراجہ کی مراسلت یقیناً رہی ہوگی۔ لیکن اب کوئی خط ایسا محفوظ نہیں ہے۔ جس سے ان کے باہمی تعلقات پر مزید روشنی پڑتی ہو۔ البتہ مہاراجہ نے ایک مشاعرے کا ذکر کرتے ہوئے مرزا فرحت اللہ بیگ کو جو خط لکھا ہے اس میں مولوی صاحب کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"مرزا صاحب ایک مشاعرہ اسی نمونہ کا حیدرآباد میں بھی ہو جائے تو یادگار رہ جائے گا۔ انشاءاللہ میں آپ کو مدد دینے پر تیار ہوں۔ مولوی صاحب سے بھی کہئے کہ ان کی شرکت ضروری ہے۔"[1]

ہوش بلگرامی

ہوش بلگرامی ۱۹۱۱ء میں حیدرآباد آئے وہ رسالہ "ذخیرہ" کے ایڈیٹر تھے۔ یہ رسالہ حیدرآباد ہی سے شائع ہوتا تھا اس رسالہ میں مہاراجہ کے مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ ہوش سے مہاراجہ کے اچھے مراسم تھے۔ ہوش لکھتے ہیں:

"میں نے بھی ربع صدی تک مہاراجہ بہادر کے عادات و خصائل کا قریب سے مطالعہ کیا ہے۔ ان کی فطرت سے درس لیا ہے۔ ان کے ادبی ذوق سے لطف اٹھایا ہے۔ ان کے فی البدیہہ اشعار کی داد دی ہے اور ان کی تہذیب سے سبق لیا ہے۔ ان کے مشرقی آداب میں زمانۂ ماضی کو دیکھا ہے۔"[2]

مہاراجہ شاد کی اکثر تصانیف مثلاً سیر و سفر، ایمان شاد وغیرہ ان ہی کے اہتمام سے "ذخیرہ پریس" حیدرآباد دکن میں شائع ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ مہاراجہ کی مثنوی "جلوہ کرشن" پر ہوش نے مقدمہ بھی لکھا ہے جو اٹھارہ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں انھوں نے مہاراجہ کے ذوق شعری کو ان الفاظ میں سراہا ہے:-

"مہاراجہ بہادر کی امیرانہ طبیعت کو شاعری کے ساتھ بچپن سے لگاؤ ہے۔ مہاراجہ چندولال شاداں کا شادانی

---

[1] مجلہ عثمانیہ مہاراجہ نمبر ص ۳۱
[2] مشاہدات ص ۴۴

دربار شعرا سے بھرا رہتا تھا۔ جس میں نصیر دہلوی کے سے استاد سخن داد دیا کرتے تھے۔ مہاراجہ شاد کے شاعرانہ دربار میں بھی سرشار مست رہا کرتے تھے اور داغ بھی نوا سنج رہتے کہ ؎

آئے گی اردو زبان آتے آتے

جلیل و اختر بھی برسوں اسی خوان کرم کے زلہ ربا رہے ہیں ضیا کی ضیاء باریاں بھی مشاعروں کو چمکا دیا کرتی تھیں۔ اور محوی کی شاعرانہ محویت اب بھی ہر جمعہ کو نظر آجاتی ہے۔ ثاقب نے بھی اپنی پہلوانی کے شاعرانہ داؤ پیچ دکھائے ہیں اور غبار کی ضعیفی تو اب تک حضرت شاد ہی کے دامن سے لپٹی ہوئی ہے اور مشق سخن میں معروف بیگم کے بوڑھے غمزے اب بھی ناک پر انگلی رکھ کر طلائی چوڑیوں کا خیال پیدا کر دیتے ہیں۔ جہاں کی فضا ایسی شاعرانہ ہو وہاں تو غیر موزوں طبیعت بھی موزوں ہو جاتی ہے نہ کہ مہاراجہ شاد جنھوں نے آنکھیں کھولتے ہی گھر میں شاعری کا چرچا سنا، کیوں کر چپ رہتے میدان شعر میں بے تکان دوڑیں لگانا شروع کر دیں۔ قوالوں کے گلے ان کی غزلوں سے حرکت کرنے لگے۔ رباعیات و قطعات کی چار دیواری میں ان کی جستیں حیرت کرنے کے قابل ہو گئیں۔ قصائد میں ان کا زور بیان ٹپکنے لگا اور مثنوی سے واقعہ نگاری کی قابلیت معلوم ہونے لگی۔"[1]

مثنوی جلوہ کرشن کی شعری خوبیوں کو اجاگر کرنے کے بعد ہوش مقدمہ کے اختتام پر لکھتے ہیں:

"خدا حسن قبول دے اور زور بیان میں قوت، تا کہ آپ کے دماغ افکار سے دریائے شاعری ہمیشہ لطف اٹھاتی رہے۔"

---

[1] مقدمہ جلوہ کرشن

ایک خط میں تاجور نجیب آبادی کا تعارف کرانے کے بعد ہوش لکھتے ہیں :

"ان پر رشک اس لیے کرتا ہوں کہ یہ سرکار کی بارگاہ میں ہوں گے جہاں میں بھی حاضر رہا کرتا تھا۔ آہ! یاد ایام ... " ع۱

مہاراجہ شاد نے اپنے سفرناموں میں کئی جگہوں پر ہوش سے ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ "تفریح شاد" میں ایک جگہ لکھتے ہیں :

"پانچ بجے رام پال کنہیا لعل سیٹھ اور سید محمد حنیف صاحب وکیل آ گئے۔ ان سے باتیں کرتا رہا۔ ان کے جانے کے بعد سید ناظر الحسن ہوش بلگرامی سے ملا۔ ۶ بجے مع بچوں دامادوں اور وکیل صاحب کے دربار حضرت خواجہ میں حاضری دی۔ ... پھر ہوش صاحب سے ملا" ع۲

اسی سفرنامہ میں ۲۹ ستمبر سنہ ۱۹۲۴ء کو لکھتے ہیں :

"ہوش صاحب سے کچھ دیر باتیں کرتا رہا ... ۴ بجے مع ہوش صاحب دولہا راجہ اور بچوں کے ہز ہائنس کی ملاقات کو گیا ۸ بجے واپس ہوا۔ دولہا راجہ اور بچے ہوش صاحب کے ساتھ سینما کا تماشا دیکھنے گئے" ع۳

اسی طرح اور بھی کئی جگہوں پر ہوش صاحب کا ذکر کیا ہے۔ ہوش صاحب کے ساتھ بچوں کو مختلف تفریحی مقامات پر بھیجنے کا بھی ذکر ہے۔ نیز نواب صاحب رام پور کے اعزاز میں مہاراجہ نے ایک مرتبہ ڈنر دیا تھا۔ اس کا انتظام بھی ہوش صاحب کے ذمہ تھا۔

نرسنگ راج عالی

مہاراجہ شاد کے مقربوں میں نرسنگ راج عالی خصوصی حیثیت کے حامل تھے۔ مہاراجہ انھیں بے حد

ع۱ خط مخزونہ حیدری گشتی کتب خانہ

ع۲ تفریح شاد ص ۶۰

ع۳ " " ۷۹

عزیز رکھتے تھے۔ مہاراجہ کی تمام محفلوں میں عالی کی شرکت ضروری سمجھی جاتی تھی۔ مجلہ عثمانیہ کے مہاراجہ نمبر کے لئے عالی نے ایک طویل اور جامع مضمون لکھا ہے جس کا عنوان ہے۔ "حضرت شاداب کہاں عالی" اس مضمون میں انھوں نے مہاراجہ سے اپنے تعلقات پر وضاحت سے روشنی ڈالی ہے۔ عالی لکھتے ہیں:

"عالی جناب سر مہاراجہ آنجہانی کو نہ معلوم مجھ سے کیوں اتنی محبت تھی کہ وہ مجھے اپنا عزیز خیال فرماتے اور ہمیشہ مشفق و محب کے لقب سے افتخار بخشتے تھے۔ مجھے گھنٹوں ہمکلامی اور ہم نشینی کی عزت حاصل رہی ہے۔ میں انتہائے فخر کے ساتھ یہ عرض کر سکتا ہوں کہ میرا جتنا وقت مرحوم کی پر لطف اور امیرانہ صحبت میں صرف ہوا ہے۔ وہ شاید ہی کسی دوسرے کو ملیسر ہوا ہو۔ ہر دعوت، تقریب اور خوشی کے موقع پر مجھے ہمراہ رکھا۔ ہر تعزیت، بیماری اور تکلیف میں نزدیکی کا شرف بخشا۔ ان وسیع تعلقات کی وجہ سے اکثر ناواقف اشخاص مجھے مہاراجہ مرحوم و مغفور کا قرابت دار تصور فرماتے اور قرابت داری کی صراحت چاہتے۔ مجھ سے نہ کوئی رشتہ داری تھی نہ کوئی قرابت۔ البتہ محبت کا وہ مضبوط رشتہ غیر متزلزل اور مستحکم ہو گیا تھا جو ٹوٹ نہیں سکتا تھا۔ اور جس کو دنیا کی کوئی قوی سے قوی طاقت بھی مٹا نہیں سکتی تھی" ؎۱

عالی نے چونکہ مہاراجہ کو کافی قریب سے دیکھا تھا اس لئے انھوں نے مہاراجہ کی خانگی زندگی، سیرت، اور شخصیت پر غیر جانبداری سے قلم اٹھایا ہے اور جس انداز سے مہاراجہ کی مدح سرائی کی ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔

مہاراجہ شاد کی موت عالی کے لئے دلی صدمہ کا باعث ہوئی۔ انھوں نے رنج و غم کا اظہار ایک مرثیہ اور چند رباعیات و قطعات میں کیا ہے۔ یہ مجموعہ "غم احباب شاد"

؎۱ مجلہ عثمانیہ مہاراجہ نمبر ص ۲

کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ایک رباعی بطور نمونہ ذیل میں دی جاتی ہے:

سچ ہے کہ جہاں میں شادمانی کب تک
سچ ہے کہ جہاں میں زندگانی کب تک
سونی محفل ہے عالی اک شاد بغیر
بے صاحب خانہ مہمانی کب تک[1]

مرثیہ میں بھی عالی نے مہاراجہ کے اوصاف حمیدہ کا ذکر کیا ہے۔ ان کی ملکی و سیاسی خدمات کی تعریف کی ہے اور بے تعصبی اور رواداری کو سراہا ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ نقل کئے جاتے ہیں جن سے عالی کی گہری عقیدت کا اندازہ ہوتا ہے:

آپ کو اب کہاں سے لاؤں میں
سر پہ آنکھوں پہ پھر بٹھاؤں میں
سرگزشت اپنی کہہ سنا دوں میں
ایسی قسمت کہاں سے پاؤں میں
حضرت شاد اب کہاں عالی

آپ تھے آفتاب حضرت شاد
آپ تھے ماہتاب حضرت شاد
دُرِ معنی کی آب حضرت شاد
اور تھے لاجواب حضرت شاد
حضرت شاد اب کہاں عالی[2]

آخر میں قطعہ تاریخ ہے جس کے آخری شعر سے مہاراجہ کی تاریخ وفات نکلتی ہے:

لکھو خونِ دل سے یہ تاریخ عالی
دیا آہ مہراج نے داغ جاوید
۵۹ ۵ ۱۳

عماد الملک نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی ۱۸۷۳ء میں حیدرآباد آئے۔ کافی عرصہ تک حیدرآباد میں دولت آصفیہ کے اکثر معزز عہدوں پر مامور رہے[3]۔ نواب صاحب سے مہاراجہ کے دیرینہ مراسم تھے۔ مرتب کتاب "مہاراجہ کشن پرشاد" نے لکھا ہے کہ تقریباً چالیس پچاس سال تک ان دونوں کے روابط رہے۔ وقتاً فوقتاً ملاقاتیں بھی ہوتیں اور خط و کتابت کا سلسلہ بھی قائم تھا۔ عماد الملک بہترین ادیب تھے۔ انگریزی اور عربی میں اچھی لیاقت رکھتے تھے۔ ان دونوں کے بیشتر خطوط محفوظ ہیں جن سے ان کے پرخلوص روابط کا اندازہ ہوتا ہے۔ عماد الملک مہاراجہ کے

---

[1] "غم احباب شاد" ص ۱
[2] ص ۲۲
[3] تاریخ ادب اردو مترجمہ رام بابو سکسینہ ص ۸۲

طرز تحریر سے متاثر تھے اور ان کی علمی اور ادبی صلاحیتوں کو مانتے تھے۔ مہاراجہ نے عماد الملک کو ایک قطعہ لکھ بھیجا تھا۔ جس کے جواب میں وہ لکھتے ہیں:

"مرحمت نامہ مشکیں ختامہ معہ قطعہ تاریخ عروسی نے مشرف بہ ورود فرمایا۔ شکریہ عنایات بے غایات قبول ہو۔ قطعہ تاریخ نہایت فصیح و بلیغ ہے۔ جناب والا تو کہنہ مشق ہیں۔ جناب والا کے قلم سے نظم یا نثر جو کچھ حوالہ کاغذ ہوتا ہے وہ عمدہ ہوتا ہے" ع[1]

مہاراجہ کا ایک خط جو عماد الملک کے نام ہے ذیل میں اس کا اقتباس دیا جاتا ہے تاکہ مہاراجہ کے تاثرات اور جذبات کا صحیح اندازہ ہو سکے:

"جناب کا نامۂ کرم معہ دو کتب کے پہنچا، ممنون کیا۔ آپ نے اپنی قدیم مہربانیوں اور تعلقات کے لحاظ سے فقیر شاد کے متعلق حسن ظن رکھا ہے۔ یہ آپ کے بزرگانہ اشفاق کی دلیل ہے۔ فقیر شاد آپ کو کیا بلحاظ سن و سال اور آپ کے خصائل حمیدہ اور اپنے مرتبہ تلمذ و نیازمندی کے نہ صرف کرم فرما سمجھتا ہے بلکہ اپنا واجب العزت بزرگ سمجھتا ہے۔ ع[2] اس پچاس سال کے عرصہ میں حیدرآباد میں جو انقلابات ہوئے ان کے اثرات سے محفوظ رہنا یہ آپ کی دانشمندی اور محتاط طبیعت کا نتیجہ ہے۔ ...... فقیر کا بھی بہت جی چاہتا ہے کہ گاہے ماہے جناب کے فیض صحبت سے مستفیض ہوں۔ مگر بار خاطر ہونے کا خیال ہر وقت سد راہ ہوتا ہے۔ اگر میری حاضری مخل اوقات نہیں سمجھی جاتی تو مہینہ میں کم از کم ایک، زیادہ سے زیادہ دو مرتبہ آ کر صرف آپ کی مزاج پرسی کیا کروں۔ یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔" ع[3]

عماد الملک کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مہاراجہ سے ملنے کے لئے

ع[1] خط مخزونہ حیدری گشتی کتب خانہ حیدرآباد دکن

ع[2] یہ عبارت اسی طرح درج ہے۔

ع[3] خط مخزونہ حیدری گشتی کتب خانہ حیدرآباد دکن

بے چین ہیں۔ اپنی خرابی صحت کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے اشتیاق ملاقات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"جناب والا کوئی دن ایسا نہیں گزرتا کہ جناب کی یاد دل میں جاگزیں نہ ہوتی ہو۔ سخت حسرت و افسوس ہوتا ہے کہ ایک مدت سے جناب کی ملاقات سے مشرف نہیں ہوا۔ پاؤں کے درد نے اس قدر مجبور کر رکھا ہے کہ خود حاضر نہیں ہو سکتا۔ جناب والا خوب جانتے ہیں کہ جس قدر وسیع و عمیق تعلق میرے دل کو جناب والا کے ساتھ ہے وہ کسی اور کے ساتھ نہیں ہے۔" عہ۱

تاجور نجیب آبادی

مہاراجہ شاد سے تاجور نجیب آبادی کے روابط کے سلسلے میں محمد مصلح الدین صاحب لکھتے ہیں کہ سنہ ۱۳۳۲ف م ۱۹۲۳ء میں ان دونوں کی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ اور مہاراجہ کا سفرنامہ "سیرِ پنجاب" بھی تاجور کی زیرِ نگرانی شائع ہوا تھا۔ موصوف کے اس بیان کی تصدیق تاجور کے اس خط سے ہو جاتی ہے جو انھوں نے حیدرآباد آ کر مہاراجہ کو لکھا تھا۔

مہاراجہ کے خطوط کی جو فائیلیں دستیاب ہوئی ہیں ان میں مہاراجہ کے نام تاجور کا پہلا خط ۳۰ جولائی سنہ ۱۹۲۴ء کا لکھا ہوا موجود ہے۔ اس خط میں انھوں نے مہاراجہ سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا ہے۔ اس خط کے ساتھ انھوں نے ہوش بلگرامی کا تعارفی خط بھی بھیجا ہے۔ یہاں تاجور کا خط نقل کیا جاتا ہے تاکہ مہاراجہ کے بارے میں ان کے تاثرات کا صحیح اندازہ ہو سکے:

"سرکارِ عالی جاہ مہاراجہ بہادر بالقابہ!

نیاز مندی۔ جناب والا کے نام حضرت ہوش بلگرامی کا تعارفی خط ارسالِ خدمت ہے۔ میں اپنے مکرم نواب صمد یار جنگ بہادر کے پاس مقیم ہوں۔ مختلف احباب کی زبانی جناب کے صفات حدیثِ متواتر کی حیثیت میں مجھ تک پہنچے ہیں۔ اس لئے شوقِ

عہ۱ خط مخزونہ حیدری گشتی کتب خانہ حیدرآباد دکن

زیارت سے اپنے دل کو معمور پاتا ہوں۔ باریابی کی اجازت پاؤں تو شہپر شوق سے اڑ کر حاضر ہوں۔ امیر الامرا نواب نجیب الدولہ کی بقیۃ السیف اولاد میں سے ہوں یعنی شکستہ حالی میں بھی خودداری کا خلل دماغ میں باقی ہے۔ اس لئے امیر مرحوم کی زبان میں ؎

"خدا کے گھر میں بھی نہ جائیں گے بے بلائے ہوئے"

عقیدت کیش

تاجور نجیب آبادی

ایڈیٹر "ہمایون" و پروفیسر ڈی ایس کالج لاہور

خیرت آباد (دکن)

اس خط کے جواب میں مہاراجہ نے اپنے منتظم سید صادق حسین غبار کو لکھا ہے کہ تاریخ معززہ پر تاجور صاحب کو ان کے ہاں آنے کے لئے اطلاع دی جائے۔ اور چائے وغیرہ کا بھی انتظام کیا جائے۔

تاجور نے ایک اور خط میں مہاراجہ سے درخواست کی ہے کہ جہاں وہ دوسرے رسالوں میں اپنے مضامین اور غزلیات وغیرہ بھیجتے ہیں۔ وہیں مخزن کے لئے بھی اپنی ادبی تخلیقات روانہ کریں[1]۔ مہاراجہ نے اس خط کے تعلق سے اپنے سکریٹری کو ہدایت کی ہے کہ "مخزن" ان کے نام جاری کروائیں۔ اور تاجور صاحب کو مطلع کریں کہ رسالہ دیکھنے کے بعد مضامین بھیجے جائیں گے۔[2]

آغا شاعر قزلباش

آغا شاعر قزلباش کو مہاراجہ ماہانہ کچھ رقم بطور امداد دیا کرتے تھے۔ اور مہاراجہ کی ادبی نشستوں میں انھیں اکثر مدعو کیا جاتا تھا[3]۔ آغا شاعر قزلباش کا ایک طویل خط مہاراجہ کے نام ہے جس میں انھوں نے اپنی ایک کتاب کی اشاعت کے لئے مہاراجہ سے رقمی امداد طلب کی ہے۔

---

[1] خط مخزونہ حیدری گشتی کتب خانہ حیدرآباد دکن

[2] فائل مخزونہ حیدری گشتی کتب خانہ حیدرآباد دکن

[3] مجلہ عثمانیہ مہاراجہ نمبر ص ۱۹۹

خط کا اقتباس ذیل میں دیا جاتا ہے:

"سرکار معظم قدر دان سخن مدظلہ العالی۔

تسلیم بعد تکریم۔ ایک عرصہ سے صحت دری مزاج کے مژدہ سے محروم ہوں۔ "شراب الصالحین" یعنی منظوم ترجمہ رباعیات حکیم عمر خیام نیشاپوری کو رباعی کا جواب رباعی میں اسی قوت سے تین برس کامل خون جگر ٹپکا کر پورا کیا ہے۔ اگر یہ چیز میری زندگی میں چھپ گئی تو حضور ملاحظہ فرمائیں گے کہ اردو لٹریچر میں کیا روح پھونک دی گئی ہے۔ ... اس نا قدر زمانے میں کوئی علمی امداد کرنے کرنے والا بھی نہیں۔ حضور سے بھی عرض کروں کہ جلد سے جلد جو حضور پسند فرمائیں کچھ دست کرم کو جنبش دے سکیں گے؟ عالی جاہ! میں خوب جانتا ہوں کہ اس زمانے میں ایسی علمی مراعات کی کس کو غرض پڑی ہے۔ مگر ہندوستان میں آپ ہی جیسی قدر شناس چند ہستیاں رہ گئی ہیں۔ اگر انہیں سے نہ عرض کیا جائے تو برائے خدا بتا دیجئے کہ ان جواہر پاروں کو ہم لوگ کہاں لے جائیں۔ ہم لوگ چراغ سحر ہیں۔ چند روز کے بعد یہ بیکار ہستیاں بھی اٹھ جائیں گی۔ پھر نہ یہ چیز ہوگی نہ گاہک۔ سرکار والا۔ انصاف کریں! اگر یہ چیز خوانخواستہ نہ چھپی اور میں مر گیا تو پھر تین برس کامل جو دماغ کاہی کی ہے وہ اکارت ہی گئی نا ۔ اس لئے خیر نہیں کوئی قرضہ نہیں۔ اگر سرکار اس علمی امداد کو حیات جاودانی خیال فرما سکیں تو سب سے پہلی فرصت میں جو کچھ امداد ہو سکے بذریعہ تار کرامت فرما دیں۔ عاجز کمترین چراغ سحر

افسر الشعرا

آغا شاعر قزلباش دہلوی"[۱]

اس قدر طویل عریضہ پر بھی مہاراجہ رقمی امداد دینے سے قاصر رہے۔ انھوں نے غبار صاحب سے لکھوا دیا کہ آج کل اسٹیٹ زیر بار ہے اس لئے وہ رقمی امداد سے معافی چاہتے ہیں۔ اتنی مہربانی مزید کی کہ آغا شاعر قزلباش کو مطلع کر دیا کہ کتاب چھپنے کے بعد چھ نسخے ضرور لے لئے جائیں گے ۔ آغا قزلباش کی کتاب کی چھپوائی کے لئے مہاراجہ نے اپنی مجبوریوں کے تحت

---

[۱] خط مخزونہ حیدری گشتی کتب خانہ حیدر آباد دکن

رقمی امداد دینے سے معذرت چاہی۔ لیکن یہ عنایت کیا کم تھی کہ وہ انھیں ماہانہ مشاہرہ دیا کرتے تھے۔

اختر مینائی

اختر مینائی سنہ ۱۳۱۸ھ م ۱۹۰۰ء میں حیدر آباد آئے[۱] ان کے بارے میں مرتب کتاب "مہاراجہ کشن پرشاد" نے لکھا ہے کہ ان کے حیدر آباد آنے کے بعد مہاراجہ نے عرصہ تک ان کی سرپرستی کی اور ایک مقررہ رقم بھی انھیں دیا کرتے تھے[۲]۔ "ایوان شاد" کے مشاعروں میں جو غزلیں پڑھی جاتی تھیں انھیں "بزم شاد" کے نام سے گلدستہ کی صورت میں شائع کر دیا جاتا تھا۔ چنانچہ بزم شاد کے نسخوں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اختر مینائی بھی مہاراجہ کے مشاعروں میں حصہ لیا کرتے تھے۔[۳]

"خمکدہ رحمت" کے اختتام پر اختر مینائی نے تقریظ اور تاریخی قطعات لکھے ہیں۔ تقریظ میں انھوں نے امیر مینائی کی نعت گوئی کی تعریف کرتے ہوئے بتایا ہے کہ مہاراجہ بھی امیر مینائی کے کلام سے متاثر تھے۔ اختر مینائی لکھتے ہیں:

"وزارت پناہ کے دیوان میں بھی وہی خصوصیت پائی جاتی ہے اور حق یہ ہے کہ اس گویائی کا رنگ امیر کے رنگ سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ جناب مصنف نے امیر مینائی کا کلام بہت دلچسپی اور واہیت سے دیکھا اور سنا ہے"[۴]

"چنچل نار" کے اختتام پر مختلف لوگوں کے کہے ہوئے تاریخی قطعات ہیں۔ ان میں اختر مینائی نے بھی تاریخی قطعہ لکھا ہے۔ جو سات اشعار پر مشتمل ہے۔ آخری شعر درج ذیل ہے ؎

ناول یہ کاہے کو ہے غنچہ کھلا ہوا[۵]   تاریخ کا بھی مصرعہ اختر ہے کیا شگفتہ
۱۳۳۰ھ

۱؎ یادگار ضیغم (مخطوطہ) ص ۲۷
۲؎ مہاراجہ کشن پرشاد ص ۲۲۸
۳؎ "بزم شاد" مشاعرہ ایوان شاد منعقدہ ۲۵ شعبان سنہ ۱۳۴۷ھ
۴؎ خمکدہ رحمت ص ۱۹۵
۵؎ چنچل نار ص ۳۸۲

عزیز یار جنگ عزیز یار جنگ سے مہاراجہ کے خوشگوار تعلقات کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ وہ اُن کے اکثر مشاعروں میں حصہ لیا کرتے تھے۔ "بزم شاد" میں ان کی غزلیں شائع ہوا کرتی تھیں۔ [1]

ترک علی شاہ ترکی ڈاکٹر زور ترکیؔ کے بارے میں لکھتے ہیں :

"ترکیؔ ۱۳۰۹ھ میں حیدرآباد آئے اور وقارالامرا کے یہاں باریاب ہوئے۔ انھوں نے ۱۰۰ روپیہ منصب مقرر کر دیا۔ بعد میں مہاراجہ شاد کے ایسے گہرے رفیق اور مصاحب شفیق بنے کہ آخر وقت تک ان کی محفلوں میں ناقد اور محتسب کے فرائض انجام دیتے رہے"۔ [2]

مہاراجہ شاد نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھا ہے کہ مولوی نورالضیا صاحب ضیاؔ کی غیر موجودگی میں وہ ترکیؔ ہی سے اپنی فارسی غزلوں پر اصلاح لیا کرتے تھے۔ چنانچہ مہاراجہ نے ترکیؔ کی علمی و ادبی صلاحیتوں کو ان الفاظ میں سراہا ہے :

"یہ پنجاب کے رہنے والے ہیں۔ شاعر اچھے معلوم ہوئے۔ یہ موروثی شاعر ہیں۔ ناطق مکرانی کے شاعری میں تلمذ کہلائے جاتے ہیں۔ فارسی اور عربی کے میخانہ میں جام جہاں نما کے بادہ خوار سمجھے جاتے ہیں۔ دیکھنے والے والے غوث علی شاہ پانی پتی کے ہیں کلام سلجھا ہوا ہے۔ تحقیقات اچھی ہے۔ صاحب دیوان اور صاحب تصانیف بھی ہیں۔ مزاج صلح کل، مشرب درویشانہ ہے"۔ [3]

ترکیؔ نے مہاراجہ کے ناول "چنچل نار" پر ایک فارسی قطعہ لکھا ہے جو ۱۲۵ اشعار پر مشتمل ہے۔

عبدالجبار خاں آصفی عبدالجبار خاں آصفیؔ فارسی اور اردو کے بلند پایہ شاعر تھے۔ مرتب کتاب "مہاراجہ کشن پرشاد" نے لکھا ہے

---

[1] مجلہ عثمانیہ مہاراجہ نمبر ص ۱۶۸

[2] داستان ادب حیدرآباد ص ۸۹

[3] خود نوشت سوانح عمری مہاراجہ بہادر مخزونہ حیدری گشتی کتب خانہ

کہ مہاراجہ اپنی نارسی نظموں پر نظر ثانی اور معائنہ وغیرہ کا کام ان ہی سے لیا کرتے تھے۔ [1]
مجھے خطوط کی جو فائلیں دستیاب ہوئی ہیں ان میں عبدالجبار خاں آصفی کے بھی کئی خطوط ہیں۔
ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مہاراجہ کے کلام پر اصلاح دیا کرتے تھے۔ ایک خط میں مہاراجہ کو لکھتے ہیں:

"مثنوی دیکھ چکا ہوں۔ انشاء اللہ تعالیٰ کل تک نظر ثانی کی تکمیل ہو کر جانب کے تک ملاحظہ انور میں پیش کر دی جائے گی۔ شعر گوئی آسان ہے مگر اس پر نظر ڈالنی مقتضی تاخیر ہے کہ الفاظ کی تلاش اور ان کی نشست بجائے دیگر الفاظ دقت طلب امر ہوتا ہے سرکار پر یہ امر روشن ہے" [2]

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

"اب اشعار کی حالت سرکار نے بہت بدل دی ہے اگر چندے یوں ہی مشغلہ رہا تو بہت جلد اساتذہ کے مراتب پر پہنچنا آسان ہو جائے گا ہر چیز کی مشق قوت انسانی کو بڑھاتی ہے۔" [3]

اس طرح اور کئی خطوط میں عبدالجبار خاں آصفی نے مہاراجہ کے کلام پر نظر ثانی کا ذکر کیا ہے۔ اور ان کی شعری صلاحیتوں کی داد دیتے ہوئے ان کی ہمت افزائی کی ہے۔

عبدالماجد دریابادی

عبدالماجد دریابادی جامعہ عثمانیہ میں دارالترجمہ کے رکن کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ ایسا ذی علم اور ادب دوست آدمی حیدرآباد میں رہے اور مہاراجہ شاد سے اس کے مراسم نہ پیدا ہوں۔
ماجد صاحب کے حیدرآباد سے جانے کے بعد بھی عرصہ تک ان دونوں میں خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ ان حضرات کے جو چند خطوط دستیاب ہوئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں آپس میں کس قدر خلوص تھا۔ ان کے خطوط میں عموماً علمی اور ادبی دلچسپی کی باتیں ہوتی تھیں۔ عبدالماجد دریابادی اپنے ایک خط میں مہاراجہ کو لکھتے ہیں:

"میرے ایک مہربان مولوی صبغتہ اللہ شہید ایڈیٹر "النظامیہ" اپنے

---

1. مہاراجہ کشن پرشاد ص ۲۲۸
2. خط مخزونہ حیدری گشتی کتب خانہ حیدرآباد
3. " " " "

رسالہ کا پیمبر نمبر ربیع الاول میں بہت آب وتاب سے نکالنے والے ہیں۔ اگر کوئی نعتیہ نظم یا مضمون انھیں مرحمت ہو سکے تو چھپ کے موجب افتخار ہوگا۔" ۱؎

اس کے جواب میں مہاراجہ نے ماجد صاحب کی فرمائش پر دو نعتیہ نظمیں بھیجی تھیں۔

عبدالماجد دریابادی مہاراجہ کو "ماجد نواز حضرت شاد" سے مخاطب کرتے اور مہاراجہ انھیں "شاد نواز" لکھا کرتے۔ عبدالماجد دریاآبادی نے ایک خط میں صوفیا کا ذکر کرتے ہوئے ایک حاجی صاحب کی تعریف کی ہے اور انھیں کامل صوفی قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"اس طرف حاجی صاحب دیوہ کی ایک مفصل لائف دیکھنے میں آئی۔ اس کا دل پر خاص اثر ہوا۔ میں اپنے فہم و خیال کے مطابق جو بات صوفی میں ڈھونڈتا تھا وہ مسلمانوں کے ہاں اب تک بہت کم ملتی تھی۔ ہندوؤں کے ہاں کثرت سے ملتی تھی۔ وہ حاجی صاحب کے ہاں مل گئی۔ میں کسی صوفی کا قائل نہ تو اس کی کرامات کی بناء پر ہوتا ہوں (اس قسم کے عجائب وغرائب تو علوم مادی کے ماہرین بھی ظاہر کر سکتے ہیں) اور نہ اس کی عبادات کی بناء پر ہوتا ہوں (کیونکہ صدہا تہجد گزاروں کو دیکھ چکا ہوں جو ہمہ تن بندگان نفس ہیں) میں جس شے کی تلاش کرتا ہوں وہ محبت، فنائیت اور نفس کی غلامی سے آزادی ہے۔ میں اس کیفیت کی تلاش کرتا ہوں جو گوتم بدھ، حضرت مسیح، سری کرشن، شمس تبریز اور مولانا روم میں تھی۔ یہ بات میں نے اس زمانے کے فقرا میں حاجی صاحب ہی میں پائی۔ گو ان کے علاوہ اور بھی برگزیدہ نفوس ہماری نظر سے مخفی ہوں گے" ۲؎

اس خط کا جواب جو مہاراجہ نے دیا وہ بھی طوالت رکھتا ہے۔ یہاں خط کا اقتباس دیا جاتا ہے۔

"شاد بھی ایک حد تک آپ کا ہم خیال ہے۔ لیکن اس عالمگیر انحطاط قومی و ازدیاد خود غرضی کی اصلاح کے لئے قوت جسمانی اور اسباب مادی

۱؎ و ۲؎ خط مخزونہ حیدری گشتی کتب خانہ حیدرآباد دکن

کے ساتھ قوت روحانی کی بھی ضرورت اور سخت ضرورت ہے۔ قوت روحانی سے مراد میری اعجاز یا کرامت سے نہیں بلکہ ہمت۔ شجاعت، ایثار، نفس کی غلامی سے آزادی، بے تعصبی، بے غرضی، محبت، ہمدردی، عدل گستری مستقل مزاجی، یکسوئی کی ضرورت ہے۔ لیکن آجکل ان الواب کی تعلیم کے لئے کوئی معلم نظر نہیں آتا۔ اگر کچھ تعلیم کی جھلک نظر آتی ہے تو حضرات صوفیا میں۔ افسوس ہے کہ ہم لوگ آج کل صرف ظاہری اسباب اور دنیائے نظر فریب کے دلدادہ ہیں۔ اور ہوتے جارہے ہیں۔" [۱]

ماہر القادری

مہاراجہ کے زمانے میں ماہر القادری ایک جوان سال شاعر تھے۔ مہاراجہ ان کی قدردانی اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ماہر القادری کے بارے میں ڈاکٹر زور لکھتے ہیں:

"مہاراجہ کی محفل شعرا میں منظور حسین ماہر القادری شاید سب سے کم عمر رکھتے تھے۔ وہ سنہ ۱۹۲۸ء میں سیر و سیاحت کی غرض سے حیدرآباد آئے۔ اور مہاراجہ کے یہاں باریاب ہوئے تو انھوں نے ایسی قدردانی کی کہ یہ پھر حیدرآباد میں رہ پڑے اور مہاراجہ کی وفات کے بعد اس شہر کو چھوڑا۔" [۲]

مصلح الدین صاحب نے اپنے مضمون میں ان دونوں کے تعلقات کے بارے میں لکھا ہے:

"حضرت شاد ماہر کو بہت عزیز رکھا کرتے تھے۔ آخری زمانہ میں یعنی ۱۹۲۸ء میں ان سے تعارف ہوا۔ اور جب وہ حیدرآباد میں مقیم ہو گئے تو روزانہ حضرت شاد کی صحبتوں میں شریک ہوتے اور اپنے کلام کی داد حاصل کرتے تھے۔ ماہر پر آنجہانی کی نوازشیں اکثر شامل رہی ہیں۔ سنتے ہیں کہ شاد انھیں بھی اپنے جیب خاص سے کچھ سرفراز کرتے تھے۔" [۳]

مہاراجہ کے انتقال کے بعد ماہر القادری نے ایک مضمون "یمین السلطنت کی موت" کے عنوان سے لکھا تھا۔ اس میں انھوں نے وضاحت کی ہے کہ مہاراجہ سے ان کی پہلی ملاقات

۱۔ خط مخزونہ حیدری گشتی کتب خانہ حیدرآباد دکن

۲۔ داستان ادب حیدرآباد ص ۱۷۰

۳۔ مجلہ عثمانیہ مہاراجہ نمبر ص ۱۶۸، ۱۶۹

۱۹۲۸ء میں ہوئی۔ مہاراجہ نے ان سے غزل سنانے کی فرمائش کی۔ غزل سننے کے بعد مہاراجہ کے جو تاثرات تھے اور ان تاثرات سے ماہرالقادری نے مہاراجہ کی فطرت اور شخصیت کا جو اندازہ لگایا تھا۔ اسے ماہرالقادری ہی کے الفاظ میں لکھا جاتا ہے:

"میں نے غزل سنانی شروع کی۔ مہاراجہ نے ہلکی سی جھرجھری لی اور ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپکنے لگے۔ ادھر برسات کی رم جھم ہو رہی تھی اور ادھر یمین السلطنت کی آنکھیں موتی لٹا رہی تھیں۔ اتنی قیمتی داد بہت ہی کم میسر آتی ہے۔ اس دن مجھے اس بات کا احساس کہا ہوا کہ میرے اشعار جاہ و دولت کی آنکھوں کو بھی اشکبار کر سکتے ہیں۔ مگر یہ غالباً خودی کی نمود اولین تھی۔ میرے اشعار سے زیادہ مہاراجہ بہادر کا درد مند قلب کارفرما تھا ... اس کے بعد ایک اور غزل سنانے کے لئے ارشاد ہوا۔ میں نے دوسری غزل سنائی۔ رخصت ہوتے وقت فرمایا کہ آیا کیجئے۔ میں اپنی قیام گاہ کو تاثرات کا ایک طوفان لے کر واپس ہوا۔"

ماہرالقادری نے مہاراجہ کی موت پر ایک نظم بھی لکھی تھی۔ جس سے ان کے گہرے تاثرات غم کا اندازہ ہوتا ہے۔ نظم کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

اے مہاراجہ یمین السلطنت — چشم پرنم ہے دکن تیرے لئے
کس قدر ہے بے قرار و سوگوار — انجمن کی انجمن تیرے لئے
اب بھی تیری راہ تکتے ہیں فقیر — خون روتا ہے وطن تیرے لئے
آج تک اس روز سے بے چین ہیں — موجۂ گنگ و جمن تیرے لئے
کون دے گا ان کے اب جوہر کی داد — نوحہ خواں ہیں اہل فن تیرے لئے
کس قدر بے تاب ہے بے چین ہے — وہ نزار جن بھون تیرے لئے

نظم کا آخری شعر یہ ہے:

محفلِ ہستی سے تو کیا اٹھ گیا — وضعداری کا جنازہ اٹھ گیا[1]

نیاز فتح پوری

نیاز فتح پوری سے مہاراجہ کے تعلقات کا اندازہ ان دونوں کے خطوط سے ہوتا ہے جو وقتاً فوقتاً لکھے گئے ہیں۔ ان دونوں کے کئی خطوط

---
[1] مجلہ عثمانیہ مہاراجہ نمبر ص ۱۰۴

دستیاب ہوئے ہیں۔ جن میں مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال کیا گیا ہے۔

نیاز فتح پوری کی مہاراجہ سے پہلی ملاقات سنہ ۱۹۱۸ء میں ہوئی۔ اس کے بعد ملاقات اور خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ جس زمانے میں نیاز فتح پوری نے اپنے خطوط میں مہاراجہ سے ملنے کا بار بار اشتیاق ظاہر کیا ہے اس زمانے میں شہر حیدرآباد میں طاعون کثرت سے پھیلا ہوا تھا۔ مہاراجہ خود نقل مقام کر چکے تھے۔ اس صورت میں نیاز صاحب کے آنے کی خواہش پر مہاراجہ متردد ہو جاتے تھے کہ کس طرح ان کی میزبانی کا اہتمام ہو سکے گا۔ نیاز فتح پوری اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"غالباً جناب ہوش بلگرامی کی تحریر سے حضرت کو معلوم ہوا ہوگا کہ میری آرزوئے قدم بوسی جسے عرصے سے دل میں لئے ہوئے ہوں اب تکمیل کے لئے بے تاب ہے اور اخیر فروری میں حاضری کا ارادہ استوار ہو چکا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ روانہ ہوں ضروری ہے کہ حضور کو بھی اس کی اطلاع دوں اور اجازت باریابی حاصل کر لوں ... خدا کرے کہ بندگان ہمایون کی طرف سے جلد فرمانِ باریابی حاصل ہو اور میں اس سعادت سے جلد بہرہ یاب ہو سکوں۔" [۱]

اس خط پر مہاراجہ شاد نے اپنے منتظم سید صادق حسین غبارؔ کو جو نوٹ لکھا ہے وہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ مہاراجہ لکھتے ہیں:

"غبار صاحب!

کیا جواب دیا جائے۔ نیاز صاحب آئیں گے تو ضرور مہمان کرنا ہوگا۔ کوئی مکان اس قابل نہیں ہے۔"

نیاز فتح پوری کے بعض خطوط ایسے بھی ہیں جن میں انھوں نے مہاراجہ سے درخواست کی ہے کہ وہ ان کی ملازمت وغیرہ کے سلسلہ میں متعلقہ اصحاب کو سفارشی خطوط لکھیں۔ مہاراجہ نے ہر بار اس کی تکمیل کی ہے اور جس حد تک ممکن ہو سکے ان کی مدد کرنے کی کوشش کی ہے۔ نیاز فتح پوری مہاراجہ سے حد درجہ متاثر تھے۔ ان سے خلوص رکھتے تھے۔ اور ان کا ادب کرتے تھے۔ مہاراجہ کو اکثر "سرکار والا"

---

[۱] خط مخزونہ حیدری گشتی کتب خانہ حیدرآباد دکن

سے مخاطب کرتے تھے۔ ایک خط میں مہاراجہ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے :

"میں یہاں پہنچ گیا۔ لیکن اس حال میں کہ میرا ریشہ ریشہ سرکار کے خسروانہ الطاف و کرم سے گراں بار ہے۔ اور میں حیران کہ اپنے جذبات نیازمندی کا اظہار کن الفاظ میں کروں۔ حقیقت یہ ہے کہ سرکار والا کی ذات اس وقت نہ حیدرآباد بلکہ سرزمین ہند میں ایک ایسی عجیب و غریب ذات ہے کہ اگر آج تمام لوگ اس کے بلند اخلاق کو اپنے سامنے رکھیں تو دنیا پھر کھوئے ہوئے امن و سکون کو واپس لاسکتی ہے۔ کسی شخص میں کوئی خوبی ہوتی ہے اور کسی میں کوئی۔ لیکن اتنی صفات حسنہ کا اجتماع حقیقت ہے کہ فطرت کا اعجاز ہے۔" ع۱

نیاز فتح پوری مہاراجہ کی تصنیفات کی اشاعت کا کام بھی کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مہاراجہ کی مثنوی "پریم درپن" کو بڑے اہتمام سے طبع کروایا تھا۔ نیاز صاحب لکھتے ہیں :

"پریم درپن کا بڑا کام ختم ہوچکا۔ یعنی سات بلاک تصاویر کے تیار ہوچکے۔ کتابت ہورہی ہے۔ کوشش کر رہا ہوں کہ جلد از جلد اس کو لے کر بارگاہ گرامی میں حاضر ہوسکوں۔ ... ... اگر ارشاد ہو تو "جلوہ کرشن" کی طباعت کا بھی انتظام اسی پیمانہ پر شروع کردیا جائے۔" ع۲

جوش

جوشؔ سے بھی مہاراجہ کے خاص مراسم تھے۔ آپس میں خط و کتابت بھی ہوتی تھی۔ لیکن جوش کے صرف دو خطوط دستیاب ہوئے ہیں۔ اور مہاراجہ شاد کے صرف ایک خط کا مسودہ دستیاب ہوا ہے۔ "رقعات شاد" میں مہاراجہ کا کوئی خط جوش کے نام نہیں ملتا۔ تاہم جو کچھ مواد دستیاب ہوا ہے۔ اس سے ان دونوں کے تعلقات کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ جوشؔ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"سرکار والا تبار مد ظلہ العالی۔

تسلیم مع التکریم۔

ع۱ و ع۲ خط مخزونہ چیدری گشتی کتب خانہ حیدرآباد دکن

افسوس ہے کہ اس سے قبل عریضہ نہ لکھ سکا۔ کوئی خاص عذر نہیں کر سکتا۔ بجز انتشارِ طبع کے جواب جزوِ حیات بن کر رہ گیا ہے۔ اور جس نے کسی کام کے قابل نہیں رکھا ہے۔ سرکار کا مزاج کیسا ہے؟ صاحبزادیوں کی طبیعت بغیب دشمناں ناساز تھی خدا کرے اب صحت ہو چکی ہو۔ امید کہ سرکار اپنی خیریت سے معہ متعلقین جلد مطلع فرما کر ممنون ہونے کا موقع دیں گے۔ اپنی خیریت کیا لکھوں اس میں خیر و عافیت کوئی معنی رکھتی ہو تو اچھا ہوں۔ خدا کا شکر ہے۔" ۱؎

اس کے جواب میں مہاراجہ نے ایک طویل خط لکھا ہے۔ جس کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے۔ اس خط میں انھوں نے اپنے خانگی حالات اور بچوں کی بیماری کا ذکر کرتے ہوئے زندگی اور موت کے فلسفہ پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ جوشؔ دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

"مجھے ایک اور خاص معاملہ میں سرکار سے کچھ بات چیت کرنا ہے۔ جو سرکار ہی کے متعلقین کی بابت ہے۔"

جوشؔ کے بارے میں ڈاکٹر زورؔ نے لکھا ہے کہ مہاراجہ کے مشاعروں اور ادبی جلسوں میں جوشؔ کی شرکت سے زندہ دلی اور شگفتگی پیدا ہو جاتی تھی۔ ۲؎

O

۱؎ خط مخزونہ حیدری گشتی کتب خانہ حیدرآباد دکن

۲؎ داستان ادب حیدرآباد ص ۱۹۲

مہاراجہ کی سرپرستی میں نکلنے والے رسائل

مہاراجہ اردو اور فارسی کے بلند پایہ شاعر اور ادیب تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ تصنیف و تالیف کے مشغلہ میں صرف کیا۔ شعرا اور مصنفین کی مالی امداد اور حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ مختلف رسائل کی سرپرستی بھی کرتے تھے۔ مہاراجہ شاد کی سرپرستی میں نکلنے والے رسائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ دبدبہ آصفی
۲۔ شوکت عثمانی
۳۔ محبوب الکلام
۴۔ تزک عثمانیہ
۵۔ گلدستہ دارالسلطنت
۶۔ گلدستہ جشن آصفیہ
۷۔ حیات سخن

دبدبۂ آصفی اعلیٰ حضرت نواب میر محبوب علی خاں بہادر کی تقریب سالگرہ کی تہنیت میں ماہانہ نکلنا شروع ہوا۔ اس پرچہ میں سماجی، اخلاقی، اور ظریفانہ ہر قسم کے مضامین طبع ہوتے تھے مہاراجہ کے بھی مضامین اس پرچے میں شائع ہوتے تھے۔ یہ پرچہ ہر ماہ ہلال کی چھٹی تاریخ کو محبوب پریس علاقہ پیشکاری سے شائع ہوتا تھا۔ مہاراجہ نے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کے لئے یہ اعلان کیا تھا کہ بہترین لکھنے والوں کو ہر ماہ ایک اشرفی بطور انعام دی جائے گی۔ رسالہ دبدبہ آصفی سنہ ۱۳۱۵ھ م ۱۸۹۷ء سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ سنہ ۱۳۱۵ھ م ۱۸۹۷ء سے سنہ ۱۳۱۷ھ م ۱۸۹۹ء تک اس رسالہ کا منافع اور حقوق اشاعت پنڈت رتن ناتھ سرشار کو حاصل تھے۔ سنہ ۱۳۱۸ھ م ۱۹۰۰ء میں ہیرالال نشاط کو مہاراجہ نے تمام حقوق دے دیئے تھے۔ دبدبہ آصفی کے بارے میں ڈاکٹر زور لکھتے ہیں:

"رسالہ دبدبۂ آصفی ایک علمی وادبی ماہنامہ تھا۔ جس کو سنہ ۱۳۱۵ھ میں جاری کیا یہ غفران مکان محبوب علی خاں کی حیات تک جاری رہا۔ عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کی تخت نشینی کے بعد مہاراجہ نے اس کی جگہ دوسرا ماہنامہ "شوکت عثمانی" شائع کرنا شروع کیا تھا جو زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہا۔" ؎

؎ داستان ادب حیدرآباد ص ۱۶۵

رسالہ "محبوب الکلام" بھی دبدبہ آصفی کے ساتھ ہی نکلنا شروع ہوا تھا۔ اس رسالہ میں ہر ماہ دیئے ہوئے مصرعہ طرح پر اردو اور فارسی غزلیں شائع ہوتی تھیں۔ مہاراجہ کی بھی غزلیں اس پرچہ میں شائع ہوتی تھیں۔ نیز اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خان بہادر کی بھی ایک غزل ہر ماہ شائع ہوتی تھی۔ اس رسالہ کے ایڈیٹر ہیرالال نشاط تھے۔ محبوب پریس علاقہ پیشکاری سے شائع ہوتا تھا۔ دبدبہ آصفی اور محبوب الکلام کے بارے میں مرتب کتاب "مہاراجہ کشن پرشاد" لکھتے ہیں:

"مولوی حبیب الرحمٰن بیدل سہارنپوری مدرس مدرسہ دارالعلوم سرکار عالی کو بھی مہاراجہ کی اسٹیٹ سے تعلق تھا۔ اور ان سے "دبدبۂ آصفی" و "محبوب الکلام" کی ترتیب و اشاعت میں کام لیا جاتا تھا۔ جلیل حسن صاحب اور اختر یار جنگ مینائی کے حیدرآباد آنے کے بعد مہاراجہ کشن پرشاد نے طویل عرصہ تک ان کی سرپرستی کی اور اپنے اسٹیٹ سے دونوں کو معتدبہ ماہوار دیا کرتے تھے۔ ... رسالہ دبدبۂ آصفی و محبوب الکلام بھی ان سے متعلق کیا گیا۔" [۱]

"تزک عثمانیہ" بھی مہاراجہ کی سرپرستی میں نکلتا تھا۔ یہ رسالہ اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خاں بہادر کی انتیسویں سالگرہ کی یادگار میں نکلنا شروع ہوا تھا۔ ہر ماہِ ہلالی کے پہلے ہفتہ میں نکلتا تھا اور محبوب پریس علاقہ پیشکاری سے شائع ہوتا تھا۔ تقریباً ہر ماہ مہاراجہ اپنا ایک مضمون اس پرچہ میں شائع کرواتے تھے۔ دوسرے لکھنے والوں میں چند کے نام یہ ہیں:

۱۔ ثاقب بدایونی ۲۔ خواجہ حسن نظامی ۳۔ سید صادق حسین غبار ۴۔ خواجہ بدیع اللہ
۵۔ سید ناظر الحسن ہوش ۶۔ اکبر الہ آبادی ۷۔ ٹھاکر میرٹھی

اس رسالہ کے بارے میں ڈاکٹر زور لکھتے ہیں:

"۱۳۳۲ھ یکم رجب سے مہاراجہ سر کشن پرشاد یمین السلطنت بہادر کی سرپرستی میں اور ان ہی کی ڈیوڑھی سے ایک رسالہ "تزک عثمانیہ" جاری ہوا۔ جو ہمعصر رسائل میں ایک حد تک دیرپا ثابت ہوا۔" [۲]

---

[۱] مہاراجہ کشن پرشاد ص ۲۲۸ [۲] عہد عثمانی میں اردو کی ترقی ص ۷۰

گلدستہ جشن آصفیہ اعلیٰ حضرت کی چالیس سالہ سالگرہ کے موقع پر مرتب کیا گیا تھا جس کے مرتب سید محمد عبداللہ ضیغم تھے۔ امانت پریس لاہور میں چھپا۔ اس گلدستہ کے بارے میں ضیغم لکھتے ہیں :

"یمین السلطنت سر مہاراجہ مدار المہام بہادر دام اقبالہ کو زیر سایہ عاطفیت ظل اللہ شاد و خرم رکھے جن کی سرپرستی اور فیاضی کا نمونہ یہ گلدستہ ہے"۔

رسالہ حیات سخن اکتوبر سنہ ۱۹۳۰ء سے نکلنا شروع ہوا۔ اس کے ایڈیٹر حکیم عبدالرزاق عرشی تھے۔ حیات سخن کو مہاراجہ کشن پرشاد اور نواب قدرت نواز جنگ کی سرپرستی حاصل تھی۔ مہاراجہ کے بارے میں ایڈیٹر نے لکھا ہے :

" مہاراجہ بہادر کی لاثانی خوبیوں سے بچہ ، جوان ، بوڑھا ، ہر ایک واقف ہے۔ آپ نہ صرف ایک ادیب ہی ہیں بلکہ کہنہ مشق اور نازک خیال شاعر بھی۔ آپ کا رنگ بالکل صوفیانہ ہے۔ آپ کے نانا مہاراجہ چندو لال بہادر شاداںؔ آنجہانی بھی ایک صوفی شاعر اور شاعر دوست تھے۔ وہی خوبیاں آپ میں بھی ودیعت کی ہوئی ہیں ... ... آپ کی علم پروری اور علم دوستی کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت مل سکتا ہے کہ آپ نے باوجود اپنی لا انتہا مصروفیتوں کے ہمارے رسالہ کی سرپرستی قبول فرمائی۔ جس کا ہم خلوص دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں"۔

رسالہ حیات سخن کے مقاصد کے بارے میں ایڈیٹر نے لکھا ہے کہ ایک مقصد اس کے اجرا کا یہ ہے کہ قدیم طرز کی شاعری کو فروغ دیا جائے۔ دوسرا مقصد ایک مشاعرہ کا انعقاد ہے۔ ہر ماہ دو مصرعۂ طرح ایک اردو اور ایک فارسی دئیے جائیں اور شعرا کے طبع آزمائی کرنے کے بعد مجموعہ کی صورت میں شائع کیا جائے۔

○

مہاراجہ کی اردو خدمات کا اجمالی خاکہ

مہاراجہ سر کشن پرشاد شادؔ یمین السلطنت سابق وزیر اعظم سلطنت آصفیہ کی جن اردو خدمات کا زیر نظر مقالہ میں تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ مہاراجہ نے اردو زبان اور ادب کی خدمت نہ صرف اپنی ادبی صلاحیتوں سے کی ہے بلکہ اس سلسلہ میں اپنے تمام وسائل کو بھی استعمال کیا ہے۔

مہاراجہ خود قادر الکلام شاعر اور مشاق ادیب تھے۔ انھوں نے سو سے زیادہ علمی اور ادبی کارنامے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ انھیں زبان سیکھنے اور ادبی نکات سے آگہی حاصل کرنے کا ایسا شوق تھا کہ ہر بڑے شاعر اور ادیب کے آگے انھوں نے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اور جن جن سے انھوں نے استفادہ کیا اپنی تصنیفات میں کھلے دل کے ساتھ اس کا اعتراف کیا۔ حصول علم کے معاملے میں، جہاں ان میں حد درجہ کسر نفسی اور فروتنی تھی، وہیں ان کے اندر وہ خود اعتمادی اور غرور فن تھا جو ہر بڑے فنکار میں پایا جاتا ہے۔ زبان اور ادب کے جس مسئلہ پر انھیں اپنی تحقیق پر اعتماد ہوتا وہ اس خصوص میں کسی بڑے سے بڑے شاعر اور ادیب کے اختلاف کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔

ہر فنکار نظم و نثر کی کسی ایک صنف میں یا زیادہ سے زیادہ دو تین اصناف میں کمال پیدا کرتا ہے۔ مہاراجہ یقیناً کسی صنف ادب کے باکمالوں سے لگا نہیں کھا سکتے۔ لیکن ایسے قلم کے دھنی بھی اردو زبان میں کم پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے نظم و نثر کی ہر صنف میں زور آزمائی کی ہو۔ اگر مہاراجہ بھی اپنی توانائیوں کو شعر و ادب کی ایک دو اصناف ہی پر مرکوز کر دیتے تو یقیناً تاریخ ادب میں صف اول کے شاعروں اور ادیبوں میں جگہ پاتے۔ لیکن ان کی طبیعت کی تنوع پسندی کا یہ عالم تھا کہ وہ نہ صرف نظم و نثر کی ہر صنف میں اپنی جولانی طبع دکھاتے بلکہ ہر صنف کے باکمالوں کے اسالیب خاص کو برت کر ان کے دوش بہ دوش چلنے کی کوشش کرتے۔ غزل کہی تو غزل میں داغؔ کی چٹپٹی زبان اور اور چنچل اسلوب کو بھی برتنے کی کوشش کی۔ غالبؔ کے فکر و فن کی پابندیوں

کو بھی چھونے کی آرزو کی۔ میر کی سادگی کو بھی اپنایا۔ قصیدہ کہا تو ذوق و سودا سے ٹکر لی۔ نثر کے میدان میں آگئے تو سرسید اسکول کی سادہ نثر بھی لکھی، غالب کی سادہ اور پرکار نثر پر بھی جان چھڑکتے رہے اور سرشار کی طرح روزمروں اور محاوروں کے دریا بھی بہا گئے۔ مہاراجہ جیسے امیر کبیر کی یہ ادب دوستی حیدرآباد میں اردو زبان وادب کو مقبول بنانے میں کس قدر قوت محرکہ کا کام انجام دیتی رہی آج اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنا ہمارے لئے مشکل ہے۔ مہاراجہ کا تقرب حاصل کرنے کے لئے ان کے مذاق اور پسند کے مختلف علوم وفنون کے باکمال انہیں گھیرے رہتے تھے۔ بالخصوص شاعروں اور ادیبوں کا ان کی دیوڑھی پر ہر روز جمگھٹا رہتا تھا۔ کتنے ہی شاعر ہوں گے جنھوں نے مہاراجہ کی نظر میں وقعت حاصل کرنے کے لئے اپنے فن کے پیچھے ریاض کیا ہوگا۔ کئی ادیب ہوں گے جنھوں نے مہاراجہ کی پسند کے مسائل و موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہوگی۔ مہاراجہ کی دیوڑھی کے مشاعرے اپنے اہتمام و انتظام اور بڑے بڑے شعرا کے اجتماع کے باعث مثالی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ ان مشاعروں میں شرکت کرنے والوں میں جو شاعر اور صاحب ذوق آج بھی بقید حیات ہیں ان مشاعروں کی ہماہمی، رونق، اہتمام آداب اور ادبی وقعت کے بارے میں جو حیران کن تفصیلات بیان کرتے ہیں سننے والوں کو افسانہ معلوم ہوتی ہیں۔ مشاعروں میں شرکت کو شعرا باعث فخر اور اپنی شاعری کی سند سمجھتے تھے۔ ماہانہ مشاعروں کے علاوہ جب کبھی باہر سے کوئی بڑا شاعر حیدرآباد آتا تو اس کے اعزاز میں غیر معمولی مشاعرہ منعقد کرواتے۔ ان رسمی مشاعروں کے علاوہ غیر رسمی مشاعرے تو کم وبیش ہر روز ان کے گھر پر منعقد ہوتے ہی رہتے تھے۔ جن شعرا پر مہاراجہ کی خاص عنایات مبذول رہتی تھیں وہ کم وبیش ہر روز یا ہفتہ میں ایک دو روز ان کے دولت خانے پر حاضر ہوتے رہتے تھے۔ اس طرح ہر روز ان کی دیوڑھی میں شعروسخن کی محفل گرم رہتی تھی۔

مہاراجہ شاعروں اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی، داد و تحسین اور خاطر مدارت ہی سے نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی داد و دہش سے بھی ان کی سرپرستی کرتے

تھے۔ کتنے ہی شاعروں کو اپنی اسٹیٹ سے ماہواریں مقرر کر دی تھیں۔ بعضوں کو اپنی اسٹیٹ میں ملازم رکھ لیا تھا۔ بعضوں کو اپنے اثر و اقتدار سے کام لے کر دیوانی کے مختلف محکموں میں ان کی حسب لیاقت ملازمت سے لگا دیا تھا۔ مستقل امداد کے علاوہ وقتاً فوقتاً گراں قدر انعام و اکرام سے بھی انھیں سرفراز کرتے رہتے تھے۔ متعدد حیدرآباد و بیرون حیدرآباد کے اہلِ قلم کی ہزاروں روپیوں سے امداد و اعانت کرتے رہتے تھے جو قابل قدر شاعر اور ادیب اپنی تصنیفات کو طبع کرانے پر قدرت نہیں رکھتا تھا ان کی طباعت و اشاعت کے بعد وافر تعداد میں جلدیں خرید لیتے تھے تاکہ مصنف کی مدد ہو سکے۔ متعدد رسائل خود ان کی سرپرستی میں نکلتے تھے جن کا بار وہ خود برداشت کرتے تھے۔ بیرون حیدرآباد متعدد رسائل کے وہ خریدار تھے۔ لیکن ایسے خریدار نہیں جو ماہانہ مقررہ چندہ ادا کرتے ہوں بلکہ ماہانہ چندے کی بجائے ایک گراں قدر رقم ہر سال عنایت فرماتے رہتے تھے۔ اردو کے معیاری رسالوں کی مالی سرپرستی ہی نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اپنی تخلیقات بھیج کر بھی ان رسالوں کی قدر افزائی کرتے تھے۔ مہاراجہ کی اسی اردو نوازی کے باعث اردو کے بڑے بڑے شاعر اور ادیب حیدرآباد میں جمع ہو گئے تھے۔ جو حیدرآباد آکر سکونت پذیر نہیں ہوئے وہ بھی مہاراجہ کی دعوت پر بار بار حیدرآباد آتے، اور ان کی خدمت میں حاضر ہونے کے آرزومند رہتے تھے۔ کچھ سربرآوردہ اہل قلم ایسے بھی تھے جنھوں نے خود مہاراجہ سے رسم و راہ پیدا کرنے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا لیکن مہاراجہ نے اپنی طرف سے پہل کی، انھیں خطوط لکھے، ان کی ادبی خدمات کی ستائش کی اور خط و کتابت کے ذریعہ رسم و راہ پیدا کی۔ مہاراجہ کی اس قدر دانی کے اثر سے اردو کا ہر بڑا شاعر اور ادیب مہاراجہ سے کسی نہ کسی صورت میں وابستہ رہا۔

مہاراجہ شاد کی ان فیاضیوں اور سرپرستیوں کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے انھوں نے اردو زبان و ادب کی اشاعت کے لئے اپنے خزانے وقف کر دیئے تھے۔

حیدرآباد میں اردو کا سنہ ۱۳۰۱ھ م ۱۸۸۴ء میں سرکاری زبان قرار پانا، ادارہ تالیف و ترجمہ کی تاسیس، مدارس میں اردو ذریعۂ تعلیم جامعہ عثمانیہ کا قیام،

جیسے عظیم الشان کارنامے یقیناً نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس ، اور نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کی اردو نوازی کا نتیجہ تھے ۔ لیکن مہاراجہ کشن پرشاد نے جو بحیثیت پیشکار، مدارالمہام اور صدر اعظم ان دونوں سلاطین سے وابستہ رہے اپنی سرپرستی سے اردو زبان و ادب کو سربلندی عطا کی تھی اور ریاست میں اس زبان سے محبت کرنے کی جو فضاء پیدا کر دی تھی اس فضاء نے بھی اردو کو معراج کمال پر پہنچنے میں بالواسطہ مدد دی ۔ مہاراجہ نے یقیناً اردو کو سرکاری زبان بنانے میں اور جامعہ عثمانیہ کے قیام میں بھی اپنی سرکاری حیثیت میں بھی مدد کی ہوگی ۔ لیکن اس دور کے دفاتر اور بالخصوص صدارت عظمیٰ کے دفاتر کے مسلہ کے اتلاف کے باعث افسوس ہے کہ ہم ان کے حوالے سے اردو کے لئے مہاراجہ کی سرکاری خدمات پر روشنی ڈالنے سے قاصر رہیں ۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ حیدرآباد میں جس دور میں اردو ترقی کی معراج کو پہنچی یہ مہاراجہ کی پیشکاری کے آغاز سے صدارت عظمیٰ سے سبکدوشی تک کا دور ہی ہے ۔ مہاراجہ کی اردو سے والہانہ محبت کو دیکھتے ہوئے ہم یہ قیاس کرنے میں حق بجانب ہیں کہ حیدرآباد میں اردو کو سربلند کرنے میں جو عوامل کارفرما رہے ان میں سب سے زیادہ طاقتور عامل مہاراجہ کی اردو دوست اور ادب نواز شخصیت تھی ۔

کِتابیات

۱

فہرست ماخذات

تاریخ ادب

۱۔ چمنستان شعرا (فارسی)	لچھمی نارائن شفیق
۲۔ گل عجائب	اسد علی خاں تمنا
۳۔ محبوب الزمن (تذکرہ شعرائے اردو)	عبد الجبار خاں آصفی
۴۔ یادگار ضیغم (غیر مطبوعہ)	عبد اللہ خاں ضیغم
۵۔ خمخانۂ جاوید (جلد چہارم)	لالہ سری رام
۶۔ تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر رام بابو سکسینہ
۷۔ سیر المصنفین	محمد یحیٰ تنہا
۸۔ تذکرہ ریختی	تمکین کاظمی
۹۔ دکن میں اردو	نصیر الدین ہاشمی
۱۰۔ حیدرآباد کی علمی فیاضیاں	منظور علی
۱۱۔ عہد عثمانی میں اردو کی ترقی	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۱۲۔ داستان تاریخ اردو	حامد حسن قادری
۱۳۔ اردو مثنوی کا ارتقاء	پروفیسر عبد القادر سروری
۱۴۔ دور جدید کے چند منتخب ہندو شعرا	عبد الشکور
۱۵۔ سلاطین دکن کی اردو شاعری	نصیر الدین ہاشمی
۱۶۔ اردو میں سائنسی ادب (مقالہ)	خواجہ حمید الدین شاہد
۱۷۔ مختصر تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر اعجاز حسین
۱۸۔ ناول کی تاریخ اور تنقید	علی عباس حسینی
۱۹۔ نئے ادبی رجحانات	ڈاکٹر اعجاز حسین
۲۰۔ داستان ادب حیدرآباد	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۲۱۔ اردو ادب کی تاریخ	نسیم قریشی
۲۲۔ تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر عبداللہ

۲۳۔ تعارف تاریخ اردو	شجاعت علی سندیلوی
۲۴۔ اردو ناول نگاری	سہیل بخاری
۲۵۔ ادبی تخلیق اور ناول	ڈاکٹر احسن فاروقی
۲۶۔ قدیم اردو	مولوی عبدالحق
۲۷۔ حیدرآباد کے شاعر	حمیدالدین شاہد
۲۸۔ میری شاعری	مرزا فرحت اللہ بیگ
۲۹۔ اردو شاعروں کا البم	سید زوار حسین

تاریخ

۳۰۔ حدیقۃ العالم (فارسی)	میر عالم بہادر
۳۱۔ تاریخ خورشید جاہی	غلام امام خاں
۳۲۔ تزک محبوبیہ (حصہ اول و دوم)	غلام صمدانی خاں گوہر
۳۳۔ تزک آصفیہ (فارسی)	واحد علی خاں
۳۴۔ گنجینہ آصفیہ	سید غلام محمد خاں
۳۵۔ دبدبۂ نظام	عبدالروف
۳۶۔ دربار آصف	غلام صمدانی خاں گوہر
۳۷۔ تاریخ ریاست حیدرآباد دکن	محمد نجم الغنی
۳۸۔ بستان آصفیہ	مانک راؤ وٹھل راؤ
۳۹۔ تذکرہ باب حکومت	محمد مظہر
۴۰۔ رسالہ دربار آصفی	منا رام
۴۱۔ عنایات عثمانی	محمد اکبر علی
۴۲۔ ایمان الکفار	خواجہ حسن نظامی
۴۳۔ حیدرآباد کی تعلیمی ترقی	پروفیسر عبدالقادر سروری
۴۴۔ حیدرآباد کے بڑے لوگ	سید غلام پنجتن شمشاد
۴۵۔ میر عالم	سراج الدین طالب
۴۶۔ مثل بابت رسوم میت مہاراجہ بہادر	مخزونہ سنٹرل رکارڈ آفس حیدرآباد

٤٧	یادگار سلور جوبلی	صمصام شیرازی
٤٨	دکن کے تعلیم مے چند پہلو	سید علی محسن

سیر و سوانح

٤٩	عشرت کدۂ آفاق (فارسی)	مہاراجہ چندو لال
٥٠	فرحت کدۂ آفاق	راجہ راجیشور راؤ
٥١	سوانح عمری راجہ نریندر بہادر	رجب علی
٥٢	سوانح عمری نواب فصاحت جنگ جلیل (غیر مطبوعہ)	مملوکہ عبدالرزاق عرشی
٥٣	خود نوشت سوانح حیات مہاراجہ بہادر (غیر مطبوعہ)	مخزونہ حیدری گلشنی کتب خانہ
٥٤	مہاراجہ کشن پرشاد	—
٥٥	فانی	دیبی پرشاد سری واستو
٥٦	دبدبہ امیری	سید محمد عبدالحکیم حکمت
٥٧	میخانۂ ریاض	نسیم مینائی
٥٨	رند پارسا	رئیس احمد جعفری
٥٩	اکبر الہ آبادی	طالب الہ آبادی
٦٠	اقبال اور حیدرآباد	نظر حیدرآبادی
٦١	امیر مینائی	شاہ محمد ممتاز علی
٦٢	بزم اکبر	قمر الدین بدایونی
٦٣	بزم داغ	رفیق مارہروی
٦٤	ذکر شبلی	محمد امین زبیری
٦٥	اردو ادب کے معمار	—
٦٦	مشاہدات	ہوش بلگرامی
٦٧	جام سرشار (ناول)	رتن ناتھ سرشار
٦٨	شاد اقبال (خطوط)	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
٦٩	اکبر الہ آبادی اور مہاراجہ شاد کی خط و کتابت	خواجہ حسن نظامی

۷۰۔ مشاہیر سے مہاراجہ شادؔ کی خط و کتابت (غیر مطبوعہ) — مخزونہ حیدری گشتی کتب خانہ ۲۳۔

منظومات

۷۱۔ مرقع سخن (جلد اول و دوم) — ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ۲۴

۷۲۔ اردو شاعری کا انتخاب — " " " " ۵

۷۳۔ بادۂ سخن — " " " " ۶

۷۴۔ کلیات شاداں — چندو لال شاداںؔ

۷۵۔ وجدانیات فانیؔ — فانیؔ

۷۶۔ غم احباب شادؔ — نرسنگ راج عالیؔ

۷۷۔ کلام مہاراجہ بہادر (غیر مطبوعہ) — مخزونہ کتب خانہ عرشی

۷۸۔ دیوان قمرؔ — قمر الدین نظامی

۷۹۔ دیوان حسن سجزی — " سجزی

رسائل و اخبارات

(سنہ، جلد اور شمارے کے حوالے مقالے میں دے دیے گئے ہیں)

۸۰۔ جہانگیر (نظام نمبر) ۸۱۔ مجلہ عثمانیہ (جلیل نمبر) ۸۲۔ مجلۂ عثمانیہ (مہاراجہ نمبر)
۸۳۔ منادی ۸۴۔ نورس (غزل نمبر) ۸۵۔ الموسی ۸۶۔ العصر ۸۷۔ محبوب الکلام
۸۸۔ دبدبۂ آصفی ۸۹۔ حیات سخن ۹۰۔ گلدستہ جشن آصفیہ ۹۱۔ گلدستہ
دلفگار ۹۲۔ گنج شائگاں ۹۳۔ گلدستہ فیض ۹۴۔ مشاعرہ
۹۵۔ گلدستہ آصفیہ ۹۶۔ بزم رنداں ۹۷۔ رسالہ حسن ۹۸۔
بزم شاد ۹۹۔ دکن ریویو ۱۰۰۔ مخزن ۱۰۱۔ زمانہ ۱۰۲۔ دلگداز
۱۰۳۔ تزک آصفیہ ۱۰۴۔ کمال دہلی (دربار نمبر) ۱۰۵۔ لسان الملک
۱۰۶۔ کشکول ۱۰۷۔ شور عاشقاں ۱۰۸۔ نظام المشائخ ۱۰۹۔ تاج
۱۱۰۔ ذخیرہ ۱۱۱۔ گلزار سخن ۱۱۲۔ گلدستہ دار السلطنت ۱۱۳۔
تزک عثمانیہ ۱۱۴۔ تحفہ ۱۱۵۔ نقوش (شخصیات نمبر) ۱۱۶۔ نقوش
(مکاتیب نمبر) ۱۱۷۔ نقوش (غزل نمبر) ۱۱۸۔ میونسپل گزٹ لاہور (علمائ نمبر)
۱۱۹۔ الجمیعتہ (سلطان العلوم نمبر) ۱۲۰۔ نظام گزٹ ۱۲۱۔ رہبر دکن۔

○○



ڈاکٹر حبیب ضیا

لکچرر اردو، اردو اورینٹل کالج

حمایت نگر - حیدرآباد، اے۔پی

پیدائش : ۱۹۳۵ء نومبر

ایم اے : ۱۹۵۹ء

پی ای : ۱۹۶۶ء

ملا : ۱۹۶۰ء

★

تصانیف

دکنی زبان کی قواعد : ۱۹۶۴ء

حیدرآباد کے مزاح نگار : زیر ترتیب

گویم مشکل (مزاحیہ مضامین) " "